نقوشِ سلیمانی

ہندوستانی اور اردو زبان وادب سے متعلق تقریروں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ

مصنف : سید سلیمان ندوی

بہ اہتمام : مولوی مسعود علی صاحب ندوی

Title By : Ghulam Mustafa Daaim

مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ

نقوشِ سلیمانی

ہندوستانی اور اردو زبان وادب سے متعلق تقریروں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ

مصنف : سید سلیمان ندوی

بہ اہتمام : مولوی مسعود علی صاحب ندوی

Title By : Ghulam Mustafa Daaim

مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڑھ

فہرست مضامین

نقوش سلیمانی

مضمون	صفحہ
خطبات	
خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونہ،	۱
ہندوستان میں ہندوستانی،	۱۹
خطبۂ صدارت ہندوستانی اکاڈیمی،	۷۷
ہماری زبان کا نام،	۱۰۰
ہماری زبان بیسویں صدی میں،	۱۱۳
مقالات	
کا ظریفانہ کلام،	۱۶۲
اردو انسائیکلوپیڈیا،	۱۷۴
زبانِ اردو کی ترقی کا مسئلہ،	۱۸۰
ہوم لنگویج (ملکی زبان)	۱۹۳
انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ	۱۹۹
انجمن اردوے معلّی کے چند سوالو کا جواب،	۲۱۱
ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی،	۲۲۶
اردو کیونکر پیدا ہوئی،	۲۴۲
بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت،	۲۵۹

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
سفرِ گجرات کی چند یادگاریں،	۲۷۰	کلامِ شاد،	۳۹۴
بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق (۱)	۲۸۹	کلیاتِ عشق،	۴۰۱
بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق (۲)	۳۱۳	شعلۂ طور،	۴۲۶
تنقید،	۳۲۹	نمستان،	۴۳۲
ہماری زبان،	۳۵۰	مسدسِ حالی،	۴۴۴
جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت،	۳۶۰	خیابان،	۴۵۴
مقدمات		عطرِ سخن،	۴۶۳
مکاتیبِ شبلی،	۳۶۳	"حقیقتِ علمی شاعری"	۴۶۹
مکاتیب مہدی،	۳۷۵	استدراک،	الف، ب
گلستانِ امجد،	۳۹۱		

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

آجکل ملک مین زبان کے مسئلہ سے جس دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے اس کو دیکھکر یہ خیال آیا کہ ہندوستانی زبان وادب کے متعلق اب تک جو تقریرین میری زبان سے اور جو تحریرین میرے قلم سے نکلی ہین ان کو ایک جگہ شائع کردیا جائے، تاکہ لوگو کو اس مسئلہ کے ہر پہلو کے سمجھنے مین مدد ملے، بعد کو جب مجموعہ چھپنے لگا تو مجموعہ کے خیال سے کچھ اور چیزین بھی اس مین بڑھادی گئین،

امید ہے کہ یہ اوراق دلچسپی سے پڑھے جائین گے،

سید سلیمان ندوی
دارالمصنفین اعظم گڈھ

۲۷ر اپریل ۱۹۳۹ء

خطبۂ صدارت اجلاس شعبۂ ترقی اردو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ پونا بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء

(منقول از روداد کانفرنس مذکور بابتہ اجلاس ۱۹۱۵ء پونا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی وَیَسِّرْ لِی اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِی یَفْقَھُوْا قَوْلِی

کَبُرَتْ فِی مَوْتِ الْکُبَرَاءِ

حضرات! آج مجھے ہندوستان کی ایک عظیم الشان تعلیمی مجلس کے ایک علمی شعبہ کی صدارت کی عزت ملی ہے، یہ بظاہر میرے لئے مسرت کا دیباچہ تھا لیکن آہ اس دنیا میں بدبختی اور شومیٔ نصیب کے کتنے ابواب و فصول ہیں، اب سے صرف ڈیڑھ سال پہلے اس اعزاز کے لئے کئی اکابر کے نام پیش کئے جاسکتے تھے، حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی، شمس العلما مولانا حالی، خواجہ غلام الثقلین ہماری زبان کے وہ ارباب قلم اور ہندوستان کے وہ سحر نگار تھے جنکا وجود ہمیشہ قوموں اور ملکوں کی عزت کا تاج ہوتا ہے، لیکن بدنصیبی کی انتہا ہے کہ ہمارے دامن کا ایک ایک موتی

اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک جواہر ہم سے کھو چکا ہے، اور اسلامی ہند کے ظلمتکدہ مین فضل و کمال کا کوئی چراغ نظر نہین آتا، ع

افسوس کز قبیلۂ مجنون کسے نماند،

آج کی صحبت کی صدر نشینی خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم مین فضل و کمال کی کمی کتنی ہے، اور ارباب علم و ہنر کا قحط کہان تک ہے، نظامیۂ بغداد کے ایک عالم نے سب سے پہلی دفعہ جب درس کے مسند پر قدم رکھا تو کہا،

خلت الدیار فسدت غیر مسوّد | ومن البلاء تفرّدی بالسودد

(ملک خالی ہوگیا اور مین بزرگی کے بغیر بزرگ بن گیا، اور میرا اس بزرگی کے ساتھ یکتا ہونا ایک قسم کی مصیبت ہے)

آج بھی وہی موقع ہے کہ اس کو پڑھا جائے اور کہا جائے کہ

کبّرنی موت الکبراء | بڑون کی موت نے مجھ کو بڑا بنایا ہے"

بہرحال آپ لوگون کی اس عزت بخشی کا ممنون ہون،

اُردو | حضرات! اردو زبان کی تاریخ سید انشا کے زمانہ سے لے کر شمس العلماء آزاد کے عہد تک بار بار اتنی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اب وہ پرانی کہانی بن گئی ہے، پھر بھی مین اس پر ایک دوسری حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتا ہون،

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کے گھرانے، سامی، تورانی، آریہ تین مستقل خاندانون اور تین مستقل زبانون مین بٹے تھے، اسلام کا بڑا کارنامہ سب کو ملانا اور جوڑنا ہے، اس کا تمدن مصر و شام و عجم اور روم و یونان کے تمدنون کا خلاصہ ہے، اس کے علوم و فنون، ہندوستان، بابل،

فارس، یونان اور اسکندریہ کے تجربہ خانون اور درسگاہون کا عطر ہین، اس کی نسل تورانی، آریائی اور سامی قومون کا مجموعہ ہے، اس کی زبان مین سنسکرت، پہلوی، قبطی، سریانی، لاطینی اور یونانی الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ ہے، اسلام کی دنیا مین نسل، وطن اور زبان کی کوئی تفریق نہین جس طرح دنیا کا ہر گوشہ اس کا وطن ہے، دنیا کا ہر لغت اس کی زبان ہے،

عرب کے بادیہ نشین جب فاتحانہ پرچم کے سایہ مین عرب کے ریگستان سے باہر نکلے تو جس طرح ایران کا درفش کاویانی، چین کی دیوار، مصر کے اہرام، افریقہ کے صحارا اور اندلس کا دریا اُن کی سیاسی زور و قوت کو روکنے سے عاجز تھا اسی طرح اُن کی عربی زبان کے معنوی استیلا و اقتدار سے بھی بچاؤ ان کے لیے ناممکن تھا، ایران کی پہلوی، شام کی سریانی، مصر کی قبطی، افریقہ کی بربری اور اندلس کی اسپینی زبانین دفعۃً پردۂ عالم سے گم تھین، ایوانِ حکومت عرب سپہ سالارون کے ماتحت تھے، تو معبدون اور کلیساؤن کی درسگاہین عربون کے ادبیات و علوم کی سرپرستی مین تھین، سندھ کے کنارون سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی، اور وہ قرآن کی زبان تھی،

ان ملکون کی دیسی زبانون کا یہ تغیر اور انقلاب عربون کی زبردستی اور حکومت کے زور کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ خود عربی زبان کی سہولت، اس کے الفاظ کی ثروت، اُس کے علوم کی کثرت کو اس مین دخل تھا، عبد الملک کے زمانہ تک اسلامی سلطنت کے ہر صوبہ کی ملکی ہی زبان وہان کی سرکاری اور دفتری زبان تھی، ایران کی پہلوی زبان گو مٹ گئی لیکن عربی آمیز فارسی نے دفعۃً ظہور کیا اور خود بغداد کا خلیفہ اعظم مامون الرشید اس کا مربی بنگیا، پروفیسر براؤن نے

لٹریری ہسٹری آف پرشیا مین دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ پہلوی زبان وخط کے بدل جانے اور استعمال سے جاتے رہنے کا اصلی سبب عربی زبان وخط کی شیرینی اور سہولت تھی، تاتاریون نے اس زور شور سے اسلام پر حملہ کیا کہ خوارزم سے لیکر بغداد تک صرف خاک کا ڈھیر رہ گیا، لیکن اُن کی ترکی وتاتاری زبانین عربی کا مقابلہ نہ کر سکین، اور آخر فاتح کو مفتوح کے آگے جھک جانا پڑا، اور اب ترکی وتاتاری زبانون کے حسن ورونق کا سبب صرف عربی الفاظ کا جامۂ عاریت ہے، عرب جس ملک مین گئے یا تو وہان کی زبان بدل گئی، اور بدل نہ گئی تو اُن کی زبان کے الفاظ نے دیسی ملکون کے الفاظ سے مل جل کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار کر دیا، نئی فارسی نئی ترکی نئی ملائی نئی بربری، اور نئی ہندوستانی نے اسی طرح جنم لیا،

عرب وہند کا تعلق اسلام سے بہت پہلے سے اور نہایت پرانا ہے، خاص کر عرب اور ہندوستان کے اس خطہ مین جہان خوش قسمتی سے اس وقت ہم جمع ہین، ہندوستان کی تمام مصنوعات اور پیداوار انہی سواحل سے عرب کو اور عرب کی راہ سے یورپ تک پہنچتی تھی، اس بنا پر مسالے اور خوشبودار چیزون اور کپڑون کے سنسکرت اور ہندی نام قدیم عربی زبان مین بھی داخل ہو گئے ہین، زنجبیل، فلفل، نیلوفر، مشک، صندل، سنسکرت یا کم از کم ہندی ہی زبان کے الفاظ ہین،

مسلمانون کا ہندوستان پر حملہ پہلی صدی ہجری کا واقعہ ہے، اور یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ اس حملہ کی ابتدا مسلمانون کے فاتحانہ جذبات کا نتیجہ نہ تھا جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، بلکہ ایرانیون کی اعانت کے لئے ہندوستان کی آمادگی سے ہے، اور اس کا نتیجہ مسلمانون کا حفظ ما تقدم کے طور پر سندھ پر قبضہ ہے، تقریباً اس کے چار سو برس کے بعد ترک اور ایرانی فتوحات کا سیلاب درۂ خیبر

سے گذر کر ہمالیہ کے پانچ دریاؤن مین آکر مل گیا، یہ اُردو زبان کی تاریخ کا پہلا دن ہی[1]،
ہندوستان کسی زمانہ مین بھی ایک نہ تھا اور مستقل ملک نظر نہین آتا، یہان کا ہر صوبہ ایک نئی راجدھانی، ایک نئی زبان، ایک الگ تمدّن یعنی ایک ایک نیا ملک تھا، جو اپنے لئے مخصوص خصوصیات رکھتا تھا، سنسکرت زبان یہان کی مشترک مقدس زبان ضرور نظر آتی ہی لیکن تاریخ سے یہ ثابت نہین کہ یہ کسی زمانہ مین تمام ہندوستان کی مشترک گفتگو کی زبان تھی، ہندوستان کا میدان داخلی اقوام کے علاوہ خارجی حملہ آور قومون کا بھی ہمیشہ جولانگاہ رہا ہے، سیتھین یعنی ایک تورانی النسل شاخ، پھر آرین، پھر یونانی، پھر عرب، ترک، پٹھان، مغل اقوام یکے بادیگرے ہندوستان مین داخل ہوے، سولہوین صدی مین اہل یورپ کا یہان کے سواحل پر گذر ہوا جن مین سب سے پیشرو پرتگالی اور ان کے بعد فرنچ اور سب سے آخر مین انگریز تھے، ایک ایسا ملک جو مختلف نسلون مختلف قومون مختلف زبانون کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے، کہ وہان باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اُردو ہے،

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو زبان صرف فارسی، عربی، سنسکرت، اور بھاشا کا مجموعہ ہے، حالانکہ ترکی اور پرتگالی الفاظ بھی اس مین کم نہین، چنانچہ قدیم شاہانہ شان وشکوہ اور جنگی اصطلاحات وآلات کے متعلق اکثر الفاظ ترکی سے آئے ہین، جو محمد شاہ کے زمانہ تک ایوان شاہی کی زبان تھی، اسی طرح ابتدائی یورپین جینٹس جو ہندوستان مین آئین جن کی اصل انگریزی

[1] اردو کی تاریخ کی نسبت یہ چند اشارے ۲۲ برس پہلے کیے گئے تھے اردو کی تاریخ کے محققون کی کوششون سے آج پوری طرح وہ ثابت ہوگئی ہے،
سید سلیمان، ۱۹ راگست ۱۹۳۶ء

مین موجود نہین وہ اکثر پرتگالی ہین، مثلاً نیلام، یا پاؤن جس کو ڈبل روٹی کہتے ہین جسکو غلطی سے کبھی پاؤ روٹی سمجھا جاتا ہے کہ شاید وہ روٹی پاؤ بھر آٹے کی بنتی ہو، بعض شستہ لوگ جو اپنی فارسی دانی کا ثبوت دینا چاہتے ہین وہ نان پنبہ کہتے ہین، کہ یہ روئی کی طرح نرم ہوتی ہے، حالانکہ یہ پون لفظ ہے جو پرتگالی مین روٹی کو کہتے ہین

بہرحال اس تفصیل سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اردو زبان تنہا کسی قوم کی زبان نہین ہے اس مین ہندی، اسلامی، یورپین تمام زبانون کا ذخیرہ ہے اور اس لئے اس کی ملکیت کا تمام باشندگان ہند بجا طور سے دعوی کرسکتے ہین، اور اس کو مسلمانون کے ساتھ کوئی خاص خصوصیت نہین بلکہ ہندوستان کی مشترک زبان ہے جس مین پنجابی بولنے والا بنگالی سے، اور مرہٹی بولنے والا گجراتی سے بے تامل اظہار مطلب کرسکتا ہے،

ہندوستان مین تقریباً تین سو بولیان اور زبانین ہین جو پہاڑون اور صحراؤن کے چھوٹے چھوٹے آوارہ گرد قبائل سے لیکر بڑی بڑی قومون پر محیط ہین، اگر ہندوستان ایک ملک بننا چاہتا ہے اور اس کے قومی تعلیمی اور سیاسی خیالات کو بحیثیت ایک قوم اور ایک ملک کے ترقی کرنا ہے تو ایک مشترک زبان کے بغیر چارہ نہین،

اردو زبان کا پیدا ہونا کسی ایک قوم یا قوت کا نہین، بلکہ مختلف قومون اور زبانون کے میل جول کا ایک ناگزیر اور لازمی نتیجہ ہے، اور اس کا پیدا ہونا ضرورۃً اور مجبوراً تھا مسلمان عربی اور فارسی زبان لیکر ہندوستان آئے اس پر دو سو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہان پیدا ہوگئی، اردو شاہجہان کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غوریون خلجیون اور تغلقون ہی کے زمانہ مین یہ پیدا ہوچکی تھی چند کوی کی تاریخ جو پرتھی راج کے حال مین ہے

اور جس کی تصنیف کا زمانہ غوریوں کا عہد[1] بتایا جاتا ہے، عربی اور فارسی الفاظ سے مالامال ہے،
اس کے بعد امیر خسرو کی زبان میں ہندی الفاظ اور کبیر داس کی زبان میں جو سکندر لودی کے عہد
میں تھا، عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش اُردو کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتی ہے، رفتہ رفتہ یہ آمیزش
بڑھتی گئی، اور فوجی معسکروں میں جو ہندستان کی مختلف اقوام کا سب سے زیادہ مخلوط مجموعہ تھا، یہ
بولی زبان بنگئی، اور اسی لئے عام لوگ اس کو اُردو کہنے لگے، اُردو ترکی زبان میں معسکر (فوجی پڑاؤ)
کو کہتے ہیں اسی بنا پر ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں، اُردو
کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے، اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اسکا
نام ہندوستانی ہے،

میں نے کہا ہے کہ اس قسم کی مشترک زبان کا ایسی مخلوط اقوام کے میل جول کے موقع پیدا
ہونا قوموں کے میل جول کی تاریخ کا مسلمہ نتیجہ ہے، یہ مسئلہ اس وقت اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے
جب ہم خاص اس سرزمین پر غور کرتے ہیں جہاں ہم اس وقت اکٹھے ہیں، شمالی ہندوستان اگر
ہندوستان میں نئی آنے والی قوموں کا شارع عام رہا ہے، تو جنوبی ہندوستان یا دکن بعد کو انہی
قوموں کیلئے شکست کھا کر مجتمع ہونے کے لئے ملجا رہا ہے، نئی حملہ آور قوم نے اگر شمالی ہندوستان
سے اپنی پیش رو قوم کو ڈھکیلا ہے تو دکن ہی کی پہاڑیاں اس کے لئے جا پناہ بنی ہیں، یہی سبب

---

[1] یہ نظریہ کہ یہ کتاب غوریوں کے زمانہ میں لکھی گئی اب قطعی طور سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ
کم از کم شاہجہان کے عہد سے پہلے نہیں لکھی گئی، اس کتاب پر حافظ محمود خاں شیرانی کے فاضلانہ تبصروں نے جو اورینٹل
کالج میگزین میں چھپ رہے ہیں، اس بھید کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا ہے،
سید سلیمان ندوی، ۱۷ اگست ۱۹۳۷ء

کہ آج جنوبی ہندوستان قدیم سے قدیم قومون سے لیکر آخری دور جدید کی قومون تک کا تماشا خانہ اور جلوہ گاہ ہے، شمالی ہندوستان مین پشاور سے مرشدآباد اور ڈھاکہ تک اُردو زبان کی عملداری ہے، گو بیچ بیچ مین پشتو، پنجابی اور بنگالی زبانین بھی آڑے آجاتی ہین لیکن یہان بمبئی اور مدراس کے احاطون مین ہر سو میل ایک مستقل زبان کی حکومت کا رقبہ ہے، گجراتی، مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگو، اڑدی خدا جانے کتنی زبانین ہین مین سمجھتا ہون کہ یہی سبب ہے کہ اُردو کی مشترک زبان کی ضرورت سب سے پہلے دکن مین محسوس ہوئی، اور ولی دکنی اور سراج دکنی[1] وغیرہ اُردو کے شاعر بھی یہان سب سے پہلے پیدا ہوئے،

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اردو ملک ہندوستان کی عالمگیر زبان کا نام ہے، اور اسی لئے ہندوستان کی تمام قومون کو اس کی ترقی و اشاعت مین برابر کا حصہ لینا چاہئے اور اصل یہ ہے کہ خود ہندوستانی اقوام سے زیادہ انگلش گورنمنٹ اس نوزائیدہ بچہ کی تولیت کا حق سب سے زیادہ رکھتی ہے کہ اس کو بولی سے زبان تک پہنچانا اسی کی مصلحتون اور ضرورتون کے لئے تھا، پھر رسائل سفر کی آسانی نے ہندوستان کے تمام دور دراز صوبون کو ایک ہی گھر کے چند صحن بنا دیئے ہین، اسی بنا پر قومی تعصبات کے باوجود وہ ہندوستان کے کونے کونے اور گوشہ گوشہ مین بولی اور سمجھی جانے لگی ہے، اور ہر روز اس کی ترقی کا قدم آگے ہے، یہانتک کہ آج ایک مرہٹہ ملک مین، مین اردو بول رہا ہون، اور پورا مجمع اچھی طرح سارا مطلب آسانی سے سمجھ رہا ہے، بلکہ اس

---

[1] دکھنی زبان کی نئی تحقیقات نے اس سے بھی صدہا سال پہلے کا کھوج لگایا ہے، اور اس بیس بائیس برس کے عرصہ مین دکن مین اردو شاعری کی تاریخ کا سراغ سیکڑون سال آگے کو بڑھ گیا ہے،

سید سلیمان ندوی ۸ ستمبر ۱۹۳۷ء

کے کناروں سے گذر کر جزیرۂ برما اور سواحلِ عدن تک یہ پہنچ چکی ہے،

اردو کے قواعد پہلے انگریزوں نے لکھے یا لکھوائے

اردو زبان اپنے قواعد و لغت کی تدوین مین سب سے زیادہ انگریز قوم کی ممنون ہے، کیونکہ کسی زبان کے سیکھنے کی دقت سب سے پہلے غیر ملکی ہی محسوس کرتے ہین، انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری ایک فرانسیسی نے لکھی، عربی زبان کے قواعد اور لغت کی تالیف سب سے پہلے اخفش، سیبویہ، اصمعی، ابو علی فارسی وغیرہ نے کی، جو سب کے سب عجمی تھے، اس بنا پر اگر فالن صاحب نے اردو کی سب سے پہلی ڈکشنری لکھی، یا جان گلگرسٹ صاحب نے ہندوستانی قواعد کی کتابین یا ڈی ٹاسی نے اردو ادبیات کی سب سے پہلی علمی تاریخ مرتب کی تو تعجب کی بات نہین،

سادہ اردو

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس زبان کو تکلفات اور تصنعات سے بری کر کے سادہ علمی و تحریری زبان بنانا انگریزون کی رہنمائی سے ہوا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کو سادہ اور بے تکلف تحریری زبان بنانے کا فخر امام الہند شاہ ولی اللہ کے خانوادۂ دہلی کی قسمت مین تھا، مولانا اسمٰعیل (سنہ ۱۱۹۳ھ/۱۷۸۲ء – سنہ ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی زبان جو تقویۃ الایمان مین نظر آتی ہے، آج بھی فصاحت اور زبان کی سادگی کا بہترین نمونہ ہے، شاہ عبد القادر صاحب کی موضح القرآن بھی بیان کی صفائی مین کم نہین، اس کے بعد مرزا نوشہ اسد اللہ خان غالب کے خطوط کی زبان ہے، جو غالب کے بقائے نام کا ان کے اردو اور فارسی دیوانون سے زیادہ محفوظ ذریعہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا حقیقی مصنف جس نے زبان کو ہر قسم کی سیاسی، تعلیمی، مذہبی، علمی، اور اخلاقی مباحث و مضامین کے قابل بنایا، سر سید کی ذات تھی، اور اس کے بعد بہت سے دوسرے ہندو اور مسلمان مصنفون

کا درجہ ہے،

ملکی زبان اردو زبان چونکہ قومی نہین بلکہ ملکی زبان ہے، اس لئے اس کی تحریری ترقی واشاعت مین ہندو اور مسلمان دونون قومون کا برابر کا حصہ رہا ہے، تاہم انیسوین صدی کے اختتام پر بعض نافہم حکام کی بدولت اردو اور ہندی کا ناگوار قضیہ پیدا ہوا، اور اسی کے لئے ۱۹۰۲ء مین انجمن ترقی اردو کی بنیاد ڈالی گئی کہ زبان اردو کے حقوق کی حفاظت ہو سکے، اردو زبان ہندوستان کے ہر صوبہ مین ایک حریف مقابل سمجھی جاتی ہے، پنجاب مین اس کو پنجابی سے مقابلہ ہے، صوبہ متحدہ اور بہار مین ایک بے معنی نام ہندی زبان سے، اڑیسہ مین اڑیا زبان اس کی حریف ہے، بمبئی مین مرہٹی، سندھی، گجراتی اور کنڑی چار پہلوانون سے اس کا معرکہ ہے، مدراس مین تامل تلنگو اور اردی سے وہ دوچار ہے، تاہم دلی کے قلعۂ معلی کا پہلوان پنجاب کے شیر کو زیر کر چکا ہے، ہندی زبان اس سے جدا نہ تھی ایک ہی حقیقت کے دو نام تھے، اب اصل معرکہ گاہ بمبئی اور مدراس کے سواحل اور پہاڑیان ہین لیکن یہان بھی وہ بول چال کی حیثیت سے نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے، ایک بڑا سوال یہان کے انگریزی اسکولون اور کالجون مین اس کا داخلہ تھا اور الحمد للہ کہ چند سال ہوئے یہ مرحلہ بھی طے ہو چکا اور وہ مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیون مین اختیاری زبان کی حیثیت سے قبول کیجا چکی لیکن اب بھی حقیقت مین مشکلات کا پورا حل نہین ہوا ہے،

قومی زبان حقیقی خواہش تو یہ ہے کہ اردو زبان ہندوستان کی تمام قومون اور باشندون کی مشترک زبان قرار دیجائے، اگر بدقسمتی سے یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم اسکی کوشش ضرور ہونی چاہئے کہ وہ تمام ہندوستان

کے مسلمانون کی مشترک زبان بنجائے، تمام ہندوستان کے مسلمانون کو علمی، مذہبی، قومی، سیاسی اور تعلیمی ہر حیثیت سے ایک متحد قوم کی حیثیت سے کام کرنا ہے، ہندوستان کی تمام اسلامی آبادیان جو مختلف صوبون مین رہتی ہین، اور مختلف زبانین بولتی ہین، اگر مشترک زبان اختیار کرین تو اُن کی متحدہ قومیت اپنی متحدہ جامعیت کے لئے کیا شئے پیش کرے گی، صوبون کی چھوٹی چھوٹی زبانین اور بولیان جہان مسلمانون کی ایک تعداد آباد ہے اُن کے لئے مذہبی علمی تعلیمی سرمایہ مستقل طور سے مہیا نہین کرسکتی ہین، حالانکہ قومیت کی تعمیر کے لئے یہ اساس و بنیاد ہین' اس بنا پر اس سے چارہ نہین کہ ہندوستان کے تمام مسلمانون کی علمی و مذہبی و تعلیمی ضروریات کے لئے ایک مشترک زبان قرار دیجائے،

تعلیمی زبان | لیکن سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ بنگال اور جنوبی ہند کے جن جن صوبون مین مسلمان آباد ہین، اُردو کے علاوہ وہان کی ایک ملکی زبان بھی ہے اور اصول حکومت اور آئین عدل کی روسے گورمنٹ نے ہر احاطہ کی سرکاری اور دفتری زبان کو اس احاطہ کی عام ملکی زبان قرار دیا ہے، جو کہین بنگالی ہے کہین مرہٹی ہے کہین گجراتی ہے اور یہی وہان کے سرکاری مدرسون کی اہم ورنیکولر زبانین ہین' اس حالت مین مسلمان لڑکے تنہا اُردو لین تو سرکاری دفترون مین وہ کارآمد نہین رہتے اور اس لئے وہان ان کے لئے جگہ نہین نکل سکتی، اور اگر نہین لیتے تو وہ اپنی قومیت کو فنا کرتے ہین' اور اگر اُردو اور دوسری دیسی زبان دونون ساتھ لین تو وہ اپنے مقابل کے ہموطن طالب علمون کے مقابلہ مین کمزور رہتے ہین، جنوبی ہندوستان مین اُردو کو تعلیمی زبان قرار دینے مین اس وقت یہی سب سے بڑی دقت پیش آرہی ہے' پچھلے دنون بمبئی

گورنمنٹ نے مسلمان ممبروں اور اُردو کے حامیوں کی ایک کمیٹی ان مشکلوں پر غور کرنے کیلئے مقرر کی تھی نتیجہ بحث یہ تھا کہ تمام فنون مسلمانوں کو اسکولوں مین اردو کے ذریعہ سے سکھائے جائین اس تجویز پر تقریبًا عمل شروع ہوچکا ہے، قصبات مین اردو مکاتب قائم کردیئے گئے ہین، اُردو معلمین کے پیدا کرنے کے لئے احمدآباد ٹریننگ کالج مین ایک اردو کلاس گورنمنٹ نے جاری کردیا ہے، اردو مدارس کے لئے مسلمان انسپکٹر بھی مقرر ہین، پھر بھی اُس وقت تک پوری کامیابی نہین ہوسکتی جب تک اردو کے لئے خاص ٹریننگ کالج گورنمنٹ قائم نہ کردے، ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن جب غور کی نظر سے خود اردو کے علمی سرمایہ کو پرکھا جائے تو افسوس ہوگا کہ اتنے شور و غل کے بعد بھی ہم ابھی تک منزل مقصود سے بہت دور ہین،

طاؤس را ز نقش و نگارے کہ ہست خلق
تحسین کنند و او خجل از پاے زشت خویش

ہماری علمی محتاجی

ملک کے علمی فقر و بے نوائی کا ماتم آج ہندوستان کے ہر گوشہ مین ہے، علمی مذاق کی کمی کا یہ عالم ہے کہ برسوں گذر جاتے ہین اور ملک مین کوئی اچھی تصنیف پیدا نہین ہوتی اور اگر خوش قسمتی سے ایک آدھ کتاب نکل بھی آتی ہے تو ناقدری سے رواج نہین پاتی، اُردو زبان ہندوستان کی عالمگیر زبان کہی جاتی ہے، ہندوستان کی بڑی بڑی ریاستوں مین وہ شاہی زبان تسلیم ہوتی ہے، پھر بھی ہندوستان کی دوسری صوبہ وار زبانوں کے مقابلہ مین ابھی اسکی جھولی کم مایہ ہے، اس کے کچکول مین اگر کچھ ہے تو شاعری اور افسانوں کے خزف ریزے ہین جن سے ایک عظیم الشان قوم کے لئے زندگی کا سامان میسر نہین آسکتا، علوم و فنون تک

LYTTON ALIGARH. UNIVERSITY

طرف، کیا اسلام کی کوئی جامع تاریخ موجود ہے

قومون کی ترقی صرف خیالات کی بلندی اور اصلاح پر منحصر ہے لیکن خیالات کا تغیر وانقلاب کس کے ہاتھ مین ہے، صرف تصنیفات اور ملک کے علمی کارنامون کے ہاتھ مین، اس بنا پر مسلمانون کی ترقی کو ان کے لٹریچر کی ترقی پر منحصر سمجھنا چاہئے، ملک مین آج جابجا اصلاحی مجلسین قائم ہین جو سال بسال اصلاحی تقریرون کا ایک انبار اسٹیج پر لگا دیتی ہین لیکن یہ پادر ہوا ہستیان جنکا وجود صرف ہوا کی چند موجون سے ہے کبھی کوئی پائدار مستقل اور مسلسل اثر قائم رکھ سکتی ہین؟ اگر ان کی نصف کوشش بھی مفید تصنیفات کی اشاعت مین صرف ہوتی تو ہم قوم مین ایک پائدار اور مستحکم تاثیر کا وجود پاتے، ہر گھر مین ایک دائمی اور غیر فانی خطیب موجود ہوتا جو ہر لحظہ قوم کو صحیح راستہ کی ہدایت کرسکتا،

مسلمانون کی سعی وکوشش کو چالیس برس ہوئے، لیکن یہ سنکر افسوس ہوگا کہ مسلمانونکی چہل سالہ جد وجہد کے بعد اتنا سرمایہ بھی ابھی میسر نہ آسکا ہے جو تنہا ایک الماری کی زینت کا بھی باعث ہوسکے لیکن اس وقت اور زیادہ افسوس ہوگا جب ہم الماری کے ایک ایک خانہ کو کھول کر دیکھین گے کہ یہ پیداوار کس جنس سے بھرا ہے تو تاریخ، مذہب اور افسانہ کے سوا ہر علم کا خانہ خالی ملیگا، متعدد قومین ہین جو زمانہ کی اسی مدت مین اپنے خزانون کو اتنا مالا مال کرچکی ہین کہ اب ہر سکہ کے قرض خواہ ان ہی کی طرف رخ کر رہے ہین،

مادری زبان مین تعلیم

تعلیمی تحریک کی چہل سالہ چیخ پکار نے تعلیم کا احساس پیدا کردیا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صحیح اور عمومی تعلیم ملکی زبان مین تعلیم کے بغیر حاصل نہین ہوسکتی، دنیا کے گذشتہ اور موجودہ مین

سینکڑون قومین عروج وکمال تک پہنچ چکی ہین لیکن تاریخ اس مثال سے عاجز ہے کہ کبھی غیرملکی زبان کی تعلیم قومون کے عروج وارتقا کا باعث ہوئی ہے،

لیکن جب ملکی زبان مین تعلیم کا مسئلہ پیش آئیگا تو کیا ہندوستان کے طول وعرض مین کوئی ٹکسال ایسی نظر آئے گی جہان سے تعلیمی نصاب کی کتابین ڈھل ڈھل کر باہر آئینگی، یہ مقصد اس وقت تک ممکن الحصول نہین ہوسکتا جبتک ملک کی زبان مین کثرت سے علمی تصنیفات موجود نہ ہون، ہائی ایجوکیشن اور اس کے لئے کورس کی تکمیل تو بڑی چیز ہے ابتدائی مکاتب جو مسلمانون کے اہتمام مین ابتک ہین کیا ان کی ضرورت کے مطابق بھی سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے؟[1]

اشخاص کا قحط زمانۂ جدید نے اپنے انقلاب کے ساتھ ہمین چند نفوس عطا کئے تھے جنھون نے اپنے امکان بھر ان مین سے بعض ضرورتون کو ایک حد تک پورا کیا، سرسید، نذیر احمد، آزاد، حالی اور شبلی ہماری جدید نشأۃ علمیہ کے کارپرداز تھے، ان کی زندگی ہماری علمی ضرورتون کی ضامن تھی لیکن موت کے بادصرصر کا ہاتھ جب ان چراغون کو گل کرچکا ہے تو مستقبل کا منظر کس قدر اندھیرا اور بھیانک نظر آتا ہے اور علمی کوششون کے لئے پہلے سے کتنی زیادہ ضرورت بڑھ گئی ہے، ان ضرورتون کے پوری نہ ہونے کی زیادہ تر ذمہ دار صرف دو چیزین ہین مصنفین کی پریشان حالی اور تصنیفی سلیقہ کی تعلیم کے لئے کسی تربیت گاہ کا نہ ہونا،

حقیقی مصنف ہر زمانہ مین پریشان حال رہے ہین، پھر بھی موجودہ زمانہ نے ان کو اور زیادہ

---

[1] یہ آج سے بائیس برس پہلے کا نقشہ تھا، "س" ۱۹؍اگست ۱۹۳۶ء

پریشان بنا رکھا ہے۔ ان شاذونادر ہستیون کے لئے جو اپنی زندگی کا مقصد صرف علم کی خدمت قرار دینا چاہتی ہین، ہندوستان کی کئی ہزار میل کی وسعت مین امن واطمینان کا ایک گوشہ بھی نہین ہے؟ غیر ملکی حکومت ملکی مصنفون کی دستگیری کے لئے تیار نہین، کوئی قومی کتب خانہ ہماری ضرورت کے مطابق ملک مین موجود نہین، اُن کی علمی پاسداری کے لئے کوئی فنڈ نہین، جو ان کے دل و دماغ کو افکار سے فارغ کر سکے، نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مصنف جب ہر قسم کی کڑیان جھیل کر اور ہر طرح کی مصیبتین اٹھا کر جب اپنی تصنیف کے چند اجزا، فراہم کر لیتا ہے تو صدا دیتا ہے،

من قماش فروشِ دل صد پارۂ خویشم،

لیکن افسوس کی انتہا نہین ہوتی جب کرۂ ارضی اور فضائے آسمانی سے ایک آواز بھی اِن جگر پارون کی خریداری کے لئے نہین اٹھتی،

اگلے مصنفون کا کام کتاب کا آخری صفحہ لکھکر ختم ہو جاتا تھا، شائقین خود اس کے نسخی ہاتھون ہاتھ نقل کر کے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق پہنچا دیتے تھے، لیکن حال کے مصنفون کا کام ختم تصنیف کے بعد شروع ہوتا ہے، کتاب کو کسی مطبع کے حوالے کرنا، کاپیون کی تصحیح، پروفون کی ترمیم، روپیہ کی کافی مقدار کی فراہمی، اور پھر ریویو اور اشتہار کے لئے اخبارون کی خوشامد اور چاپلوسی، اور ان ساری مصیبتون کے بعد کتاب کے نسخون کو بغل مین دبا کر خریدار کی تلاش مین گلی کوچہ کی آوارہ گردی، کیا یہ قابلِ رحم حالت اس انسانی طبقہ کے مناسبِ حال ہے، جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم اور صرف علم کیلئے ہونا چاہیئے تھا،

پبلک کی ناقدرشناسی کا جہان گلہ ہے خود مصنفون کی نسبت بھی کچھ کہنے کی حاجت ہے

جسم کے مختلف اعضا جس طرح اس کی زندگی کی مختلف ضرورتون کو پورا کرتے ہین، قوم کی مختلف کارکن جماعتین بھی اسی طرح اس کی زندگی کے ضروری آلاتِ حیات ہین، قوم کے اربابِ قلم طبقہ کا کام جسم قومی کے لئے مقوی اور صحت بخش غذا کی فراہمی اور صحیح خون کی پیدایش ہے، اس بنا پر نہایت ضروری ہے کہ یہ طبقہ مختلف علمی غذاؤن کے انتخاب کا سلیقہ، کیمیاوی ترکیب و تحلیل کا طریقہ، موقع اور ضرورت کا علم اور غذاؤن کی قوت اور ضعف کا فیصلہ اسی حیثیت سے کر سکے جس طرح ایک جسمانی ڈاکٹر مادی جسم کے لئے ہر روز کرتا ہے اگاؤن کا ہر جاہل عطائی اس لائق نہین کہ وہ جسم کے صحیح پرداخت کے لئے اپنی مختصر دکان کی بوسیدہ جڑی بوٹیون سے کوئی نسخہ ترتیب دے سکے اسی طرح ہر شخص جو ہاتھ مین قلم پکڑ سکتا ہے تصنیف کی بلند سطح پر جگہ پانے کے لائق نہین،

نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

ہندوستان کے بعض صوبے جس فراخدلی کے ساتھ ایک طرف جسمانی امراض کے لئے عطائیانہ اشتہاری نسخے ترتیب دے رہے ہین، دوسری طرف علمی تندرستی کے لئے چھپے ہوئے کاغذون کا ڈھیر لگا رہے ہین، اس پر نظر کرتے ہوئے کون اس ضرورت کا کہ اردو کی ایک باقاعدہ انجمن کی ضرورت ہی انکار کرے گا،

اردو کا سرمایہ زبان کو زبان بنانے کے لئے تین چیزون کی ضرورت ہے، اوّل حصول لغت کی تدوین، دوم علمی تصنیفات اور تیسرے تراجم، ہم کو ان مین ہر ایک پر غور کرنا چاہئے کہ اب تک کیا ہو چکا ہے،

تدوین اصول لغت

کسی زبان کو زبان بنانے کے لئے سب سے پہلے اس کے اصول قواعد کی تدوین اور اس کے لئے قاموس و لغات اور ڈکشنریون کی تالیف کی ضرورت ہے، اس سلسلہ مین ابتک جو کچھ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ انیسوین صدی کے شروع مین جان گلگرسٹ نے قواعد اردو لکھی اسی زمانہ مین سید انشا نے بھی اردو کے قواعد لکھے، اُس وقت سے لیکر اس وقت تک سرکاری مدارس اور انگریز افسرون کی تعلیم کے لئے متعدد رسالے لکھے جا چکے ہین. میر ضامن علی جلال شوق نیموی عظیم آبادی، اور حافظ جلیل حسن جلیل کے رسالے بھی کام کے ہین، لیکن اس سلسلہ مین سب سے بہتر اور سب سے زیادہ قابل قدر مولوی فتح محمد صاحب جالندھری اور مولوی عبدالحق صاحب کی قواعد اُردو ہے، اور ان کتابون سے ایک حد تک یہ کام تکمیل کو پہنچ رہا ہے، لیکن اُردو کے لغت کا کام ابھی بہت پیچھے ہے، مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگ آصفیہ کے سوا کوئی کامل کتاب اس فن مین نظر نہین آتی منشی امیر احمد صاحب کی امیر اللغات ابتک ناتمام ہے اور خدا جانے اس کی تکمیل کی کب تک نوبت آئے، بہر حال یہ چیز ابھی ہمارے التفات کی محتاج ہے۔

تصنیفات

اردو زبان کی مستقل ادبی تصنیفات سرسید، نواب محسن الملک مولانا نذیر احمد مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا شبلی اور مولوی عبدالرزاق صاحب کی تصنیفات اور انجمن ترقی اردو کی بعض شائع کی ہوئی کتابون کے سوا اور کچھ نہین ہی، ان کتابون کی اگر ایک ایک فن کی حیثیت سے تقسیم کیجائے تو مذہب، تاریخ، اور شاعری کے سوا ہر فن صفر یا قریب صفر کے نظر آئے گا، تاریخ کا یہ حال ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اسلام کی جامع تاریخ جاننی چاہئے لیکن مولوی ابوالفضل عباسی کی تاریخ الاسلام کے علاوہ کوئی کتاب نہین، یا پنجاب اور آگرہ کے بعض اشخاص

کی پریشان اور نامعتبر کتابین ہین مسلمانون کے نقطۂ خیال سے محقق ماخذون کی بنا پر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ سیاسی اور علمی دونون حیثیت سے نہایت ضروری ہے، مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کی تاریخ ہندوستان، انگریزی فکر و دماغ کا بالکل عکس ہے،

علوم عقلیہ کا تذکرہ اُردو تاریخ مین ایک افسوس ناک یاد ہے، علوم طبعی و ریاضی کا سب سے قدیم سلسلہ لکھنؤ کے شاہی دربار کے ایک دو مختصر رسالے ہین، اور قدیم سلسلہ مین سب سے مفصل رسالے حیدرآباد کے نواب شمس الامراء کے مختلف علوم مین چھ رسالے ہین، جدید کوششون مین ناانصافی ہوگی اگر پنجاب یونیورسٹی کے ابتدائی طبعی رسالون کا ذکر نہ کیا جائے انجمن ترقی اردو کی کوششون سے مبادی سائنس اور فلسفۂ جذبات دو کتابین خاص اہمیت کے قابل ہین لیکن چند کتابون کے سوا اُردو کا دامن افسوس ہے کہ ہر قسم کے علم و فن سے خالی ہے،

تراجم | تراجم کے دو حصے ہین، عربی زبان اور مغربی زبانین ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہین کہ اس باب مین عربی جاننے والے عالمون نے سب سے زیادہ خدمتین انجام دی ہین، قرآن پاک احادیث اور فقہ کی کتابون کے علاوہ تاریخ ابن اثیر، تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابن خلکان، تاریخ اسد الغابہ وغیرہ کی کثیر التعداد اور ضخیم جلدین اُردو مین منتقل ہوچکی ہین، مغربی زبانون سے لیبان کی تمدن عرب، بکل کی ہسٹری آف سویلیزیشن، ڈریپر کی معرکۂ مذہب و سائنس کے سوا اور کوئی ممتاز چیز ہم کو نظر نہین آئی،

اردو زبان کی اس مختصر علمی پیمائش سے یہ ثابت ہوگا کہ ہم نے کس حد تک کام کیا ہے اور آگے ہم کو کیا کرنا ہے،

ہندوستان میں ہندوستانی

مقالہ انجمن اُردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

میں ۱۹۳۳ء کو پڑھا گیا

شکریہ یا شکوہ عزیزانِ گرامی! آج مدت کے بعد آپکے سامنے اظہارِ خیال کا موقع ہاتھ آیا ہے اس کے لئے آپکے استاد محترم رشید صدیقی صاحب شکریہ کے مستحق یا شکایت کے مستوجب ہین کہ انھون نے مجھے کچھ کہنے اور آپ کو اس کے سننے پر مجبور کیا، گو حضرتِ داعی کی طرف سے کسی مضمون کی تخصیص نہین تھی لیکن "اُردوے معلیٰ" کی تقریب سے مین نے مناسب سمجھا کہ اس مجلس کا موضوع "ہندوستان مین ہندوستانی" ہو،

ہندوستان مین ہندوستانی، اس زمانہ مین جبکہ ہر ملک مین یہ آواز بلند ہے کہ ملک کی باگ اہلِ ملک کے ہاتھون مین دیدیجائے، یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ ایران مین ایرانی اور مصر مین مصری اور عراق مین عراقی کی طرح "ہندوستان مین ہندوستانی" کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان میں صرف ہندوستانی ہون لیکن مین اطمینان دلاتا ہون کہ "ہندوستانی" سے میری مراد

"ہندوستانی باشندے" نہین "ہندوستانی بھاشا" ہے، اور میری تقریر کا مقصود "سیاسی سوراج" نہین بلکہ "زبانی سوراج" ہے" آجکل بعض دوستون نے "پنجاب مین اردو" اور "دکن مین اردو" لکھی اور ایک عزیز نے "گجرات مین اردو" لکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ "عزیز ہندوستان" مین اردو کی داستان بھی کچھ سنائی جائے، خدا کے فضل سے اس میدان مین صوبۂ متحدہ، پنجاب اور دکن کے علماے ادب نے اتنی تحقیقات کی ہے کہ "آبحیات" کا قصہ اب افسانہ ہوکر رہ گیا ہے،

ہندوستان مین مسلمانون کے برکات

عزیزانِ اسلام! جس ملک مین ہم آپ آباد ہین یہان ہمارے اسلاف جن اغراض اور اسباب سے بھی آئے ہون بہرحال اب ہم کو اسی دیس مین رہنا اور اسی زمین مین جینا اور مرنا ہے، آیئے ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے اس پر غور کرین کہ اس ملک کو ہمارے بزرگون کی آمد سے کیا خیر و برکت نصیب ہوئی،

ہندوستان مین وحدت کا خیال

ہندوستان کو اسلام کے داخلہ سے جو علمی، تمدنی، تجارتی، صنعتی، تعمیری اور سیاسی فائدے پہنچے ان کو یہان شمار کرنا ممکن ہے اور نہ ہمارے موضوع کے دائرہ کے اندر ہے لیکن یہان صرف ایک حقیقت کا اظہار مقصود ہے، ہندوستان مسلمانون کی آمد سے پہلے چھوٹے چھوٹے بےشمار ملکون اور ریاستون کا ایک ایسا مجموعہ تھا، جس کو کسی حیثیت سے ایک ملک نہین کہہ سکتے تھے، یہان مسلمانون کی آمد کا وہ زمانہ تھا، جب اس ملک مین بودھ مت اور ویدک دھرم ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لیے دست و گریبان تھے، وہ مسلمان ہی تھے جنھون نے بودھ مت کی سیاسی طاقت کو توڑا اور ویدک دھرم کو ترقی دے کر پورے ملک مین ایک مذہب کو اکثریت کا موقع عنایت کیا،

ہندوستان جیسا کہ اُس وقت کی تاریخون سے ظاہر ہے سینکڑون چھوٹی بڑی ریاستون اور مملکتون مین بٹا ہوا تھا سلطان غزنوی کے فتوحات کے عہد مین اس ملک مین دو اسلامی اسمٰعیلی ریاستین قائم تھین ایک ملتان مین اور دوسری منصورہ (یعنی بھکر واقع سندھ) مین ان کے علاوہ صوبۂ سرحد مین شاہی حکومت تھی جسکا پایۂ تخت دہیند تھا، کشمیر، اجمیر، دہلی، قنوج، مگدھ (بہار) بنگال، گجرات، مالوہ وغیرہ سینکڑون ریاستین تھین، جو ایک دوسرے سے باہم دست و گریبان رہتی تھین، مسلمانون نے آکر ان ملکون کو ایک ملک اور ان ریاستون کو ایک سلطنت بنا لیا جس مین پشاور سے لیکر سورت تک ایک حکومت قائم تھی،

ہندوستان مین زبانون کی کثرت

زبان کے لحاظ سے اس ملک مین بھانت بھانت کی بولیان تھین اور ہین، چنانچہ پیمایش لسانی کے محققین کے نزدیک اسمین آج بھی تین سو سے زیادہ بولیان مروج ہین ان بولیون کو چھوڑ کر یہان کی صرف ممتاز زبانون کو لیا جائے تو بھی یہ تعداد دہائی سے کم نہ ہوگی،

مسلمانون نے جب سے اس ملک مین قدم رکھا وہ یہان کی زبانون اور بولیون کی کثرت کے شاکی نظر آئے ۲۷۰ھ مین جب کہ سندھ کی اسلامی عربی حکومت پر پونے دو سو برس گذر چکے تھے، منصورہ (بھکر واقع سندھ) مین ایک ایسا عراقی مسلمان شاعر تھا جو ہندوستان کی مختلف زبانون سے واقف تھا، اور اس نے الرا (الور سندھ) کے راجہ کی فرمایش سے قرآن کا ترجمہ ہندی (شاید سندھ کی کسی بولی) مین کیا تھا[1] مسعودی جو ۳۰۳ھ مین ہندوستان آیا تھا، ہندوستان کی

---

[1] عجائب الہند بزرگ بن شہریار ص ۳ پیرس،

ملکی اور لسانی پریشان حالی کا تذکرہ ان لفظون مین کرتا ہے،

"بعد ازین ہند کے لوگون کے خیالات مختلف ہوگئے، اور مختلف گروہ پیدا ہوگئے، اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کرلی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا اور قنوج پر دوسرا، اور کشمیر مین تیسرا[1] اور مانگیر پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات کاٹھیا وار) بلہرا (ولبھ راے) کی حکومت ہوئی۔۔۔۔

اور ان ریاستون مین باہم اختلافات ہین[1]،

یہی مورخ آگے چلکر لکھتا ہے،

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے۔۔۔۔۔۔ اور مانگیر (یعنی گجرات) کی زبان گیری ہے اور اس کے ساحلی شہرون جیسے چیمور، سوبارہ اور تھانہ (بمبئی) کی زبان لارئی ہے[2]"

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ مین ترتیب دی ہے، سندھ و ہند کی نسبت لکھتا ہے،

"یہ لوگ مختلف زبانون اور مختلف مذہبون والے ہین، اور ان کے لکھنے کے خط بھی کئی ہین، ایک شخص نے جو اس ملک مین خوب گھوما پھرا تھا، بتایا ہے کہ وہان دو خط مستعمل ہین[3]"

ابوریحان بیرونی نے جو سلطان محمود غزنوی کا معاصر تھا، اور جو ہندوستان مین سالہا سال رہ کر یہان کے علوم و فنون اور زبانون کو سیکھا تھا ایک موقع پر ہندوستان کے رسم خطون کے سلسلہ مین لکھا ہے،

---

[1] مروج الذہب مسعودی جلد اول صفحہ ۱۶۲ پیرس، [2] مروج الذہب مسعودی جلد اول صفحہ ۳۸۱ پیرس، [3] کتاب الفہرست مصر صفحہ ۲۴

"ہندی خط بائین طرف سے چلتا ہے، ان کے مشہور رسم خط کا نام سدھ ماترک ہے، جو کشمیر کی طرف عموماً منسوب ہے، اور یہی بنارس مین جاری ہے اور یہی مدھ دیس یعنی صوبہ متوسط مین جو قنوج کے اطراف کا نام ہے جس کو آریا ورت کہتے ہین چلتا ہے، مالوہ کے حدود مین ایک خط جاری ہے جس کو ناگر کہتے ہین، اور اسی کے بعد اردھ ناگری خط ہے یعنی آدھا ناگر کیونکہ یہ ناگر اور دوسرے خطوں سے ملا جلا ہے، اور یہ بھاتیہ اور کچھ سندھ مین مروج ہے، اس کے بعد ملواری خط ہے جو ملوشا یعنی جنوبی سندھ مین رائج ہے، اور کنڑی کرناٹک مین اور انتری (آندھری) انترا (آندھر) مین، اور دراوڑی دراوڑ دیش مین، اور لاڑی لار دیش گجرات و کاٹھیاواڑ مین اور گوڑی (بنگالی) پورب دیش مین، اور بیکشک اودنپور مین اور یہ بودھون کا خط ہے۔" (ص ۸۲)

رسم خط کے اختلاف سے ہر صوبہ کی زبانون کا اختلاف بھی ظاہر ہوتا ہے،

یہ تو عربون کے بیانات تھے اب فارسی والون کے لیجئے، امیر خسرو نے جو ساتوین صدی کے آخر اور آٹھوین صدی کے شروع مین تھے، اپنی مثنوی نہ سپہر مین ہندوستان کے مختلف صوبون کی حسب ذیل بولیان گنائی ہین، سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی (واقع بنگال) گجراتی، تلنگی، معبری، (کنڑی) دھور سمندری (کارومنڈل) اودھی اور دہلوی،

امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ مین بھی یہی بولیان تھین، ابو الفضل آئین اکبری مین ان زبانون کے یہ نام گناتا ہے،

دہلوی، بنگالی، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، سندھی، افغانی، شال (جو سندھ کابل اور قندھار کے بیچ مین ہے) بلوچستانی، کشمیری، یہ زبانین آج بھی موجود اور بولی

جاتی ہین، صرف ایک بمبئی کے احاطہ مین گجراتی، مرہٹی، کچھی، کنڑی، اُردو اور سندھی، چھ زبانین رائج ہین، مدراس مین اڑیا، تامل، تلنگو، ملیالم اور اُردو پانچ زبانون کا رواج ہے، ایک حیدرآباد کی ریاست مین مرہٹی، کنڑی، تامل، تلنگی اور اُردو پانچ زبانین ایک ساتھ ہین، بہار، اڑیسہ مین اڑیا، اردو، ہندی، مرہٹی اور بھوجپوری بولیان ہین، پنجاب مین پنجابی اور اُردو کا میل ہے اور صوبہ سرحد مین پشتو، پنجابی اور اردو تین زبانین دوش بدوش ہین،

ابھی حال مین مہامہوپادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے "قرون وسطی مین ہندوستانی تہذیب" کے عنوان سے چند خطبے دیئے ہین جنکو ہندوستانی اکاڈیمی نے اردو مین ترجمہ کرکے شائع کیا ہے، فاضل موصوف نے اپنی دوسری تقریر کے خاتمہ مین سنسکرت کے بعد یہان کی پراکرت زبانون کا کچھ کچھ حال بیان کیا ہے، اور اُن کی حسب ذیل چھ قسمین بتائی ہین، ماگدھی، شورسینی، مہاراشٹری، پیشاچی، اوشک اور آپ بھرنش،

ماگدھی | مگدھ اور اس کے قرب وجوار کے عوام کی زبان تھی، قدیم ماگدھی اشوک کے کتبون مین ملتی ہے، عام طور پر سنسکرت کے ناٹکون کے چھوٹے ملازم مثلاً دھیور، سپاہی، بدیسی، جین سادھو اور بچون سے اسی زبان مین باتین کرائی جاتی ہین،

شورسینی | شورسین یا متھرا کے قرب وجوار کے علاقہ کی زبان تھی، سنسکرت ناٹکون مین عورتون اور مسخرون کی بات چیت مین اس کا استعمال اکثر کیا گیا ہے،

مہاراشٹری | مہاراشٹر یعنی مرہٹہ کی زبان اُس کا استعمال بالخصوص پراکرت زبان کی شاعرانہ تصنیف کے لئے کیا جاتا تھا،

پیشاچی پیشاچی زبان کشمیر اور ہندوستان کے مغربی و شمالی حصّون کی زبان تھی،

اونتک اونتی یعنی مالوہ کی عام زبان تھی، یہ زبان اُجّین اور مندسور مین رائج تھی،

اَپ بھرنش اس زبان کا رواج گجرات، مارواڑ، جنوبی پنجاب، راجپوتانہ، اجین اور مندسور وغیرہ مقامات مین تھا، دراصل یہ کوئی زبان نہ تھی بلکہ ماگدھی وغیرہ مختلف پراکرت بھاشاؤن کی بگڑی ہوئی مخلوط بھاشا کا نام ہے، راجپوتانہ، مالوہ، کاٹھیاواڑ اور کچھ وغیرہ مقامات کے بھاٹون کے ڈنگل بھاشا کے گیت اسی بھاشا کی بگڑی ہوئی صورتین ہین، قدیم ہندی بھی بیشتر اسی بھاشا سے نکلی ہے،

جنوبی ہند کی بھاشائین ان کے علاوہ ہین،

ٹامل، جنوبی ہند کی زبانون مین سب سے قدیم اور فائق ٹامل ہی، اس زبان کا نشو ونما زیادہ تر جینیون کے ہاتھون ہوا، اس کا رسم الخط سب سے الگ ہے،

ملیالم، ملیبار کی زبان ہے، مگر اس مین سنسکرت الفاظ بکثرت مل گئے ہین،

کنڑی، اس زبان کے ادبیات کی پرورش و پرداخت بھی جینیون نے کی،

تیلنگو، آندھرا صوبہ مین مروج ہے،

مسلمانون کی آمد اور زبانون کی تشکیل تفصیل بالا ایک ہندو فاضل کی تصنیف سے ماخوذ ہی، ان حوالون سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ مسلمانون کی آمد سے پہلے اس ملک مین بیسیون زبانین مروج تھین جو زیادہ تر مختلف صوبون مختلف قومون اور مختلف دھرمون کے زیرِ سایہ اپنی ہستی برقرار رکھے ہوئی تھین، مسلمانون نے جب اس ملک مین قدم رکھا تو اس ملک کی زبانون

کی نیرنگی اور بہاشاؤن کی کثرت کو دیکھ کر متحیر رہ گئے، جیسے جیسے اُن کا قدم اندرون ملک مین آگے بڑھتا گیا اُن کی حیرت مین اضافہ ہوتا گیا، وہ قدرتی طور پر اپنے ساتھ اپنی زبان بھی لائے تھے، عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک و مغل ترکی، مگر ان سب پر فارسی اثر غالب تھا، سندھ کے حکمران گو عرب تھے، مگر ایران کے قرب اور فارسی تاجرون اور جہاز رانون کی آمد و رفت کے سبب سے عربی آمیز فارسی کی ہر جگہ کثرت تھی اور ادھر درہ خیبر سے جو قومین آئین اُن کی مادری زبان کچھ بھی ہو مگر ان کی سلطنت کی شاہی اور دفتری زبان فارسی ہی تھی، اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی شاہی و سرکاری زبان فارسی ہی رہی،

دیسی زبانون مین مسلمانی لفظون کا میل

لیکن ملکی بول چال اور عام زبان کے لئے نہ تو یہ ممکن تھا کہ تمام ہندوستان کی زبان فارسی کردیجائے، اور نہ یہ ممکن تھا کہ ہندوستان کے کسی ایک صوبہ کی زبان کو اختیار کرکے اُس کو پورے ملک پر محیط کر دیا جائے اس لئے قدرتی طور سے یہ ہوا کہ مسلمان جس صوبہ مین گئے وہان کی صوبہ وار زبان اختیار کی ساتھ ہی مذہبی، سیاسی، تمدنی، صنعتی تجارتی، اور علمی ضرورتون سے اپنی زبان کے سینکڑون ہزارون الفاظ اسی طرح اس ملک کی زبان مین مجبوراً بڑھائے جیسے آج ہم انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اختیار کرنے پر مجبور ہین،

مذہبی مصطلحات، اللہ، ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، دعا، خیرات، صدقات، رسول پیغمبر، وحی، کتاب الٰہی، دوزخ، بہشت وغیرہ بیشمار الفاظ ہین، جو بعینہ ہندوستان کی ہر ملکی بولی مین وہ اضافہ پر مجبور ہوئے،

اسی طرح بادشاہ، وزیر، میر عدل، صدر جہان، مقطع دار، صوبہ دار، سپہ سالار، قاضی وغیرہ

سینکڑون سیاسی اصطلاحات تھے، جو ان کی سلطنت کے روزمرہ مین جاری تھے، وہ ہندوستان کی ان مختلف ملکی بولیون مین بھی جاری ہوگئے آجکل کی زمینداری مین خواہ وہ ہندوون کی ہو یا مسلمانون کی جس قدر عہدے اور مالی اصطلاحات ہین وہ عموماً عربی فارسی آمیز ہین مثلاً دیوان نائب، تحصیلدار، ضلعدار، کارندہ، گماشتہ، سیاہہ نویس، تحویلدار، واصل باقی نویس، خزانچی، متصدی، پیشکار، سررشتہ دار، محافظ دفتر، محرر وغیرہ، اب اصطلاحات کو لیجئے واصل باقی، جمع بندی، مالگذاری جمع خرچ، گوشوارہ، فرد، بند، روزنامچہ، یادداشت، خلاصہ کیفیت، جلسوار، پروانہ، تیرپیچ وغیرہ یہ الفاظ نہ صرف اردو اور سادہ ہندی مین بلکہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانون مین بھی بعینہٖ یا ان کے دوسرے مرادف مستعمل ہین، مرہٹی بولنے والے مرہٹے اپنے وزیرون کو پیشوا اور عام ہندو ریاستین ان کو آج تک دیوان کہتی ہین، اور یہ دونون فارسی ہین، اسی طرح مرہٹی، گجراتی، اور بنگالی مین معاملہ مقدمہ کے بھی اکثر الفاظ اور اصطلاحات عربی یا فارسی ہین، ہم اپنے صوبہ مین دیہاتی کسانون کے سردار کو چودھری کہتے ہین لیکن مہاراشٹر مین اس کا نام مقدم ہے، کلرک کے لئے آپ محرر بولتے ہین مگر وہان اس کو کارکن کہتے ہین،

زراعت ہندوستان کا پیشہ تھا مسلمانون نے اگر اس پیشہ کو فن کی حیثیت سے جو ترقی دی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہین مختصر اتنا کہنا ہے کہ کابل، ترکستان اور ایران کے بیسیون میوے اور پھل وہ ہندوستان لائے، اور ان کے ساتھ ساتھ اُن کے نام بھی آئے اور یہ سارے ہندوستان مین ہر بولی بولنے والون کی زبانون پر بعینہٖ چڑھ گئے، انگور، انار، سیب، بہی، انجیر، نارنگی، خربوزہ، تربزہ، سردہ، بادام، منقی، کشمش، پستہ، شفتالو، ناشپاتی، آبجوش، خوبانی، چلغوزہ،

فندق کے مزون سے اہل ہند ایسے مانوس ہوئے کہ ان پھلون کے ساتھ اُن کے نامون سے بھی اپنی زبان کو نئی لذت بخشی، پھولون کے بہت سے اقسام مسلمان ہندوستان لائے مثلاً گلاب، سوسن، سنبل، ریحان، بنفشہ، خطمی، نرگس، نسرین، نسترن، گل طرہ، (گل لالہ) ہیرا، گل شبو، (گل شب بو) گل مخمل وغیرہ آج یہ واقعہ تعجب سے سنا جائے گا کہ تغلقون کے زمانہ مین دہلی اور اس کے نواح مین بارہ سو باغ تھے جن مین نو قسم کے انگور تھے۔ (تاریخ فیروز شاہی)

میوون کی تمہید سے مسلمانون کے دسترخوان کے الوانِ نعمت یاد آئے، خشکہ، پلاؤ، قبولی، بریانی، زردہ، شیر برنج، قورمہ، قلیہ، شوربا، کباب، یخنی، دم پخت، قیمہ، کوفتہ، مزعفر، مطنجن، حلوا وغیرہ مسلمانون نے پیش کیا، اور پورے ملک کے کام و دہن نے ان کے نامون سے لذت پائی کھنڈ کیلی، شربت، فالودہ اور برف کا آبخورہ سامنے رکھا، ہندوستان کی ایک روٹی کو کبھی نان بنایا کبھی شیرمال کبھی آبی، اور کبھی باقرخانی، اور کبھی روغنی اور کبھی چپاتی اور کبھی کاک اور کبھی کلچہ، مٹھائی ہندوستان کی چیز ہے، مگر صورت اور مادہ کے ساتھ نامون کا تنوع اسلامی تہذیب نے بخشا، یہان تک کہ مٹھائی بنانے والے کے لئے عربی نام حلوائی، دیا برہمن کی پاک اور پوتر زبان کو بھی مجبوراً چھو لیتا اگر اور حلوائی کے "خوانچہ" پر بالوشاہی جس کی اصل شاید والاشاہی ہو، قلاقند یا برفی، شکرپارے، نمک پارے، خرمے، نقل، گلاب جامن، جلیبی، زعفرانی وغیرہ ملین گے۔

کپڑون کی نئی نئی صنعت کاریون کی ایجادات کے ساتھ ان کے نامون کو بھی ہندوستان کی زبانون مین فروغ دیا، مخمل، قاقم، کاشانی، زربفت، طاس، منقش، شیروانی، مشجر، کمخواب، دیبا، اطلس، تافتہ، بافتہ، مشروع، زری، گلبدن، تن زیب، شال باف، جامہ وار، محمودی، علی قلی خانی

زرتار، چارخانہ، جامدانی، کامدانی، برہنہ تن ہندوستان کو ان کپڑون کی بدولت کرتہ، اچکن، چپکن، پیشواز، میرزائی، نیم آستین، جامہ، عبا، قبا، چوغا، قرغل، کلاہ، دستار، کلغی، شال، دوشالہ، چادر، پوستین، شلوار، پاجامہ، ازار، توشک، لحاف، فرش، قالین، مسند، بستر، رضائی، دولائی، تکیہ، غلاف، چادر، رومال، مندیل، موزے، ازاربند، کمربند، کے نام عربی فارسی اور ترکی سے آئے، پان ہندوستان کی چیز تھی، مگر اس کے لئے، پاندان، خاصدان اور اگالدان اسلامی تہذیب نے پیش کئے، کھانا کس ملک مین پکایا اور کھایا نہین جاتا، مگر ہندوستان کی قناعت پسند طبیعت مٹی کی ہانڈیون اور کیلے کے پتون سے آگے نہین بڑھی مسلمان آئے تو دیگ، دیگچی، کفگیر، چمچہ، رکابی، پیالہ، بادیہ، قاب، دسترخوان، آفتابہ، آبخورہ، سیلابچی، صابون، خلال، بکاول، باورچی، رکابدار، خانساماں اپنے ساتھ لائے مسلمان جب یہان آئے تو سرِشام یہان دیا اور دیپک جلتا پایا، انھون نے سرِ محفل شمع جلائی، قندیل روشن کی، اور جابجا فانوس، دیوارگیر، لالہ، مردنگ اور فتیلہ سوز رکھے، اوران سے مشعلچی نے مشعل جلا کر راستہ کو پرنور کیا، ہندوستان ہمیشہ سے گرم ملک تھا، مگر شورہ لگا کر اور پہاڑون سے برف منگا کر گرمی مین پانی کو ٹھنڈا مسلمانون نے کیا اور چق، چلمن اور پردے لٹکا کر گھرون کو محفوظ کیا، اور ہندوستان ہی کی ایک گھاس کو "خس" کہکر پکارا، اور اس کی ٹٹیان بنوا کر کھڑی کین[1]،

گھوڑے کی سواری کہان نہ تھی، مگر جب مسلمان یہان آئے تو لگام، زین، تنگ، خوگیر، رکاب، نعل، نکتہ، جل، جس کی خرابی جھول ہے، سائیس، سوار، شہسوار، تازیانہ، قمچی، سب اپنے

[1] اس کی تفصیلات بابر کی تزک مین ملین گی،

ساتھ لائے،

جواہرات مین دُرِّ عمانی عقیق یمنی لعل بدخشانی، زمرد، زبرجد، یشب، فیروزہ، سنگ ستارہ، سب اُن کے لائے ہوئے ہین، تعمیری پتھرون مین سنگ مرمر، سنگ موسیٰ، سنگ سرخ، سنگ سماق، سنگ لرزان، سنگ خارا سب اُن کے نکالے ہوئے ہین، زیورون مین سرپیچ، مرزا بے پروا، کلغی، طرہ، کانون مین دُرے، گوشوارے، ہاتھون مین دست بند، جہانگیری، بازو بند، نورتن، جوشن، پرتی بند، گلے مین ہیکل، طوق، تعویذ، گلوبند، زنجیر، کمر مین کرزیب، اور پاؤن مین پازیب ان بیسیون نامون کو چھوڑ کر جو ہندی مین وضع کئے،

خوشبوؤن مین عطر اُن کی ایجاد ہے، اور خود عطر اور اس کے بیسیون ہندی، فارسی اور عربی نام ان کے وضع کئے اور وہی ملک کی ہر زبان مین پھیلے ہوئے ہین،

ان مثالون سے مقصود یہ ہے کہ مسلمانون نے جب یہان قدم رکھا تو اپنے پورے تمدن و معاشرت، ساز و سامان اور اپنی اصطلاحات و ایجادات کو ساتھ لے کر یہان وارد ہوئے، اور ان سب کے لئے نام، اصطلاحات اور الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے اور چونکہ یہ ہندوستان مین بالکل نئی چیزین تھین اس لئے ہندوستان کی بولیون مین ان کے مرادفات کی تلاش بیکار تھی اور وہی الفاظ ہندوستان مین رائج ہوگئے،

زبان کی ترکیب کے تین عناصر

زبان کی ترکیب تین چیزون سے ہوتی ہے، اسم، فعل اور حرف، مسلمانون نے یہان آکر جو زبان اختیار کی اس کے تمام فعل اور حرف ہندوستان ہی کی بولیون کے اختیار کئے، البتہ آدھے اسمار جن مین بڑا حصہ نئی چیزون اور نئے نامون کا تھا، وہ اپنی زبان سے لائے

بقیہ اسمار بھی ہندوستان ہی کے ہین، ایسی حالت مین ہندو مسلمانون کے مسلّمہ اصول تقسیم حقوق تہائی فیصدی سے زیادہ قبضہ تو مسلمانون کا اس زبان پر نہین، پھر کیا یہ ظلم نہین کہ اس سے بھی دستبردار ہونے پر ہم کو مجبور کیا جاتا ہے،

سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ

گذر چکا ہے کہ ہندوستان کے ہر صوبہ مین الگ الگ بولی تھی مسلمان سب سے پہلے سندھ مین پہنچے ہین اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہین، اس کا "ہیولیٰ" اسی وادی سندھ مین تیار ہوا ہوگا، عربی و فارسی بولنے والے مسلمان تاجر عراق، بندر ابلہ، سیراف اور بصرہ سے نکل کر سندھ کے بندرون سے گذر کر گجرات ہو کر بحر ہند کے کنارے کنارے سفر کرتے تھے، آخر پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ساتوین صدی عیسوی مین عرب مسلمانون نے سندھ پر قبضہ کر لیا، یہ اسلامی لشکر شیراز اور عراق سے مرتب ہو کر آیا تھا جسکے یہ معنی ہین کہ اس لشکر کے لوگ فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کے بعد جو سوداگر اور تاجر یہان آکر بود و باش اختیار کرنے لگے تھے وہ بھی عربی و فارسی بولتے تھے، جہازرانون کی زبان بھی عربی و فارسی سے مرکب تھی، خود سندھیون کی آمد و رفت بھی عراق مین لگی رہتی تھی، خصوصاً جب ۱۳۲ھ مین خلافت کا مرکز شام سے عراق کو منتقل ہو گیا، اور سندھ کے پنڈتون نے بغداد جا کر اپنی زبان سے عربی مین کتابون کے ترجمون مین مدد دینے اور وہان کے مختلف علمی و طبی منصبون پر سرفراز ہونے لگے، اس زمانہ مین عربی مین ہندی کے بہت سے اصطلاحی لفظ اور دواؤن اور خوشبوؤن کے نام داخل ہوئے، مثلاً بیڑہ جس کی عربی شکل بارجہ ہے، پلنگ جس کی عربی صورت بلنجہ ہے جہاز کے خوابگاہ کے معنون مین عرب ملاحون نے اس کو استعمال کیا ہے، اسی طرح خوشبوؤن

مین صندل (چندن) کافور (کپور) قرنفل (کرن پھول) وغیرہ لفظ ہین' دواؤن مین سب سے عجیب نام مجھے "بہط" معلوم ہوتا ہے' جس کو خوارزمی نے جو سلطان محمود کا معاصر تھا' مفاتیح العلوم مین نقل کیا ہے' جو ہمارے "بھات" کی خرابی ہے' جو مریضون کی غذا تجویز کی گئی تھی' پھلون مین انبج (انب) آم اور لیمون ہین' جنکا ذکر سنہ ۳۰۳ھ مین مسعودی نے کیا ہے' سندھ اور ملتان مین مسلمانون کی ریاستین تین سو برس تک قائم رہین' اور آخر سلطان محمود المتوفی سنہ ۴۲۱ھ کے ہاتھون ان دونون ریاستون کا خاتمہ ہوا' ان ریاستون کا مذہبی تعلق بغداد اور مصر سے تھا اور خراسان' عراق' یمن' ایران اور مصر سے یہان آنے والے تاجرون اور مسافرون کی برابر آمد و رفت لگی رہتی تھی' اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ سندھ اور ملتان مین دیسی بولیون کے ساتھ عربی و فارسی کا میل جول بڑھتا رہے' اور ایک نئی مرکب بولی کا ہیولی تیار ہو' خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے پاس بعض ایسی شہادتین موجود ہین جن سے کچھ نہ کچھ اس خیال کی تائید ہوتی ہے' بزرگ بن شہریار ملاح جو سنہ ۳۰۰ھ مین بحر ہند کے سواحل سے گذرتا رہتا تھا' اُس نے اپنے بحری سفرنامہ مین جس کا نام عجائب الہند ہے کئی ہندی لفظ استعمال کئے ہین' وہ سنہ ۲۷۰ھ کا ایک قصہ ہم کو سناتا ہے' شہر الور واقع سندھ کے ایک ہندو راجہ نے منصورہ واقع سندھ کے مسلمان بادشاہ سے ایک ایسے مسلمان عالم کی درخواست کی جو اُس کو اُس کی زبان مین اسلام کی خوبیان بتا سکے' بادشاہ نے ایک ایسے عراقی عالم کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی بہت سی بولیان جانتا تھا' چنانچہ وہ گیا اور سب سے پہلے راجہ کی خدمت مین اپنا ہندی قصیدہ پیش کیا' اور پھر قرآن کا ترجمہ کیا' بغداد کا سیاح اصطخری سنہ ۳۴۰ھ مین سلطان محمود سے تقریباً ساٹھ برس پہلے سندھ اور ملتان آیا تھا' وہ کہتا ہے'

"منصورہ (یعنی موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اور ان کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے، اور مکران والون کی زبان فارسی اور مکرانی ہے"
(صفحہ ۶۷ طبع لائیڈن)

اس کے بعد بغداد کا دوسرا سیاح ابن حوقل بھی جسکی سندھ اور ملتان مین سیاحت کا زمانہ ۳۵۸ھ ہے یہی کہتا ہے کہ

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اور اُسکے اطراف مین عربی اور سندھی بولی جاتی ہے" (سفرنامہ ابن حوقل صفحہ ۲۳۲ لائیڈن)

اس کے چند سال کے بعد ۳۷۵ھ ۹۸۵ء مین بشاری مقدسی ملتان آیا، وہ لکھتا ہے،

"اور یہان فارسی زبان سمجھی جاتی ہے" (سفرنامہ بشاری صفحہ ۴۸۱ لائیڈن)

پھر دیبل یعنی ٹھٹھہ واقع سندھ کے حال مین کہتا ہے،

"دیبل (ٹھٹھہ) سمندر کے ساحل پر ہے اس کے چارون طرف سو گاؤن کے قریب ہین اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہین، سمندر کا پانی شہر کی دیوارون سے آکر ٹکراتا ہے، یہ سب سوداگر ہین، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے" (ایضاً صفحہ ۴۷۹)

ان معاصرانہ شہادتون کی بنا پر یہ ماننا پڑے گا کہ عربی و فارسی الفاظ کا میل جول ہندوستان کے جس حصہ مین پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، جس کی حد اُس زمانہ مین ملتان سے لیکر بھکر اور ٹھٹھہ کے سواحل تک پھیلی تھی، اس زمانہ مین ایران، ترکستان اور خراسان سے ہندوستان آنے کا راستہ براہ راست ملتان ہو کر تھا، چنانچہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستہ سے ہندوستان آیا ہے، اس کا اثر یہ تھا کہ ان ملکون سے علم و فن کے کامل اور شعر و ادب کے ماہر اسی راستہ سے آکر

ہندوستان کے جس پہلے شہر میں وہ داخل ہوتے تھے وہ ملتان تھا چنانچہ سلطان ناصرالدین قباچہ کے زمانہ تک جو سلطان التمش کا معاصر و حریف تھا، ملتان ہی اسلامی علوم و فنون کا مرکز اور اسلامی تعلیم کی درسگاہ تھا اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ مرکز نقل ملتان سے لاہور کو اور پھر لاہور سے دہلی کو منتقل ہو گیا،

اس تشریح سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی عربی و فارسی سب سے پہلے ہندوستان کی جس دیسی زبان سے مخلوط ہوئی، وہ سندھی اور ملتانی ہے، پھر پنجابی اور بعد ازیں دہلوی، سندھی پر اس اختلاط کی شہادت آج بھی اسی طرح نمایاں ہے چنانچہ ہماری اردو کی طرح سندھی بھی عربی و فارسی الفاظ سے اسی طرح گرانبار ہے، اور سب سے عجیب یہ کہ اس کا رسم الخط آج تک ٹھیٹھ عربی نسخ ہے، اور عربی کے بہت سے خالص الفاظ مستعمل ہیں، مثلاً پہاڑ کو جبل اور پیاز کو بصل کہتے ہیں،

سندھی، ملتانی اور پنجابی آپس میں بالکل ملتی جلتی ہیں تینوں میں بہت سے الفاظ کا اشتراک ہے تینوں میں عربی و فارسی لفظوں کا میل ہے صیغوں کے طریق میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے یہاں پر اس تاریخی غلط فہمی کا مٹانا ضرور ہے جس کے رو سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ بولیاں موجودہ اردو کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ موجودہ اردو ان ہی بولیوں کی ترقی یافتہ اور اصلاح شدہ شکل ہے یعنی جس کو ہم اردو کہتے ہیں اس کا آغاز ان ہی بولیوں میں عربی و فارسی کے میل سے ہوا اور آگے چل کر دار السلطنت دہلی کی بولی سے جس کو دہلوی کہتے ہیں مل کر معیاری زبان بن گئی، اور پھر دار السلطنت کی بولی معیاری زبان بن کر تمام صوبوں میں پھیل گئی علامہ بیرونی

المتوفی سنہ ۴۴۰ھ جس نے ہندوستان میں شاید ملتان اور سندھ میں رہ کر کتاب الہند کا مسالہ مہیا کیا ہے، اس نے اپنی اس کتاب میں جس لہجہ اور طرز ادا میں ہندی الفاظ لکھے ہیں ان سے ماہر ادب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ ملتانی اور سندھی شکل میں ہیں،

غزنوی دور میں بہر حال اب وہ زمانہ ہے جب غزنین میں آل سبکتگین کی حکومت قائم ہوئی اور سبکتگین اور اس کا نامور فرزند ہندوستان پر پے در پے حملے کرتے ہیں، ان حملہ آوروں کی مادری زبان ترکی مگر علمی و ادبی و سرکاری زبان فارسی تھی، سلطان محمود غزنوی المتوفی سنہ ۴۲۱ھ نے گو گجرات تک دھاوا کیا، مگر اس کی سلطنت بالآخر پنجاب و سندھ میں سمٹ کر رہ گئی جہاں تقریباً دو سو برس تک وہ قائم رہی، اس میل جول کا اثر یہ ہوا کہ ترکستان، ایران، اور کابل کے ہزاروں لاکھوں آدمی ہندوستان آکر بس گئے اور ہزاروں ہندوستانی ان ملکوں میں جا پہنچے، اور ہندی غلاموں اور کنیزوں کی گھر گھر فراوانی ہوئی[۱]، غزنویوں کی فوج میں بہت سے ہندو افسر اور سپاہی نوکر تھے اور وہ حدود سلطنت میں موقع بموقع بھیجے جاتے تھے،

سلطان محمود کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا جس کی تعلیم و تربیت کشمیر میں ہوئی تھی، اور اصفہان جا کر اس نے فارسی سیکھی تھی، سلطان مسعود کے زمانہ میں جو سنہ ۴۲۱ھ میں تخت پر بیٹھا تھا اس عہدہ پر ایک ہندو بیربل نام سرفراز تھا سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے، فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے، کالنجر کے راجہ انند نے سنہ ۴۱۳ھ میں ہندی میں بادشاہ کے لئے مدحیہ شعر لکھے،

۱؎ علاوہ دوسری تاریخوں کے دیکھو قابوس نامہ "بندہ و خریدن"

"اشندا زبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آن را بفضلاے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ، ہمگی تحسین و آفرین کردند۔" (فرشتہ)

اس اختلاط اور میل جول کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ اہل ولایت کی زبانون پر ہندی الفاظ اور ہندون کی زبانون پر فارسی الفاظ چڑھ جائین، چنانچہ یہی سبب ہے کہ غزنوی عہد کے بعض اُن شعراء کی زبانون سے بھی ہندی الفاظ ادا ہوئے ہین جنھون نے ہندوستان کا منھ تک بھی نہین دیکھا تھا۔ حکیم سنائی غزنوی (۴۶۴ھ تا ۵۴۵ھ) جو بہرام شاہ غزنوی کے معاصر تھے وہ اپنے ایک قصیدہ مین زبان کے اختلاف کو غیر اہم بتا کر فرماتے ہین[1]،

تو بے مرگ ہرگز بجائے نہ یابی ۔۔۔ ز تنکاب لغتہاے اینی و آنی
اسامی درین عالم است ارنہ حاشا ۔۔۔ چہ آب و چہ نان و چہ میدہ چہ پانی

عہد غزنوی کا مشہور شاعر مسعود سعد سلمان جو خاص لاہور مین پیدا ہوا تھا اس کی نسبت عوفی اور امیر خسرو نے لکھا ہے کہ وہ عربی و فارسی کے علاوہ ہندی کا بھی شاعر تھا، اور اس زبان مین اپنا ایک دیوان بھی یادگار چھوڑا۔ اس کے دیوان مین ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے،

برآمد از پس دیوار حصن[2] مارا مار

ان شعرون مین پانی اور مارا مار اور شاید[3] میدہ ہندی لفظ ہین جو اہل ولایت کی زبانون

۱؎ کلیات سنائی بمبئی صفحہ ۹۶ ۲؎ بحوالہ پنجاب میں اردو ۳؎ لفظ میدہ فارسی لغات میں گو ملتا ہو (مؤید الفضلاء) مگر خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندی ہے کیونکہ یہاں شاعر نے آب و پانی کو جس طرح بالمقابل استعمال کیا ہے ایسے ہی نان اور میدہ کو بالمقابل شاید رکھا ہے بطور لف و نشر غیر مرتب۔

پر چڑھ گئے تھے، اب ساتوین صدی ہجری کے آغاز مین غوریون کا دور شروع ہوا، جھنون نے بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر اصل ہندوستان پر قبضہ کیا اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا، اب اس مشترکہ زبان کا قدم اور آگے بڑھا، ان کی حکومت پشاور سے گجرات اور بنگال تک قائم ہو گئی اور اس پورے ملک مین جہان کہین کبھی بول چال کی ایک زبان نہ تھی ایک مشترک زبان ہند کا ہیولیٰ تیار ہو گیا، قاضی سراج منہاج جو ۶۲۴ھ مین سندھ اور ملتان کی راہ سے ہندوستان آئے تھے اپنی تاریخ مین کوچ بہار اور اس کے قرب و نواح کے فتوحات کے سلسلہ مین لکھتے ہین:

"داین راز زبانِ دیگر است میان لغت ہند و تبت" (صفحہ ۱۵۲ کلکتہ)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کی ایک زبان پنجاب سے لیکر بنگال تک پیدا ہو چکی تھی، جس کے برخلاف وہان کی زبان ہندوستانی زبان اور تبت کی زبان کے بیچ مین تھی، یہین خلیج فارس اور بحر ہند کے ذکر مین وہ لکھتے ہین:-

"آب بنگمتی گویند چون بدریاے ہندوستان در آید او را بلغت ہندوی سمند گویند" (صفحہ ۱۵۲ طبقات ناصری سراج منہاج کلکتہ)

دہلی کے سب سے پہلے سلطان "قطب الدین ایبک" کو رعایا نے اس کے جود و کرم کے صلہ مین "لکھ بخش" کا خطاب دیا تھا، (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳) یعنی "لاکھون کا دینے والا" اس کے زمانہ کی تعریف مین اہل ہند "کال قطب الدین" کہتے تھے "وکال زمانہ را گویند" (فرشتہ جلد اول صفحہ ۶۳ نول کشور) اس عہد کے سکّون پر بادشاہ کے نام کے ساتھ "شری امیر" لکھا ملتا ہے، شری کا لفظ آج بھی ہندوؤن مین شری مہاراج کی ترکیب مین مستعمل ہے، مگر اُس وقت کی اس ترکیب

"شمری امیر" پر ذرا غور کیجئے،

ملتان سے دہلی

شمس الدین التمش نے اپنے خواجہ تاش لیکن حریف ناصر الدین قباچہ کو سنہ ۶۱۵ھ میں شکست دے کر ملتان اور سندھ کو بھی دہلی سے ملا لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان اطراف کے بہت سے تاجر اور سوداگر دہلی آ گئے، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ "ملتانیان" کا لفظ اس زمانہ میں "سوداگران پارچہ" کے ہم معنی ہو گیا تھا[1] اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ملتان اور لاہور اور دہلی کی مشترکہ خدمات اس متحدہ زبان کے بنانے میں شامل ہو گئی تھیں، اس کی سند میں ایک ایسی بزرگ ہستی کا نام لینا ہے جن کی پیدائش اور تعلیم و تربیت تو ملتان اور سندھ میں ہوئی، مگر روحانی اکتساب فیض دہلی میں فرمایا، اور آخری سکونت اور دائمی آسودگی لاہور کی مملکت میں اختیار فرمائی یعنی حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ،

ہندوستان کے روحانی فاتح

جن لوگوں کو ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہاں کی روحانی تاریخ کے مطالعہ کا موقع ملا ہے وہ یہ تسلیم کرینگے کہ ہندوستان میں غزنین اور غور کے سلاطین، ملکی فتوحات کے لئے جہاں جہاں بڑھتے تھے ان سے پہلے یہ روحانی سلاطین اپنے روحانی فتوحات کے لئے آگے بڑھتے جاتے تھے، اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کے ملک کو غزنین اور غور کے بادشاہوں نے فتح کیا ہے تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہو کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا، یہ ایک خود مستقل موضوع ہے اور کبھی فرصت سے یہ بڑی داستان بھی سننے کے لائق ہے،

---

[1] دیکھو تاریخ فیروز شاہی،

یہ روحانی فاتح عوام سے ملتے ہین

ہندوستان مین کسی ایک متحدہ زبان کی ضرورت جتنی سلطنت کو محسوس ہوتی تھی، اس سے کہین زیادہ عوام کو اور ان سے زیادہ صوفیون کو جو ہر بولی کے انسانون تک پہنچنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اب تک اُردو کی تاریخ مین اکبر اور شاہجہان اور ان کے مینا بازار اور اردوئے معلّی کو اہمیت دی گئی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے کہین زیادہ صوفیہ کو حاصل ہے، جن کو ہندوستان کے عوام کی زبان کو اختیار کرنے مین نہ سلطنت کے رعب و داب کا خیال مانع آسکتا تھا، اور نہ علم ظاہر کے جبّہ و دستار کے وقار کا، بلکہ عوام کی اصلاح اور حق کی تبلیغ کی خاطر ان کو ہندوستان کے عوام کی دیسی زبان کو قبول کرنے مین کوئی تامل نہ تھا، ٹھیک جس طرح مسلمانون سے پہلے ہندوستان کے عوام کی زبان کو بودھ نے اپنے دھرم کے پرچار کے خاطر اختیار کیا، اور اسی مین اپنا اپدیش دیا، اور جس طرح مسلمانون کے بعد عیسائی پادریون اور مشنریون نے یہان کے عوام کی بولیون کو بے تامل استعمال کیا، اسی طرح ان صوفیہ نے اُس وقت کے عوام کی دیسی زبان کو بولنے مین پیش دستی کی،

حضرات صوفیہ اور یہ نئی زبان

اس وقت تک اردو کے جتنے قدیم فقرے مل سکتے ہین، وہ عموماً صوفیون کے ملفوظات ہین، اور اردو کی پرانی تصنیفین خواہ وہ دکھنی ہون یا گجراتی وہ سب صوفیون کی لکھی ہین، جس طرح سنہ ۵۷ء کے انقلاب سے کچھ پہلے دہلی کے علم و عرفان کے مشہور خانوادہ نے وقت کی اردو زبان کو جس کو اس وقت ہندی زبان کہتے تھے اپنے اصلاحی رسالون اور تصنیفون اور قرآن و احادیث کے ترجمون کے لئے فارسی کے بجائے پسند کیا، اور عوام تک پہنچنے کی خاطر اردو ہی کو جس مین اس وقت تک شمالی ہند مین لکھنا پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا

تھا، بے تکلف قبول کیا، اور اصلاحِ دین اور ردِ بدعات کا بڑا ذخیرہ اردو مین جمع کردیا جس نے رفتہ رفتہ اہلِ علم سے اس نئی زبان مین لکھنے پڑھنے کا حجاب اٹھا دیا،

خواجہ فرید شکر گنج ملتانی

خانوادۂ چشت کے فردِ فرید شکرستانِ معرفت کے مشہور گنج شکر سے کون واقف نہین حضرت خواجہ فرید گنج شکر کا خاندان اگرچہ کابل کا تھا، مگر شہاب الدین غوری کے زمانہ مین ملتان آکر بس گیا تھا، اور خواجہ کی ولایت یہین قصبہ کھتی وال مضافات ملتان مین سنہ ۵۸۴ھ مین ہوئی، خواجہ کا نشو ونما اور اُن کی تعلیم و تربیت ملتان مین ہوئی، اٹھارہ برس کی عمر تھی، ملتان کے مدرسہ مین مولنا منہاج الدین ترمذی سے فقہ مین کتاب نافع کا درس لیتے تھے، کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا گذر ہوا، اور ایک ہی نظر کیمیا اثر نے ان کو کہان سے کہان پہنچا دیا، بہرحال ملتان سے نکل کر قندھار اور دوسرے ممالک سے اخذِ فیض کے بعد اپنے وطن واپس آئے، اور بعد کو اپنے پیر کے حضور مین دلی آئے، اور یہان سے پنجاب کے شہر اجودھن مین جا کر اقامت اختیار کی، اور وہین سنہ ۶۶۴ھ مین آسودۂ خاک ہوئے،

اس وقت تک اس زبان کی ابتدائی تاریخ کا جہان تک پتہ لگ سکا ہے، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیرین دہن جس کے منہ سے مصری کی یہ ڈلیان پہلے نکلین خواجہ فرید گنج شکر ہین، چنانچہ ملفوظات اور تصوف کی کتابون مین موصوف کے چند فقرے ملتے ہین،

۱- پہلا فقرہ وہ مکالمہ ہے جو حضرت خواجہ اور ان کے مرید شیخ جمال الدین ہانسوی کی بیوہ کے درمیان ہوا، خواجہ نے شیخ جمال الدین کے خوردسال بچہ برہان الدین کو اُن کے باپ کی وفات کے بعد اپنے حلقۂ بیعت مین لے لیا، اس پر ان کی والدہ نے کہا "خوجا برہان الدین

بالا ہے" خواجہ نے فرمایا" پونون کا چاند بالا ہوتا ہے[1]" یہ بالا وہی لفظ ہے جو لڑکے کے بالے اور بچہ بالا کے ساتھ آج بھی بولا جاتا ہے،

اب تک صوفیانہ ذکر اور مراقبہ مین عربی یا فارسی کے فقرے استعمال ہوتے تھے، خواجہ پہلے شخص ہین جنھون نے ان کو ہندوستانی زبان مین ادا فرمایا، ہمارے کتبخانہ مین اوراد و تصوف کی دو قلمی کتابین ہین جنمین حضرت کے یہ فقرے مذکور ہین، فرمایا[2]:-

۲- در راستا بگوئی "اوہی ہی" و در چپا بگوئی "یہی ہی"، در دل بگوئی "اینہی ہی"۔

دیگر بزبانِ ہندی،

۳- در راستا "ہمہ تون" و در چپا "ہی "تون"، و در دل "ہمہ تون"

۴- دیگر گوید از طرفِ دل "ہون تون" و طرفِ آسمان "تون ہی تون" ہون کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ یہ عربی فقرہ انا انت کا ترجمہ ہے،

تصوف کے اذکار کے ایک اور رسالہ مین جسکا نام "جواہر خمسہ" ہے، اور جسکا ۱۰۹۷ھ کا لکھا ہوا نسخہ کتب خانہ دار المصنفین مین ہے یہ مذکور ہے،

بندگی حضرت قطب الاقطاب حضرت شیخ فرید شکر گنج قدس اللہ سرہٗ ذکر بزبان ہندی وضع فرمودہ اند در عمل آوردہ اند، در باب دین اندا اہنو ہنہ تون اہو نہہ تون، اہنین تون سوے آسمان نگریستہ بزبان گوید اہو نہہ، تون، . . . . . . بازروے سوی زمین کردہ بہمان طریق این بزبان گوید اہو نہہ تون . . . . . بعدہ نظر را بر واردو بر خود نگاہ

[1] سیر الاولیا، ریگو الڈ پنجاب میں اردو، [2] رسالہ شیخ بہار الدین بن ابراہیم عطار القادری، قلمی دار المصنفین،

پیا پے سر کرت یا ہفت کرت، ایہین تون!!

شیخ اپنے ایک دوست کو بھیّا کہا کرتے تھے[1] آپ سے پوچھا گیا کہ ذہن کا مقام کہاں ہے تو فرمایا "بیچ سر کے"[2]

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بابا فرید اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے تھے، ان کے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے سبب پوچھا تو بابا نے ہندی زبان میں جواب دیا "آنکھ آئی ہے" شیخ نے فرمایا اگر آئی ہے "چرا بستہ اید"

سرسہ کے مقام پر بابا فرید ایک بزرگ کے مزار پر جایا کرتے تھے کچھ لوگ ان کے راستہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو ناخوش ہوئے اور ہندی میں فرمایا "سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"[3]

ق

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں اردو کا ایک کتب خانہ ہے۔ اس میں چند پریشان اوراق کا ایک پرانا مجموعہ ہے جس میں کسی صاحب نے حضرت بابا فرید کے کچھ فارسی اقوال لکھے ہیں اور ساتھ ہی ذیل کی ایک نظم بھی ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے — خیز دران وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بگوید ترا — سپ چہ خفتی کہ ابھی رات ہے
با دم خود ہمدم و ہشیار باش — صحبت اغیار بری بات ہے
با تن تنہا چہ روی زیر زمیں — نیک عمل کن کہ وہی سات ہے

[1] تاریخ اردوئے قدیم بحوالہ اسرار الاولیا صفحہ ۳ [2] ایضاً بحوالہ جواہر فریدی صفحہ ۲۱۰ [3] پنجاب میں اردو بحوالہ جواہر فریدی

پند شکر گنج بدل وجاں شنو ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

اس نظم کو اردو کے ایک مشہور مؤلف نے حضرت شکر گنج کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ میرے خیال میں یہ حضرت کے فارسی اقوال کے جامع کی نظم ہے، نہ کہ خود حضرت کی ہے، اخیر شعر میں شکر گنج کے توصیفی لقب کو تخلص سمجھنا تعجب انگیز ہے، ظاہر ہے کہ خود حضرت اپنے آپ کو شکر گنج نہیں کہتے تھے اتنا صحیح ہے کہ حضرت کی زبانِ مبارک سے بعض ہندی دوہرے ادا ہوئے ہیں جنمیں سب سے مقدم اور مستند وہ ہے جو میر خورد دہلوی نے سیر الاولیا میں نقل کیا ہے،

"ایں دوہرہ کہ بزبان مبارک حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین گذشتہ است مناسب این معنی است"

گنت نہوئیں کارری ناکان ست منائے
بس کند سے مدھن گرہو رین نہائے

بہرحال اس نظم سے قطع نظر کرکے اوپر کے فقروں میں "کا" اور "کے" اضافت کی علامت "ہوتا ہے" اور "آئی ہے" فعل اور "ہوں" "توں" "اوہی" "یہی" ضمیر اور "انہی" اور "ہوان" اور "بیچ" ظرف اور "بالا" "چاند" "آنکھ" "بھیا" اسماء اس میں موجود ہیں،

حضرت نظام الدین دہلوی	خواجہ فرید شکر گنج کے مرید حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء المتوفی ۷۲۵ھ کے ملفوظات فوائد الفواد میں جسمیں حضرت کے ۷۲۲ھ تک کے ملفوظات امیر خسرو کے دوست امیر حسن دہلوی نے جمع کئے ہیں حسب ذیل ہندوی الفاظ

ان کی زبانِ مبارک سے بے تکلف ادا ہوئے ہیں، پیاز (صفحہ ۹) لنگوٹہ (صفحہ ۹) کھٹ (یعنی کھاٹ صفحہ ۵۱) کندوری (دعوت صفحہ ۵۵) چھجہ (صفحہ ۶۸) لنگھن (فاقہ ۸۶) دھاڑی (یعنی ذکر صفحہ ۱۲۸) لَٹ (صفحہ ۱۷۳) حضرت سلطان الاولیا کی زبان سے یہ شعر ادا ہوا ہے،

لنگھت گر کند ترا فربہ سیر خوردن ترا لنگھن بہ

حضرت سلطان الاولیاؒ نے شیخ احمد نہروالی کے ذکر میں فرمایا کہ شیخ احمد بہت خوش آواز تھے "ہندویہا خوش گفتہ" وہندوی ہم گفتے یعنی ہندی گایا کرتے تھے، جامع مسجد اجمیر کے امام، فقیہ مادھو (ذرا ایک ہندی عالم کے اس عالمانہ نام پر نظر رہے) نے ایک دفعہ اُن کا ہندی گانا سنکر فرمایا چنین آوازے کہ تو داری دریغ باشد کہ در سرود ہندی خرج کنی، شیخ احمد نے اسی وقت سے قرآن یاد کرنا شروع کردیا (صفحہ ۲۷ مطبع اودھ اخبار)

شیخ نصیرالدین اودھی — شیخ نظام الدین اولیا کے مرید شیخ نصیرالدین اودھی چراغ دہلی (المتوفی سنہ ۷۵۲ھ) نے جب اپنے ایک ساتھی شیخ اخی سراج کو بنگالہ رخصت کیا تو انھوں نے عرض کی کہ اس مملکت پر تو شیخ علاء الدین تُل سر فراز ہیں، فرمایا "تم اوپر تُل تلے"۔

خواجہ بندہ نواز دکنی — شیخ نصیرالدین دہلوی کے دوسرے ممتاز مرید حضرت خواجہ بندہ نواز ہیں، جو سنہ ۸۱۵ھ میں دلی سے بہمنیوں کی سلطنت گلبرگہ میں آگئے، و ہیں سنہ ۸۲۵ھ میں وفات پائی اُن کا ایک فقرہ اُن کے ایک مرید نے یہ نقل کیا ہے "بھوکون موسے سون خدا کچھ اپڑتا ہے خدا لوں پڑنے کی استعداد ہے"۔ اُنکا پورا ہندوی رسالہ معرفت الی حقیقین چھپ چکا ہے۔

ل۱ فوائد الفوائد صفحہ ۸۶ ل۲ تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۰۰ نولکشور ل۳ تاریخ زبان اردو قدیم نولکشور صفحہ ۲۳ بحوالہ شق نامہ عبداللہ بن عبدالرحمن چشتی

ان بزرگونکے ان مسلسل فقرون کو سنکر اب اس مین شک کی کیا گنجایش رہتی ہے کہ
کہ اس زبان کی عمر جتنی سمجھی جاتی ہے، اس سے کتنی زیادہ ہے، یہ حقیقت مین ہندوستان ہی کی
زبان تھی جس کو ان بزرگون نے قبول کی نظر سے دیکھا، اور محبت کی شکر مین گھولا،

خلجی و تغلق دور مین

یہ خلجی اور تغلق سلاطین کا دور ہے، ان بادشاہون کے زمانہ کی دو یادگار تاریخین
ہمارے سامنے ہین، تاریخ فیروزشاہی ضیاے برنی، اور تاریخ فیروزشاہی سراج عفیف، ان
دونون تاریخون مین جنمین سے پہلی دہلی مین چھٹی صدی کے آخر اور ساتوین صدی ہجری کے
اوائل مین اور دوسری ساتوین صدی کے بیچ مین تصنیف ہوئی ہے، بہت سے ہندی
الفاظ اور مصطلحات ملتے ہین، اور جو آج تک اس مشترکہ ہندوستانی زبان کا سرمایہ ہین،

بچیرہ لکھ (لاکھ) کہار (صفحہ ۱۸۶) ٹھگ (صفحہ ۱۸۹) لونڈی (صفحہ ۱۹۲) ٹیکہ ہندوان (صفحہ ۲۲۰)
منڈل (صفحہ ۲۱۶) گھٹی (صفحہ ۲۲۰) بہی پٹواریان (صفحہ ۲۸۸) ڈھولک (صفحہ ۴۵۷) چبوترہ (صفحہ ۳۲۰)
منڈھ (صفحہ ۳۴۴) بسوہ، چرائی، ڈیہہ قصبات (صفحہ ۲۸۸) منڈہ، منڈی غلہ (صفحہ ۳۰۴) ماش، موٹھ
(صفحہ ۳۵۰) منڈلی (صفحہ ۳۰۴) بھین (صفحہ ۳۱۰) ریوڑی (صفحہ ۳۱۶) تھانہ (صفحہ ۳۳۰) دھاوگان
(جمع فارسی دھاوا بمعنی ڈاک دوڑیہ (صفحہ ۳۳۱) موڑہ (موڑھا؟ صفحہ ۳۷۳) چودھری (صفحہ ۲۸۸)
بی بی (صفحہ ۳۷۳) بھٹی (صفحہ ۳۱۶) (تاریخ فیروزشاہی ضیا برنی) بی بی (صفحہ ۳۹) لک (لاکھ
صفحہ ۴۸) لکھوک (جمع لاکھ) (صفحہ ۳۳۱) چونہ پز (چونہ پکانے والا) راج (معمار) سوندھار (سونار؟
صفحہ ۳۳۱) بھیڑ، چھتر (صفحہ ۱۰۸) کنگرہ (کٹرہ؟ صفحہ ۳۷۱) چودھریان (صفحہ ۳۷) لت (لات صفحہ ۳۷)
بھرکر (صفحہ ۳۹۳) گھڑیال (صفحہ ۳۴) گھڑیال خانہ (صفحہ ۱۷۱) درخت سینبھل (صفحہ ۳۱۱) چونہ (صفحہ ۳۱۰)

(سراج عفیف)

تاتارخان اعظم نے عورتوں کی پردہ دار سواری کے لئے گردو نہا راست کنانیدہ بود کہ اثرا بزبانِ ہندی "بہرکر" گویند" (۳۹۳ سراج عفیف) محمد تغلق کی زبان سے ایک دفعہ ایک ہندی کا فقرہ نکلتا ہے، مولانا عماد بر سرِ دربار اس کے جواب میں کہتے ہیں "گہ مجوز" (اخبار الاخیار صفحہ ۱۰۱) فیروز شاہ کے عہد میں سکندر حاکم بنگال ایک افسر ملک قبول سے پوچھتا ہے "چہ نام داری" ملک قبول بزبانِ ہندی گفت "تورا باند" اب اس کو "تورا بندھو" سمجھئے یا "تورا بندہ" (شمس سراج عفیف صفحہ ۱۶۰)

سلطان محمد تغلق نے جب سندھ کے حملہ میں جان دی اور سلطان فیروز شاہ نے ناکام حملہ کے بعد سندھ چھوڑ کر گجرات کا رخ کیا تو سندھیوں نے کہا،

برکت شیخ پتھیا ایک موا ایک نہا" (شمس سراج عفیف صفحہ ۲۳۱)

امیر خسرو کا عہد اب وہ زمانہ ہے جب کل ہندوستان ایک دہلی کے علم کے نیچے جمع ہوگیا تھا، اور ہندوستان کے اندر ایک متحدہ زبان کا پیکر تیار تھا، جس نے عوام کے بازاروں سے اہلِ علم کے حلقوں تک رسائی حاصل کر لی اور امیر خسرو المتوفی ۷۲۵ھ جیسے ہمہ گیر سلطانِ ادب نے اس کی سرپرستی کی اور اس کو عربی و فارسی منظومات کے پہلو بہ پہلو جگہ دی، امیر کی فارسی مثنویوں اور تاریخی تصنیفوں میں بے شمار ہندی الفاظ استعمال پائے ہیں، ان کی ہندی نظمیں جو پہیلیوں اور مکرنیوں کی صورت میں ہیں، بہت مشہور ہیں، گو اس وقت ہمارے پاس ان کی ان ہندی منظومات کا کوئی مستند مجموعہ نہیں ہے، تاہم انھوں نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے

خاتمہ مین جو طویل فارسی نثر لکھی ہے اس مین اپنی ہندی نظم پر خود فخر کیا ہے، فرماتے ہین،

پیش ازین از بادشاہان سخن کسے را سہ دیوان نہ بود، مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم، مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست اما آن سہ دیوان او عبارت است از عربی و فارسی و ہندوی اما در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ جز من کہ درین کار قسام عادلم، ع

قسمت چو چنین بود چہ تدبیر کنم[1]

امیر خسرو کی اس عبارت کا یہ مطلب نہین کہ انھون نے بھی مسعود سعد کی طرح عربی و فارسی اور ہندی کے تین الگ الگ دیوان تیار کئے تھے، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہین کہ مسعود سعد نے تینون زبانون مین الگ الگ تین مستقل دیوان تیار کئے تھے، اور مین نے ایک زبان فارسی مین ہندی اور عربی کو ملا کر ایک "سخن" کا سراپا تیار کیا،

امیر کو اپنے ہندی کلام پر جو ناز تھا وہ ان کے اس شعر سے نمایان ہے جس کو انھون نے اپنی اسی کتاب کے خاتمہ مین لکھا ہے:

چو من طوطی ہندم از راست پرسی　　ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

اسی خاتمہ مین ایہام کی ایک نئی صفت پیدا کرنے پر فخر کیا ہے،

"باز ایہامے دیگر بربست کردہ ام کہ یک طرف ہمہ ہندوی خیزد می افتد، و جانب دیگر پارسی می خیزد"

آہی آئی ہمان پیاری آہی　　ماری ماری[2] برائی موری ماہیا

[1] خاتمہ غرۃ الکمال امیر خسرو دہلی دار المصنفین، [2] اس شعر کو مین پوری طرح سمجھ نہین سکا،

امیر نے اپنی مثنوی نہ سپہر میں ہندوستان کی ایک فضیلت یہ بیان کی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر ملک کی زبان بول سکتے ہیں، مگر بیرونی لوگ یہاں کی زبان نہیں بول سکتے کہتے ہیں،

هست دوم آنکه ز هند آدمیان / جمله بگویند زبان ها بیان

لیک از اقصای دگر هر کسے / گفت نیارد سخن هند بسے

هست خطا و مغل و ترک و عرب / در سخن هندوی ما دوخته لب

غرض ہر جگہ اپنی زبان کو ہندوی کہتے ہیں، اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ہندوی زبان اس وقت کے ہندوستان کے بول چال میں تھی،

شیخ شرف الدین منیری بہاری

حضرت شیخ شرف الدین احمد منیری (المتوفی ۷۸۲ھ) جن کا وطن اور مسکن بہار ہے، اور تعلیم و تربیت بنگال میں پائی تھی، اور بیعت دلی جاکر حاصل کی تھی، ان کے بہت سے ہندوی دوہے ہیں، جنہیں بعض بیماریوں کی مجرب دوا بتائی گئی ہیں، مثلاً

لودھ پھٹکری مردا سنگ / ہلدی زیرا ایک ایک ٹنک

افیون چنہ بھر مرچیں چار / اردو بھر موتھا اس میں ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے / نینا پیرا پل میں ہرے

(شفاء الامراض حکیم محمدی دیسنوی مرحوم قلمی دیسنہ)

حضرت شیخ کے ملفوظات کا مجموعہ معدن المعانی کے نام سے ان کی زندگی ہی میں

زین بدر عربی نے فارسی مین لکھ کر نذر گذرانی تھی، اس مین ایک موقع پر اردو کے دو فقرے استعمال ہوئے ہین، خواجہ جلال الدین حافظ ملتانی نے عرض کی،

"بزبان ہندوی نیکو گفتہ است ہر کہ گفتہ است" بات بھلی پر سانہ کرے"

حضرت شیخ نے اس کی تائید مین فرمایا،

بعد ازان بندگی مخدوم عظمہ اللہ بزبان مبارک راند" دیس بھلا پہ دور" (معدن المعانی مطبوعہ شرف الاخبار بہار ۱۸۸۴ع / ۱۳۰۱ھ جلد اول صفحہ ۲۰۳)

ہمارے وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) کے کتب خانہ اصلاح مین ایک فالنامہ کے دو صفحے پرانے کاغذ کے ہین، جنمین اسی زبان مین مختلف اعداد کے جوابات بتائے گئے ہین، اُس کے سرنامہ پر اس فالنامہ کی نسبت حضرت مخدوم کی طرف کی گئی ہے، اس مین کل ستائیس فقرے ہین، جنمین سے بعض یہ ہین،

۱۱۱ جو من کی منسی کیا ہوئی سو ہوئی،

۱۱۳ ناہین کچھ کرو نصیب لاگی بات ہے،

۱۳۱ ابہین، ابھین ناہین،

۳۱۱ ابھین ناہین، سوت رہو جائے،

۳۳۱ راج پاٹ اچل کے دیا تکون،

۲۳۲ آگے برے دن گئے اب سکھ پاوہ گے،

۳۳۲ ابھین ناہین آگو ہوئیگا،

۳۱۱ تورے دن کے اب سکھ سو جتانا ہین،

مخدوم اشرف کچھوچھوی اودھی

اسی طرح حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی (المتوفی ۷۹۵ھ) ہین، انکا بڑا حصہ بنگال، بہار اور اودھ مین بسر ہوا اور کچھوچھہ ضلع فیض آباد مین مدفون ہوئے، ان کے ملفوظات کے مشہور مجموعۂ لطائف اشرفی مین الفاظ دعائین اور منتر اردو نما ہندی مین ملتے ہین، اس کے مولف نظام حاجی غریب یمنی ۸۰۵ھ مین ان کے مرید ہوئے تھے، اس مجموعہ مین ایک حکایت ہے کہ سید اشرف جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ رودلی کے پاس سے گذرے، اسی کے قریب ایک گاؤن مین مولانا کریم الدین دانشمند رہتے تھے، سید موصوف ان سے ملنے کے لئے چلے، کسی نے مولانا کو جاکر اطلاع دی، انھون نے یہ خبر سنکر خاکساری کی راہ سے فرمایا، "مثل ہندوی فرمودند چھیری کے منہ کھنڈا اسماست"[1] چھیری مشرقی اضلاع کے دیہاتون مین بکری کو کہتے ہین، اور کھنڈا چاولون کے چورا کو کہتے ہین، مطلب یہ ہوا کہ بکری کو کھنڈا کھانے کو ملے یہ اس کی عزت افزائی ہے، سید اشرف کی زبانی اسمین سانپ اور بچھو کے کاٹنے کے کئی منتر لکھے گئے ہین، جو نسخ کتابت کی غلطیون سے مسخ ہو گئے ہین، بچھو کے کاٹنے کا ایک منتر صاف ہے، "دھر بند ہون، دھر کند ہون، سدا لاکھ سیاہ بند ہون اپنے بھگت گرو کے سکت، ہون یکہ جوگین (آگے) چڑھے، دوسرا اینکی لکڑی، پانی پرآئی، انکس بند ہون زبس پرائی، مری یکہ جوگین (آگے) جاسے، دوسرا کالی کونی جنگل کے کاجل دھوکا ناتھ پانچ چیز الخ...."[2]

۱؎ لطائف اشرفی صفحہ ۳۸۴ نصرت المطابع دہلی، ۲؎ ایضاً صفحہ ۳۹۲،

شیخ علاء الدین بنگالی

شیخ علاء الدین لاہوری پنڈوی بنگالی المتوفی سنہ ۸۰۰ھ اور شیخ نور الحق پنڈوی بنگالی المتوفی سنہ ۸۱۳ھ باپ بیٹے تھے، یہ تھے تو لاہوری مگر سکونت بنگال جاکر اختیار کی شیخ نور الحق اپنے مکتوبات مین ایک فارسی شعر لکھکر اُس کے ہم معنی ہندی شعر لکھتے ہین،

ہمہ شب بزاریم شد کہ صبا نداد بوسے   ندمید صبح بختم چہ گنہ نہم صبا را

رین سب آئی سویا سیج، نہ دھا تھا نون   پیو نپو چھے پاتری مجھ سہاگن نانون

(صفہ ۷۔ قلمی دار المصنفین)

اسی زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ الاسلام سعد اللہ لکھنوی اور ان کے بیٹے شیخ امین الدین لکھنوی المتوفی سنہ ۸۲۹ھ ہین، یہ دونون ہندی کے شاعر تھے، ان کے مکتوبات مین ہندی الفاظ، دوہے اور ہنڈولے ملتے ہین، لکھتے ہین،

"در شب روز تحریر "جگری" بخیال گذشتہ نبشتہ شدہ است ذوق خواہند گرفت"

جگری مذکور اینست، ہندی،

کون پراجت دیا کیستون   شہ کل بانہہ نہ دَئی کر سوتون

عقدہ

مجھ برہا، رین جگاوے   ہور مرتین چال بتاوے

جی ہون پنہیون بھول کندھیا   جو بھنج تن جر کانٹ کنیاسے

عقدہ

جی ہون سعد پائے جیسنون — سکھ دکھ پی کے ہات کھیتن
این الدین باندھی جو دی پیو — شہ کے درشن وارے جیو

مخدوم عبدالحق ردولوی

مخدوم شیخ احمد عبدالحق ردولوی المتوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات میں ہمیں سے فقرے ملتے ہیں شیخ نے کچھ زمانہ سنام (پنجاب) میں بسر کیا تھا، فرماتے ہیں کہ وہاں ایک نے ادہ بی بی رہتی تھیں جو بڑی عبادت گذار تھیں، رات کو تہجد میں شیخ سے پہلے اٹھتیں اور

"این فقیر را بلطف می فرمودند بزبان ہندی، بیٹا احمد آب گرم موجود است نباید کہ از آب سرد وضو کنی"۔ (۱۹)

شیخ کا ایک مرید شب و روز یہ چیختا تھا،

آہ شیخ احمد ماریو ماریو۔ (صفحہ ۱۰۰)

شیخ نے ایک دفعہ یہ ہندی دوہرہ زبان مبارک سے ادا فرمایا،

کنوا ہو تو پاٹون، سمندر کہ پاٹن جائے — بارا ہو بر جون جھیل کر برجن جائے

شیخ احمد عبدالحق ردولوی کے ملفوظات، شیخ عبدالقدوس گنگوہی المتوفی ۹۴۵ھ نے جمع کئے ہیں، ردولی اور گنگوہ ہمارے صوبہ کے ابتدائی و انتہائی کنارے کے جاسکتے ہیں اس مجموعہ میں حسب ذیل الفاظ نہایت بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ بندولہ (صفحہ ۳۷) پلنگ (صفحہ ۳۸) اور اس سے بڑھ کر جھلنگہ چارپائی (صفحہ ۴۰) چبوترہ (صفحہ ۶۰) جنگل (صفحہ ۶۷) کھچڑی (صفحہ ۶۳) دھکا (صفحہ ۶۲) گنوار (صفحہ ۸۷) دبلاپن (؟) (صفحہ ۹۰) پالکی (صفحہ ۹۵)

دیپک (صفحہ ۹۹) کنہ ڈوری (کھانا صفحہ ۱۰۰) مہاجن (صفحہ ۱۲۳)۔

دکھنی اور گوجری وغیرہ

اب ہم اس زمانہ مین پہنچ گئے ہین جب ہندوستان کی اس متحدہ زبان نے نظم کی زمین پر قبضہ کیا، شروع شروع مین یہ مذاقیہ اور تفریحی منظومات مین اسی طرح کام مین لائی گئی ہے، جیسے ہمارے عہد مین اکبر مرحوم نے انگریزی لفظون اور جملون کا استعمال اردو شعرون مین کیا، مگر یہ ظرافت بہت جلد سنجیدگی سے بدل گئی، محمد تغلق نے ہندوستان و دکن کو ایک کردیا اور دولت آباد دکن کو اپنی حکومت کا دارالسلطنت اور دلّی اُجاڑ کر اہل دہلی کو دولت آباد مین لیجا کر بسایا، یہ پہلا دن تھا جس مین اس زبان کا تخم دکن کی سرزمین مین بویا گیا، یہان کی آب وہوا اس کو ایسی راس آئی کہ تخم بڑھ کر پودا ہوا، اور پودا ایک عظیم الشان درخت بن گیا، اور حیرت سے سنا جائے گا کہ اس درخت نے شمال سے پہلے دکن مین پھل دیئے، تصوّف اور عوام کے مذہبی جذبات نے اس زبان کو اپنے فیوض سے مالامال کرنا شروع کردیا جس کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ دکن کے بہمنی بادشاہون نے آٹھوین صدی ہجری مین دہلی سے الگ ہوکر گلبرگہ مین جب اپنی نئی خودمختار حکومت قائم کی تو اپنا سرکاری دفتر فارسی کے بجائے ملک کی دیسی زبان مین رکھا اس کے قدرتی نتیجے دو ہوئے، ایک تو یہ کہ برہمنون نے سرکاری دفاتر مین جگہ پائی، اور دوسرا یہ کہ دیسی زبان نے ترقی شروع کی بہمنی مٹ کر جب عادل شاہی وقطب شاہی وغیرہ پیدا ہوئے تو انھون نے بھی اسی زبان کی سرپرستی کی، اور چونکہ شمالی ملک کے سلاطین کی طرح اُن کے کابل وایران سے تازہ بتازہ تعلقات نہ تھے، اور نہ وہ خود اپنی نسل ووطن پر فخر کرتے تھے، اسلئے

ان کے دربار کی زبان فارسی کے بجائے ہندوستانی ہو گئی تھی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی ان کی مادری زبان تھی،

ہندوستانی مسلمانوں کی مادری زبان

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) جو تخت نشینی کے وقت تک جاہل رہا تھا اور پھر رفتہ رفتہ اس نے پڑھنا سیکھا اور فارسی پڑھی، اس کے حال میں اس کے معاصر مورخ فرشتہ نے لکھا ہے:

"فارسی خوان گردید و بنوعے فارسی را خوب می گفت کہ تا ہندوستانی متکلم نمی شد ہیچ کس نمی توانست فہمید کہ غیر از فارسی زبان دیگر آشنائی دارد" (ج ۲ صفحہ ۸۰ نولکشور)

اس اہم فقرہ سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک تو ہندوستانی زبان کا وجود اور دوسری یہ کہ ان بادشاہوں کی عام بول چال کی مادری زبان یہی ہندوستانی تھی جس میں ان کے عہد کی تصانیف ملتی ہیں،

موجودہ صوبہ جات متحدہ کی مادری زبان بھی اس عہد میں اسی قسم کی ہندوی یا ہندوستانی تھی، بدایوں جو مغلوں سے پہلے ایک مرکزی حیثیت رکھتا تھا، وہاں کے عبدالقادر بدایونی جنہوں نے ۱۰۰۴ھ میں اپنی تاریخ لکھی ہے اس وقت کے ایک نو دس سالہ لڑکے (۹۴۷ھ کی ولادت) استاد شیخ عبداللہ بدایونی کا حال لکھتے ہیں کہ بچپن میں وہ استاد سے بوستان پڑھ رہے تھے شعر یہ آیا،

محال است سعدی کہ راہِ صفا | توان یافت جز در پئے مصطفیٰ

"پرسید کہ معنی این بیت چیست، بزبان ہندی بیان کنید...... چو معنی آن گفتہ...... (ج ۳ صفحہ ۵۴)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچون کی مادری زبان ہندوی ہو چکی تھی، اکبر کی زبان مین ملا بدایونی وغیرہ نے پنڈتون کی مدد سے جس ہندی سے فارسی مین سنسکرت کتابون کے ترجمے کئے تھے اس سے مراد یہی اس وقت کی اردو ہے، پنڈت سنسکرت سے اس وقت کی ہندوی مین، اور ملا ہندوی سے فارسی مین ترجمہ کرتے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ ملا نے ہندی جاننے کا کہین دعویٰ نہین کیا ہے،

شیخ عبدالوہاب متقی جنکا وطن مالوہ تھا ۹۶۳ھ مین ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہان ممالک اسلامی کے طلبہ کو درس دیتے تھے، اس درس کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر ملک کے طالب علمون سے ان ہی کی زبان مین تقریر فرماتے تھے اس سلسلہ مین ہندیون کو وہ ہندی مین سبق پڑھاتے تھے، شیخ عبدالحق دہلوی جو ان کے شاگرد خاص تھے، ان کے حال مین لکھتے ہین :-

"وبا ہندیان در تقریر فارسی تکلف نکنند، وہم بہ زبان ہندی اکتفا فرمایند"[1]

یہ واقعہ بھی اس دعوے کی شہادت ہے کہ ہندوستانی مسلمانون کی زبان ایک مدت سے ہندوستانی ہو چکی تھی،

شیخ عبدالوہاب متقی کے استاد شیخ علی متقی مشہور محدث ہین، ان کا آبائی وطن تو جونپور تھا لیکن پیدایش برہان پور مین ہوئی اور ابتدائی ملازمت شاہان مالوہ کے ہان منڈو مین کی، شیخ باجن کے مرید اور ان کے لڑکے سے چشتی خرقہ پہنا، پھر ملتان جا کر شیخ حسام متقی

---

[1] تاریخ اردوئے قدیم حکیم سید شمس اللہ قادری، نقلاً از زاد المتقین فی طریق سلوک الیقین شیخ عبدالحق دہلوی قلمی،

کی صحبت اٹھائی پھر ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکہ معظمہ چلے گئے، کبھی کبھی سلاطین گجرات کے اصرار سے احمد آباد گجرات آجاتے تھے، سنہ ۹۷۵ھ مین مکہ معظمہ مین وفات پائی، غور کیجیے کہ ان کا تعلق ہندوستان کے کن کن صوبون سے رہا، جونپور (پورب) برہانپور (خاندیس) مندو (مالوہ) ملتان (سندھ و پنجاب) اور احمد آباد (گجرات) بایں ہمہ جو ان کی زبان تھی وہ اس دوہرہ سے ظاہر ہے جسکو انھون نے اپنی موت سے کچھ دنون پہلے مرض الموت کی حالت مین پڑھا فرمایا کہ کھانے کو پیس ڈالو،

آن چنان سحق کن کہ ہمہ یکے شود دوئی نماند، چنانچہ این دوہرہ خبر می دہد و می گوید، دوہرہ[۱]

سن سہیلی پریم کی باتا　　　یون مل رہی جیون دودھ بتاتا

دیکھئے کہ اردو کی پوری شان اس شعر مین موجود ہے،

تاہم اس مین شک نہیں کہ جب تک شمالی ہند مین حکومت کا رعب وداب قائم رہا اس مادری زبان مین لکھنا پڑھنا اور تصنیف و تالیف معیوب رہی اور اس کے برخلاف دکن اور گجرات مین خود صوفیہ نے اور شیعہ بادشاہون نے پہل کی، صوفیہ نے اس زبان مین صوفیانہ رسالے لکھے اور بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہون نے اس مین امام حسین علیہ السلام کے مرثیے اور مناقب لکھے اور رفتہ رفتہ شاعری کے دوسرے مضامین بھی بندھنے لگے اور اس طرح نثر کے ساتھ نظم نے بھی دکن اور گجرات مین ترتیب و تدوین کی عزت پہلے پائی،

ہم سب کو انجمن ترقی اردو اور دکن کے بعض دوسرے اہل قلم کا ممنون ہونا چاہیے،

[۱] اخبار الاخیار صفحہ ۲۴۹ مطبع ہاشمی میرٹھ،

جنھون نے اس عہد کی دکھنی نظم و نثر کتابون کو حلیۂ طبع سے آراستہ کرنا شروع کر دیا ہے، یہ وہی ہندوستانی زبان ہے جس کو لوگ بعد مین دکھنی کے نام سے یاد کرنے لگے ہین،

اس کے صوبہ وار نام

حقیقت یہ ہے کہ نئی قوم کے اختلاط اور میل جول نے ہر صوبہ کو متاثر کیا اور اس طرح اس نئی زبان کو بھی مقامی اور صوبہ وارانہ اثرات نے داخل ہو کر مختلف بولیون مین منقسم کر دیا، دکھنی، گوجری، دہلوی، لکھنوی، بہاری، پنجابی، ہر صوبہ کی ہندوستانی بولی مین علحدہ علحدہ کچھ کچھ امتیازات پیدا ہو گئے تھے، اور اس لئے اس نئی زبان کا نام ہر جگہ الگ پڑا، مثلاً دہلوی، دکھنی، گوجری، ہندی، ہندوی، یہ سب تفاوت اسی ایک کے نام ہین،

اردو نام

تاہم یہ بات تعجب کے ساتھ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ شروع سے لے کر اب تک اس زبان کا نام اب تک "اردو" سننے مین نہین آیا، حالانکہ ہم نے آج اس نام کے سوا اس کے اور سب نام بھلا دیئے ہین، یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اردو ترکی لفظ ہے جس کے معنی لشکر شاہی یعنی لشکرگاہ اور کیمپ کے ہین اور اس معنی مین اس کا استعمال بہت قدیم ہے، یہان تک کہ تغلقون کی تاریخ مین بھی یہ لفظ ان معنون مین بولا گیا ہے، پھر تیموریون اور خصوصاً شاہجہان کے عہد مین "اردوے معلّیٰ" شاہی لشکرگاہ اور دہلی کے قلعۂ معلّیٰ کو کہنے لگے مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی کا شاعرانہ تسلط بھی کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اس نئی زبان کی طاقت روز بروز ابھر رہی تھی، عام بازارون، گلیون اور معمولی گھرون سے نکل کر شاہی دربار تک اس کا اثر پھیل رہا تھا اس لئے شروع شروع مین اس کو لوگون نے "زبانِ اردوے معلّیٰ" کا خطاب دیا، چنانچہ بارہوین صدی ہجری کے اواخر کی تصنیفات تذکرہ نکات الشعراء میر (صفحہ ۱) اور ذکر میر (صفحہ ۹۴)

اور نو طرزِ مرصع مرقع رقم تحسین مین یہ نام یعنی "زبان اردوے معلیٰ" کی نحوی اضافت کے ساتھ استعمال پایا جاتا ہے،

تیرھوین صدی کے اوائل سے کثرتِ استعمال کے سبب یہ اضافت جاتی رہتی ہے اور خود زبان کا نام اردو ہوجاتا ہے، تذکرۂ مخزن الغرائب مین جو ۱۲۱۸ھ کی تالیف ہے، مرزا مظہر جانجانان کے حال مین ہے،

"در زبانِ ہندی کہ مراد از اردو است خیلے فصیح و بلیغ بود"

باغ و بہار وغیرہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات مین یہ لفظ زبان کے معنون مین عام طور سے بولا گیا ہے، ان حوالون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو زبان کے نام کے طور پر آج سے صرف ڈیڑھ سو برس پہلے کی ایجاد ہے،

دہلی کے اردوے معلیٰ پر جب تباہی آئی تو گو دہلی کے علم و ادب اور شعر و سخن کا خزانہ لٹ گیا، مگر اس کا اتنا فائدہ ہوا کہ حسبِ استعداد حصۂ رسدی کے مطابق تمام صوبون مین جہان چھوٹی چھوٹی نوابیان قائم ہوگئی تھین، بزرگون کا یہ اندوختہ سرمایہ بٹ گیا، اہلِ علم دہلی سے نکل نکل کر پہلی منزل لکھنؤ مین، دوسری عظیم آباد مین اور تیسری مرشدآباد بنگال مین کرتے تھے، اور آخر مین ایک اور منزل فورٹ ولیم کلکتہ مین قائم ہوئی، بہت سے عزم و ارادہ والے اپنے بھی تھے جو دکن و ارکاٹ جاکر پناہ گزین ہوئے، اور اس طرح پورے ملک مین اردوے معلیٰ کی زبان نے اشاعت پائی، ع

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد،

یہ اس زبان کی مختصر تاریخ ہے جو آج ہماری ملکی اور قومی زبان ہے بلکہ جو آج اس پورے ملک کی واحد متحدہ زبان ہے،

چونکہ مسلمانوں سے پہلے یہ ملک بہت سی راجدھانیوں میں بٹا ہوا تھا اسلئے نہ یہاں کوئی ایک متحدہ زبان تھی اور نہ کسی متحدہ قومیت کا وجود تھا اور نہ ایک متحدہ مملکت تھی، مسلمانوں نے آکر اس برّ اعظم کو ایک علم کے نیچے ایک مرکز کے ماتحت ایک ملک بنایا جس کا نام پہلے ہند اور پھر ہندوستان رکھا، اور ایک زبان پیدا کی جس کا نام زبان ہند، لغت ہند، ہندوی، ہندی، زبان ہندوستان اور ہندوستانی رکھا،

ہندی لفظ | آج کل جسکو "ہندی" کہتے ہیں وہ پورب کی ایک صوبہ وار بولی ہے جس کیلئے یہ کوشش کیجارہی ہے کہ یہ پورے ملک کی بولی ہو جائے، مگر حقیقت میں اس کا ایسا نام جس کی معنویت کے دائرہ میں سارا ہندوستان داخل ہو جائے، خود بدیسی ہے، پھر بھی اسکے لئے ایسا نام اختیار کرنا اس لئے مناسب ہے کہ اس سے سارے ملک ہند کا خیال سامنے آتا ہے، ورنہ اگر اس کو برج بھاشا یا پوربی بھاشا کہہ دیا جائے تو یہ ملک کے ایک محدود جغرافی حصہ کے ساتھ خاص ہو جائے،

اہل عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو "ہندی" یا "ہندیہ" کہتے تھے، وہ سنسکرت یا پالی، سندھی، ملتانی، گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے، چنانچہ بزرگ بن شہریار کی روایت کے مطابق ۲۷۰ھ میں جس زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا گیا تھا اس کا نام اس مصنف نے "ہندیہ" بتایا ہے،

ان یفسّر لھم شریعۃ الاسلام	شریعت اسلام کا ہندی مین حال لکھے،
بالھندیۃ (عجائب الھند صفحہ ۳)	
ان یفسّر لھم القرآن بالھندیۃ	قرآن کا ہندی مین مطلب بیان
(عجائب الھند صفحہ ۳)	کرے،

اسی طرح الفہرست مین جو ۳۷۷ھ کی تصنیف ہے، ہندوستان کی جس زبان سے عربی مین طب کی کتابین ترجمہ ہوئین اس کے بیان مین ہندوستان کی زبان کا نام ہندی ہی رکھا گیا ہے،

نقل من الھندی الی الفارسی (صفحہ ۳۰۳ مصر) ہندی سے فارسی مین نقل ہوا،

اس لئے مسلمانون نے اپنی حکومت کے بعد اس زبان کو جس کو ہندوستان مین آکر انھون نے اختیار کیا، ہندی کا نام بخشا انتہا یہ ہے کہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی اور مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی نے قرآن پاک کا جس زبان مین ترجمہ فرمایا، اس کو بھی ہندی ہی فرمایا، اس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ہندی کی وسعت کہان تک تھی، اس مین ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہ تھا، ایک ہی زبان تھی جو پورے ملک پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی،

اردو اور ہندی کی تقسیم

لیکن انگریزون نے دلّی کے اردوے معلّی کو چھانٹ کر جب کلکتہ کے فورٹ ولیم مین اپنا نیا "اردوے معلّی" بنا کر کھڑا کیا تو ان کو اپنے ہم قوم عہدہ دارون اور تعلیمی ادارون کی خاطر ملکی زبان کی طرف بھی توجہ کرنی پڑی، اگر ساتھ ہی

ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان کو ہندوستان مین حکومت کرنا ہے تو اس متحدہ قومیت کے درخت پر جو صدیون کی خونریزی سے سینچ سینچکر تیموریون کی باغبانی سے تیار ہوا تھا، پہلے کلھاڑی مارنا ضروری ہے اس کے لئے ضرورت تھی کہ ہندو اور مسلمانون کے امتیازات کے حدود کو جس قدر ممکن ہو اُبھارا جائے، چنانچہ فورٹ ولیم مین اردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے قائم ہوئے ایک مسلمانون کے سر پر تھوپا، اور دوسرے کو ہندوؤن کے سر مڑھا اور اس کا نام علمی قدر دانی اور ادب نوازی رکھا، اور دونون زبانون مین کتابین لکھوا لکھوا کر لوگون مین تقسیم کیگئین، یہ ہے آغاز اس انجام کا جو آج اُردو اور ہندی کے مہابھارت کی صورت مین ملک مین قائم ہے۔

شاید آج لوگون کو وہ واقعہ بھی یاد نہ ہو جس کا تعلق اس عظیم الشان درسگاہ کے پہلے بانی سے ہے، ہندی اردو کا جھگڑا ۱۸۶۷ء سے شروع ہوا ہے، اسی سال بنارس مین بعض سربرآوردہ ہندوؤن نے یہ کوشش شروع کی کہ تمام سرکاری عدالتون مین سے اردو زبان اور فارسی خط موقوف ہو کر ہندی بھاشا اور دیوناگری خط جاری ہو، سرسید اس وقت سے لیکر مرنے سے نو دن پہلے تک اس کے خلاف قلمی جہاد مین مصروف رہے اور ان ہی کی مخالفت کا اثر تھا کہ ان کی زندگی تک یہ تجویز سرکاری طور سے منظور نہ ہو سکی، اُن کی وفات کے چند سال بعد، غالباً سنہ ۱۹۰۲ء مین سر میکڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر صوبۂ متحدہ نے اس صوبہ مین ہندی کو قانوناً ممتاز حیثیت بخشی، اور اردو ہندی کی ناگوار بحث کا وہ تخم اس سرزمین مین بویا، جس کو اس سے پہلے وہ بہار مین بو چکے تھے، لکھنؤ کے گنگا پرشاد ورما لائبریری ہال مین سرسید کے جانشین اور اس درسگاہ کے سکریٹری نواب محسن الملک مرحوم کی صدارت مین اُردو

کے ماتم کے لیے ایک جلسہ منعقد ہوا جس مین مرحوم نے ایک دلگداز و موثر تقریر کے بعد اُردو کے لئے یہ مصرع پڑھا تھا ؎

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اور یہی وہ فضا ہے جس مین انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ہندی بھی پنڈت مالوی کی کوششون کے زیر سرپرستی روز بروز ترقی پانے لگی، ہندی اخبارات اور رسائل اور تصنیفات کا انتظام ہوا اور پورے ملک مین اردو اور ہندی دو حریف کی حیثیت سے صف آرا ہوئین اور ابتک ہین اور اب انھون نے ہندو مسلمان دونون کی دو الگ الگ زبانون کی شکل اختیار کر لی ہے، جو حد درجہ افسوسناک ہے۔

علی گڑھ کی تحریک کا حصہ اردو زبان کی ترقی مین

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مسلمانون کی زندگی مین نئی تحریک اور نئے تعلیمی و ادبی انقلاب کی آواز اسی درسگاہ کی چہار دیواری سے اٹھی ایک مولوی محمد حسین صاحب آزاد کو چھوڑ کر جو ایک مستقل ادبی ریاست کے بانی ہین، باقی اُردو کے تمام علمبردار اسی کی ہمہ گیر سلطنت سے وابستہ تھے، اردو زبان کو قصص و حکایات اور قصائد و غزلیات کے تنگ کوچے سے علوم و فنون کی شاہراہ پر جو لایا وہ سر سید مرحوم ہی تھے اردوئے معلّی اور عود ہندی والے غالب کے بعد جس نے عروس اردو کو سادگی کا گہنا پہنا کر تکلفات لاطائل کی گرانباری سے آزاد کیا، وہ اسی درسگاہ کا بانی اول تھا، سر سید مرحوم کی اردو کی پہلی تصنیف آثار الصنادید ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے پہلے مسجع و مرصع عبارت مین لکھی گئی تھی، مگر اسکا دوبارہ اڈیشن صاف و روان عبارت مین شائع ہوا،

گو یہ سچ ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں نے سرسید کیا بلکہ غالب سے بھی پہلے سادہ نگاری کا آغاز کیا، مگر وہ تحریک صرف مذہبی دائرہ مین سمٹ کر رہ گئی، اسی طرح حیدرآباد مین نواب شمس الامراء بہادر نے جدید علوم مین شمسیہ نام اُردو رسالے تصنیف کیے اور دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر نے پولیٹکل اکانمی کے ترجمے کیے مگر یہ افراد کی محدود کوششین تھین، سرسید نے ۱۸۶۳ء مین سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے باقاعدہ ایک علمی انجمن اس غرض سے قائم کی کہ علوم و فنون کی نئی نئی کتابین انگریزی سے اردو مین ترجمہ کر کے شائع کی جائین، آج جو مسلم یونیورسٹی پریس ہے اس کی بنیاد اول اسی سائنٹفک سوسائٹی کا پریس ہے، جو پہلے سرسید کا ذاتی پریس تھا، اس سوسائٹی کی طرف سے چالیس کتابین چھوٹی بڑی تاریخ اور سائنس کی چھپ کر شائع ہوئین،

سرسید نے اپنی کشش اتصال سے علم و ادب کے ایسے متعدد استادون کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا جن مین سے ہر ایک بجائے خود ایک نظامِ شمسی تھا، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اور بہت سے اہلِ قلم یکجا ہو گئے جنھون نے اپنی کوششون سے اس بولی کو زبان کا درجہ دیدیا، اور ہر قسم کی ادائے مطلب کا اہل بنا دیا، علی گڑھ کی درسگاہ کو اس زبان کی ترقی کی تاریخ مین بہت سے اوّلیات حاصل ہین،

۱- یہ پہلا ادارہ ہے جس نے اس زبان کے لئے علمی و ادبی ذخیرہ فراہم کیا،

۲- یہ پہلا ادارہ ہے جس کے احاطہ مین اس زبان کے مسلّم و مستند مصنف اور اہلِ قلم پیدا ہوئے،

۳ - یہ پہلا ادارہ ہے جس نے سب سے پہلی دفعہ اس زبان کے معیاری ذخیرہ کو اہل نظر اور شائقین کے لئے فراہم کیا علی گڑھ کالج بکڈپو آج سے تیس برس پہلے اس زبان کا واحد ذخیرہ گاہ تھا جہاں سے کم از کم ایک ہزار ماہوار کی کتابیں فروخت ہوتی تھیں ،

۴ - اور سب سے آخر یہ ہے کہ یہ پہلا ادارہ ہے جس نے دہلی اور لکھنؤ اہل زبان اور زبان دان شہری اور قصباتی کی دیرینہ جنگ کا خاتمہ کیا، اور جس طرح یہ زبان خود ایک مشترکہ زبان کی حقیقت کی مدعی ہے اسی طرح علی گڑھ نے اس کو مشترکہ ہندوستان کی ادبیت کا خزینہ دار بنایا، اور دہلی و لکھنؤ کے پرانے پیدائشی دعووں کو مٹا کر اہلیت و استعداد کی شرط کے مطابق حقیقی فضل و کمال کو زباندانی کا معیار قرار دیا، اور ادبیات کی ایک آزاد ہندوستانی حکومت قائم کی جس میں ہر صوبہ اور ہر صوبہ کے ہر شہر کے اہل قلم اور اہل علم برابر کے شریک ٹھہرے، سر سید دلی کے تھے، محسن الملک اٹاوہ کے، مولانا حالی پانی پت کے، مولانا نذیر احمد بجنور کے، مولانا شبلی اعظم گڈھ کے، مگر ان سب کی تصنیفات نے مل کر اس زبان کا ایک متحدہ معیار مقرر کر دیا، سر سید مرحوم نے جس دن مولانا شبلی کی المامون پر یہ فقرے لکھے ۔

"یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا" (دیباچہ طبع دوم المامون)

تو درحقیقت انھوں نے اس وقت اس زبان کو لکھنؤ اور دہلی کی گرفت سے آزادی کا خط فرمان لکھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شہر و دیار کے اہل قلم کو زبان کھولنے کی جرأت اور اپنی اپنی بساط کے مطابق عرض متاع کی ہمت ہوئی، اور کچھ ہی دنوں میں اس زبان کا خزانہ ہر قسم کے قیمتی

سامانون اور ذخیرون سے مالا مال ہونے لگا،

موانع کے باوجود اردو کی ترقی،

اس انقلاب نے ملک مین علوم و فنون اور سنجیدہ علوم کی تصانیف کا روز افزون ذخیرہ فراہم کر دیا، اور وہ زبان جو پہلے صرف چند دیوانون اور کہانیون کی مالک تھی، وہ ہر قسم کے علم و ہنر سے معمور ہوتی جاتی ہے، اور اس مین کوئی شبہہ نہین کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس مین حکومت و سلطنت کی ذرا بھی مدد شریک نہین ہے بلکہ لوکل سلف گورنمنٹ کی تعلیمات کا جہانتک تعلق ہے اردو کو اپنی اشاعت مین ایک انگلی کا اشارہ بھی نہین مل رہا ہے، حالانکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہندی پرچارنی سبھا نہ صرف اس صوبہ کی گورنمنٹ کی مالی امداد سے بار بار مستفید ہوئی ہے، بلکہ ڈسٹرکٹ بورڈون اور میونسپلٹیون کے تعلیمی نصابون کے وسیع سلسلہ کے ذریعہ ہندی دیہاتی اور شہری رقبون پر روز بروز قبضہ کرتی چلی جاتی ہے، شاید یہ بیان تعجب سے سنا جائے کہ ہندو پبلشرون اور کتابون کے انتخاب کی کمیٹیون مین ہندو ممبرون کی کثرت کے سبب سے نصاب مین کسی ایسی کتاب کا داخل ہونا اور چلنا ممکن نہین جس کی اردو ہندی نہ ہو،

"یہ واقعات شکایت کے طور پر نہین کہے جا رہے ہین، بلکہ یہ کہنا ہے کہ باوجود اس کے کہ ہماری زبان کو گورنمنٹ اور گورنمنٹ کے کسی ادارہ سے کسی قسم کی امداد نہین مل رہی ہے، پھر بھی اس کی ترقی جاری ہے،"

اردو ایک اور امداد سے بھی قدرۃً محروم ہے، اس بات کی پر زور کوشش کیجا رہی ہے کہ آیندہ "ہندی قومیت" کی مشترکہ قومی زبان ہندی ہو جائے، اس خواہش کی تکمیل مین کانگرس

سے لے کر ناگری پرچارنی سبھا تک یکسان شریک ہے، کانگریس اور دوسرے پولیٹکل جلسون مین جن مین گو ہندو اور مسلمان دونون شریک ہون، ہندو نوجوان اپنی تقریر ایسی زبان مین کرین گے جن کو جلسہ کے نصف حاضرین نہین سمجھ سکتے، اکثر ایسی تجویزون کی تائیدون کی عزت مسلمانون کو حاصل کرنی پڑی اور کرنی پڑتی ہے جن کی "ہندی پرستاؤ" کا ترجمہ اردو مین کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، دوسری بات ایک اور چل گئی ہے کہ اردو نے جن ہندی لفظون کو اپنے قالب مین ڈھال کر اپنے کینڈے کا بنا لیا ہے، کوشش کیجا رہی ہے کہ اب اُن کو اصل ہندی تلفظ کے مطابق ادا کیا جائے،

دوسری طرف ہندو ریاستون نے ایک ایک کرکے ہندی کو اپنی سرکاری زبان بنانا شروع کردیا ہے، گجراتی والی ریاست بڑودہ اور اردو والی ریاست اندور سے لیکر دور کشمیر و راجپوتانہ تک یہ تحریک عام ہورہی ہے، ان سب کے جواب مین ہمارے پاس صرف ایک چیز ہے، وہ سرکار نظام خلد اللہ ملکہ لیکن میری پیشین گوئی یہ ہے کہ ان سب حالات کے باوجود ہندوستان کا مستقبل اردو کے ہاتھ مین ہے، ہندوستان مین جب تک مختلف قومین باقی ہین اور بیرونی دنیا سے اس کے تعلقات قائم ہین، اس مین ایک ایسی زبان کا وجود جیسی کہ اردو ہے ناگزیر ہے،

ہندوستان کو اگر ایشیا کے دوسرے ملکون کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے ہین تو اسکو اپنی جس زبان کے ذریعہ سے ان تعلقات کا رشتہ مضبوط کرنا ہوگا، وہ اردو ہے، اس کی ایک سمت مین کابل و بلوچستان سے لے کر بغداد تک فارسی حکمران ہے، اور دوسری طرف

سواحلِ عرب و افریقہ سے لےکر جبرالٹر تک عربی پھیلی ہے، ان تمام بیرونی قومون کے لیے ہندوستان کی جس زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہے وہ اُردو ہے، یہی سبب ہو کہ یہ زبان اُن تمام ملکون اور جزیرون مین آسانی کے ساتھ پھیل گئی ہو، جہان ہندوستانیون کی آمدورفت ہو، برما، آسام، سیلون، مالدیپ، انڈمان، مارشیس، سنگاپور، پورٹ بلیر، اور آفریقہ کے ان مختلف ملکون مین جہان جاکر ہندوستانی بسے ہین، اس زبان کو اپنے سینون سے لگا کر ساتھ لے گئے ہین، ادھر سواحلِ عرب مین عدن، جدہ بلکہ مکہ معظمہ تک اس زبان مین بات چیت ہوتی ہے، انتہا یہ ہے کہ پورٹ سعید کے ملاحون اور مصر کے بازارون تک مین اس کے بولنے والے ملے ہین، کیا اس پر آپ کو حیرت نہ ہوگی کہ قسطنطنیہ مین اردو سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہ وغیرہ کے ترجمے براہِ راست ترکی مین ہوئے، مکہ معظمہ مین مجھے ماسکو کے ایک عالم موسیٰ جار اللہ سے ملاقات ہوئی جو اردو تصنیف ارض القرآن کو ہندوستانیون سے پڑھتے تھے، ادھر عربی درسگاہون اور مسافرون اور تاجرون کے ذریعہ زبان یاغستان، افغانستان، بخارا بلکہ چینی کاشغر تک اپنا سلسلہ ملا چکی ہے،

ہندوستان مین پشاور سے کسی ریل پر بیٹھ کر آپ ہندوستان کے جس گوشہ مین بھی جائین قلی، اہلِ اسٹیشن، خوانچہ فروش، مسافر، صاف صحیح نہ سہی تو جو ٹوٹی پھوٹی زبان وہ بولتے چالتے اور سمجھتے آپ کو سنائی دینگے وہ یہی زبان ہوگی،

ہندوستان کے پورے طول و عرض مین جہان بھی مسلمان آباد ہین، خواہ اُن کی مادری زبان کچھ ہو اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اُن صوبون مین اردو کی تعلیم کے مکتب اور اسکول قائم ہین اس لئے جہانتک مسلمانون کا تعلق ہے یہ زبان اب تک ملک کی واحد مشترکہ زبان ہے

اس موقع پر ناشکری ہوگی اگر پنجاب کے اُن خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے جو اس نے اس زبان کی اشاعت میں انجام دین، لاہور ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے مولانا حالی مرحوم سب سے پہلے سیراب ہوئے اور گو شمس العلما محمد حسین آزاد دلی کے تھے، مگر اُن کے ادبی فضل وکمال کی شہرت کی خوشبو اسی مشک زار سے نکل کر پورے ملک میں پھیلی، اگر علی گڈہ کا تہذیب الاخلاق اردو کا پہلا معیاری رسالہ ہے جس کو پرانے بزرگون کے تجربہ کار قلم نے وجود بخشا تھا تو لاہور کا مخزن پہلا معیاری رسالہ ہے جس کو جدید تعلیم یافتون کے پرزور دست وبازو نے نکالا اور چمکایا اور جس کے بعد دوسرے ادبی رسالے نکلے اور بڑھے یہان تک کہ آج اس وسیع ملک کا کوئی ممتاز شہر ایسا نہین جس کو اردو کے کسی ادبی رسالہ کا مولد نہی تو مدفن بننے کا شرف حاصل نہ ہوا ہو،

اردو اخبارات نے بھی اس زبان کی ترویج واشاعت مین بہت بڑا حصہ لیا ہے، اور کس قدر خوشی اور مسرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرتا ہون کہ آج پشاور کی پہاڑیون سے لیکر بمبئی، رنگون، مدراس اور کراچی کے سواحل تک اردو اخبارات پھیلے ہین، اور اکثر صوبون سے روزانہ اخبارات نکل رہے ہین، اور ہفتہ وار صحیفے اور ماہوار رسالون کی تعداد ان کے علاوہ ہے، بلکہ ہندوستان سے باہر جہان بھی ہندوستانی آباد ہین، اس زبان کے پیغامبر موجود ہین، اور آج ہندوستان کے جس شہر مین کوئی خطیب چاہے، اپنے لئے سامعین [illegible] سکتا ہے، ایسے بھی موقع آئے ہین کہ انگلستان اور امریکہ تک سے کبھی نواے کیمبرج، [illegible] صدائے وطن سنائی دی ہے،

ہندوستان کی اس زبان نے یہانتک وسعت پائی ہے کہ یورپ کی یونیورسٹیون اور

لائبریریون مین اس نے اپنی جگہ حاصل کر لی ہے، کیا ہمارے لئے یہ فخر کی بات نہین کہ ہماری زبان سے انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی مین تصانیف کے ترجمے ہو رہے ہین، چند ہفتے ہوئے کہ پوٹسڈم واقع جرمنی سے میرے پاس ٹوٹی پھوٹی اُردو مین ایک جرمن ڈاکٹر کا خط موصول ہوا

ہندی کی اشاعت اُردو کیلئے مفید بھی ہے

کہ ہندوستان کے ان صوبون مین جہان ہندوؤن مین اردو بہت کم رائج ہے، جیسے مدراس اور بنگال اگر وہان ہندی کا رواج دوسری زبان کی حیثیت سے ہو جائے تو میرے خیال مین یہ بھی ہندوستان کے لئے نہایت مفید ہے، اول یہ کہ کم از کم کوئی ایک زبان تو ہندوستان کے منہ مین ہوگی، دوسرے یہ کہ ہندی اُردو کا ایک درمیانی زینہ ہے، مجھے ایک دفعہ مدراس جانے کا اتفاق ہوا، ریل مین ایک مدراسی ہندو بزرگ کے سوا کوئی رفیق نہ تھا، وہ ناگری پرچارنی سبھا کی مدراسی شاخ کے ذریعہ ہندی سیکھ رہے تھے، اتنے سہارے پر یہ ممکن ہو سکا کہ ہم انگریزی کی مدد لئے بغیر ایک دوسرے کی کچھ سمجھ سکین

قومون کے بنانے مین زبان کا درجہ

اصل یہ ہے کہ ہمارے وطنی بھائیون نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ قوم کی پیدایش اور ترقی مین اس کی زبان کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے انسان جانورون کو تو لگام لگا کر اپنا تابعدار بناتے ہین لیکن جب ایک انسانی قوم دوسری انسانی قوم کو اپنی تابعدار بناتی ہے تو گو اس کے منہ مین لوہے کی لگام نہین لگاتی تاہم اسکے منہ مین ایک لگام لگا دیتی ہے جس کا نام "بدیسی زبان" ہے، انسان کے تمام اعمال اسکے خیالات کے ماتحت ہین، خیالات کی روح الفاظ کے جسم مین جلوہ گر ہوتی ہے، الفاظ زبان کا دوسرا نام ہین، اس لئے کسی دوسری قوم کی زبان کے معنیٰ اس قوم کا تمدن، تاریخ

مذہب، جذبات ہر چیز ہین،

آپ جب انگریزی پڑھتے ہین، یا انگریزی بولتے ہین، تو نادانستہ طور سے آپکے جسم و جان اور ارادہ و روح انگریزی کی صورت اختیار کرلیتی ہے، زبان کے الفاظ، محاورات، ضرب الامثال، استعارات، ہر چیز اُس زبان کی قومیت کی جیتی جاگتی تاریخ ہوتی ہے، اور یہ تاریخ اُس قوم کی زندگی کی بجلیون کا خزانہ ہوتی ہے، جب آپ انگریزی بول رہے ہوتے ہین، غور کیجیےگا کہ اس وقت آپ اپنے اندر انگریزی تاریخ، انگریزی جذبات، انگریزی احساسات انگریزی خیالات کا سرتاپا مجسمہ بنجاتے ہین، اور خود اپنی تاریخ، اپنے قومی جذبات، اپنے مذہبی احساسات اپنے ادبی خیالات سے یکسر عاری ہوجاتے ہین، ساتھ ہی ساتھ اس زبان کے آداب و معاشرت، طرز تمدن، لباس و پوشاک لب ولہجہ ہر چیز مین اس بدیسی قوم کی نقالی کرنی پڑتی ہے، اب ایسی قوم جو قلبًا وقالبًا، روح و جسم ظاہر اور باطن دونون مین دوسری قوم کی نقالی کر رہی ہے، خود اپنی قومیت کا وجود اس کے اندر کہان رہا، اب وہ ایسے افراد بن گئے ہین جو اپنی قومیت کے عناصر کو تو فنا کر چکے ہین، مگر دوسری قوم جس کی وہ نقالی کر رہے ہین وہ اپنے اندر ان کو شمار کرنے سے رہی، اس لئے ان کی حیثیت معزز اچھوت سے بڑھکر نہین

اس مختصر بیان سے اس نتیجہ کے قبول کرنے مین کسی کو عذر نہ ہونا چاہئے کہ قومیت کی تخلیق مین زبان کا درجہ مذہب کے بعد سب سے بڑھکر ہے، اگر اس نکتہ کو ہم اب تک نہین سمجھ سکے ہین تو یقین کرنا چاہئے کہ ہم اب تک قومی حقیقت کی معرفت سے کوسون دور ہین، ہم غیر زبانون کے سیکھنے مین عمر برباد کرتے ہین اور بدیسی جذبات و خیالات کی نقالی

سے اپنی قومی ترقی کا مجنونانہ خواب دیکھتے ہین،

مادری زبان مین تعلیم

آج دنیا کے وسیع عرصۂ کائنات مین ہزارون قومین آباد ہین، کیا کسی ایک قوم کا بھی نشان دیا جا سکتا ہے، جس نے غیر مادری زبان مین تعلیم کے ذریعہ ترقی کی منزلِ مقصود کو پایا ہے، خود مسلمانون نے اپنے عقلی علوم وفنون کا بڑا حصہ یونانیون، مصریون، ہندوؤن اور ایرانیون سے حاصل کیا، مگر اس طرح نہین کہ انھون نے دمشق و بغداد، اور شیراز و قرطبہ مین بدیسی زبانون کی درسگاہین کھول دی ہون بلکہ اس طرح کہ تمام زبانون کے علمی خزانون کو ان زبانون سے لے کر اپنی زبان مین منتقل کر لیا، بے شبہہ دوسری علمی زبانون کا سیکھنا بھی ترجمہ و تشریح کے لئے قومی ترقی کے سفر کی ابتدائی منزل ہوتی ہے، مگر وہ خود قومی ترقی کے ہر سفر کی منزلِ مقصود نہین ہوتی، وہ ایک عارضی گذرگاہ ہے، دائمی قیامگاہ نہین،

خوشی کی بات ہے کہ جامعۂ عثمانیہ کے بہادرانہ اقدام نے ہندوستانیون کے اس بزدلانہ عقیدہ کو زائل کر دیا ہے کہ دیسی زبان تعلیم کا ذریعہ نہین بن سکتی، اور حوصلہ دلایا ہے کہ حیدرآباد دکن کی پیروی مین پورا ہندوستان اپنا سفر شروع کرے، ہندوستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی کلکتہ یونیورسٹی نے بھی اپنا چولا بدلنے پر آمادگی ظاہر کی ہے، اور میٹرک تک دیسی زبان ذریعۂ تعلیم بنا دی ہے،

ہمارے صوبہ کی دوسری قومی درسگاہ ہندو یونیورسٹی بھی ہندی کو میٹرک تک ذریعۂ تعلیم بنانے کا اعلان کر چکی ہے، اس سے ہندی زبان کی ترقی و اشاعت اور ہندو قومیت کی تخلیق کا جو فائدہ اس قوم کو پہنچے گا اس کا اندازہ آسان ہے، کیا ہماری قومی درسگاہ اس

مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور کرے گی؟

اگر کبھی مسلم یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آیندہ اس درسگاہ کی تعلیمی زبان اردو ہوگی، تو آپ کو چند سال مین معلوم ہو جائے گا کہ اردو زبان کہان سے کہان پہنچ گئی، واقعات کی بنا پر دعوی کیا جاتا ہے کہ جامعۂ عثمانیہ نے اپنی پندرہ سال کی زندگی مین علوم و فنون اور زبان اور قوم کو جو فائدہ پہنچایا ہے، وہ ہماری بدیسی یونیورسٹیون نے ساٹھ اور ستر سال کی زندگیون مین بھی نہین پہنچایا، حیدرآباد مین علمی انقلاب ہو گیا ہے، تصانیف، تحقیقات، اور جدت خیالات کی نئی دنیا پیدا ہو گئی ہے، اور پیدا ہونے کی امید ہے،

آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کا وائس چانسلر حیدرآباد کی اس تعلیمی کشتی کا ناخدا تھا اگر وہ ہمت کرے تو کول کی سرزمین مین بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے، جو دکن کی سرزمین مین ہوا ہے، اصطلاحات کی مشکلین ختم ہو چکی ہین، علوم کی قابل نصاب کتابین ترجمہ ہو چکی ہین اور ہو سکتی ہین، اور اب اچھے سے اچھے زبان دان اور مستند پروفیسر ہاتھ آسکتے ہین،

بیشک بعض نئی کتابون کے ترجمہ کی دقت اٹھانی پڑے گی، لیکن اس مشکل کا حل یہ ہے کہ اردو کے موجودہ ادارون سے امداد و اعانت لیجائے، اور باہمی اشتراک عمل سے اس کام کو انجام دیا جائے، خود جامعۂ عثمانیہ نے اپنی بہت سی کتابین انجمن ترقی اردو، جامعہ ملیہ اور دارالمصنفین کے بعض ممبرون سے ترجمہ کرائی ہین، اور وہ پسند کی گئی ہین،

اردو کے موجودہ ادارے

اس وقت اردو کی خدمت کے لئے ملک مین متعدد مجلسین قائم ہین اور ہر ایک اپنی اپنی بساط بھر اپنے فرائض انجام دے رہی ہے، اردو کی خدمت

کی سب سے پرانی مجلس انجمن ترقی اُردو ہی، جو تیس سال سے برابر اپنے کام مین لگی ہے، اور اس وقت تک تقریباً ستر کتابین جنمین زیادہ حصہ ادبیات کا اور پھر سائنس کا ہے وہ شایع کر چکی ہے اس کے بعد دارالمصنفین ہے، جس نے اپنی اٹھارہ سال کی عمر مین پچاس کتابین شایع کی ہین جنمین بڑا حصہ اسلامی تاریخ، اسلامی علوم اور جدید فلسفہ کا ہے، عمر مین تیسرا اور کام مین سب سے پہلا درجہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کا ہے، جس نے اپنی سولہ سترہ سال کی محنت مین سائنس، ریاضیات، سیاسیات نفسیات، فلسفہ، طبعیات، تاریخ اور مختلف علوم وفنون کی درسی کتابون کا ایک ذخیرہ فراہم کر دیا ہے، جامعہ ملیہ کی اردو اکاڈیمی کا نام بھی لینا چاہئے جس نے بعض فلسفیانہ تراجم اور اقتصادیات کی اور بچون کی تعلیم وتدریس اور مطالعہ کے لئے تاریخی، مذہبی اور ادبی کتابین شایع کی ہین، آخر مین ہم ایک اور ادارہ کا نام لینا چاہتے ہین جبکا شمار اب تک اردو کے محسنون مین نہین، حالانکہ حق یہ ہے کہ ہم اس کے خدمات کا کم از کم اعتراف کرین، یہ اسلامیہ کالج پشاور ہے، جس کے بعض اساتذہ نے ہماری زبان مین سائنس اور خصوصاً فلکیات پر متعدد کتابین پیش کی ہین، آئینسٹن کے نظریۂ اضافیت اور ریڈیو پر ضخیم کتابون کا معاوضہ اور اجرت کی توقع کے بغیر لکھنا اور چھاپ کر شایع کرنا ہمارے خالص شکریہ کا مستحق ہے،

جی چاہتا تھا کہ اس موقع پر مسلمانون کی سب سے بڑی درسگاہ مسلم یونیورسٹی کا نام بھی لون، جہان کے اساتذہ بھی انفراداً کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہین، مگر سوال اردو کا ہے؟ میری ایک دیرینہ تحریک ہے کہ مسلم یونیورسٹی سیریز کے نام سے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جائے، اور جو "باہتمام مولوی مقتدا خان شروانی" چھپ کر ملک کو اپنے کارنامون سے روشناس کرائے، میر ولایت حسین

صاحب خدا ان کی عمر مین برکت دے گواہی دینگے کہ جب "علی گڑھ کالج بکڈپو" اردو کی مستند تصانیف کا تنہا ذخیرہ تھا، وہ کالج کے لئے ذریعۂ امداد تھا؟ یا بارِ دوش؟ بہرحال مسلم یونیورسٹی میگزین، حیوانیات اور طبیہ کالج میگزین اس یونیورسٹی مین ہماری امیدون کا سہارا ہین،

عزیزانِ جامعۃ المسلمین! آپ کی یہ تعلیم گاہ پچاس سال تک مسلمانون کی اُمیدون کا قبلہ رہی ہے، اور اب بھی ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ یہ قبلہ اپنا منہ مغرب سے پھیر کر مشرق کی طرف کرلے، اور ہر چیز کو دوسرون کی نظر سے دیکھنے کے بجاے اپنی نظر سے دیکھے، یہ درسگاہ تمام ہندوستان کے اسلامی صوبون کا نچوڑ ہے، اگر اس زبان کی اہمیت نے اس درسگاہ کے دل پر قبضہ پالیا، تو پورے ہندوستان کا میدان اس کے ہاتھ مین ہوگا، دیکھنے والون کو ہندوستان کے تعلیمی مطلع مین عظیم الشان انقلاب کا غبار اٹھتا دکھائی دے رہا ہے، اس کیلئے ابھی سے تیاری کرنا ہے،

ہندوستان مین زبان کا انقلاب ہو کر رہیگا، اور جس قدر ہندوستان زیادہ متحد ہوتا جائیگا اتنا ہی اس کی متحدہ زبان کا امکان بڑھتا جائے گا، جو لوگ ہندوستان مین دو زبانین پیدا کرنا چاہتے ہین، ان کو ہشیار رہنا چاہئے کہ وہ اس موجودہ ہمالیہ سے بڑھ کر ایک اور ہمالیہ بنا رہے ہین، جو پہلے ہمالیہ سے زیادہ اونچا ہوگا، پہلا ہمالیہ چاہے ٹوٹ کر چور چور ہو جائے مگر ہندوستان کو دو متفرق زبانون مین تقسیم کرنے سے دونون قومون کے درمیان ایک ایسا ہمالیہ کھڑا ہو جائے گا، جو پھر قیامت تک ٹوٹ نہ سکیگا،

عزیزو! ملک کے سیاسی لیڈر سیاسی سوراج کے لئے لڑ رہے ہین، آؤ ہم تم ملک کے "زبانی سوراج"

کے لئے اپنی جد و جہد شروع کریں، ہمارے وطنی بھائیوں نے عزم راسخ کر لیا ہے، اب ہم کو اپنے عزم راسخ کا اعلان کرنا ہے،

چند مشورے — ہم کو یقین ہے کہ اگر اس زبان کے حامی تھوڑی سرگرمی دکھائیں تو اس بنا پر کہ اس زبان کی طبعی صلاحیت ہندوستان جیسے ملک کے بالکل مطابق ہے، یہ زبان بھی ہر مخالفانہ کوشش کے باوجود اس ملک میں پھیل کر اور بڑھکر رہے گی، ضرورت ہے کہ اس زبان کے اہل قلم اور زباندان اس زبان کی آسانی اور سہولت کیلئے کچھ اصلاحات قبول کر لیں،

۱- اس سلسلہ میں ہماری سب سے اہم تجویز یہ ہے کہ ہم اس زبان کا نام "اردو" جو صرف سو ڈیڑھ سو برس سے رفتہ رفتہ ہماری زبانوں پر چڑھ گیا ہے، یک قلم چھوڑ دیں، اس کا نام ہندوستانی رکھیں اور اسی کو شہرت دے کر عام کریں، دنیا کی اکثر زبانوں کا نام ملک یا قوم کے نام سے منسوب و موسوم ہوتا ہے، اردو کا نام اس ملک و قوم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسا اجنبی نام جس سے قومی و ملکی جذبہ کو کوئی تحریک نہ پہنچے، اعتراض کے قابل ہے، اور اس کے بجائے اسکا "ہندوستانی" نام ہندوستان، اور وہ بھی ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ وطن کے نام کے تصور کے حامل ہونے کے سبب سے پوری طرح اپنے اندر ہمدردانہ جذبات کی روح رکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی زبان کا نام ہے جسکو پورے ملک سے تعلق ہے اور وہ پورے ملک کی متحدہ زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے

عام خیال یہ ہے کہ یہ ہندوستانی نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں ہے ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں فرشتہ کی زبان سے یہ فقرہ آپ کو سنایا ہے

"ہنوز فارسی را خوب می گفت کہ تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد"

دیکھئے کہ اس زبان کا یہ نام کتنا قدیم ہے، شاہجہان کے دربار میں منشی چندربھان کو یا کا نام اس وصف کیساتھ آتا ہے

"درین عہد سعادت مہد سرامد نغمہ سرایان ہندوستانی زبان است"۔ (بادشاہ نامہ لاہوری ۲ صفحہ)

ہم اس نام کے ذریعہ سے ملک کے سامنے وہ تخیل پیش کرینگے جو ہندو مسلم کے مشترکہ وطن کے تصور کی ترجمانی کریگا، اور مغلون کے لشکری استیلا کی تاریخ سے جو لفظ "اردو" میں چھپی ہے، ہمکو نجات دیدیگا،

۲۔ اُردو بول چال اور تقریر و تحریر میں اب تک عربی و فارسی کے جو لفظ آکر مل چکے ہیں، اور وہ ہماری زبان کا جزو بن چکے ہیں، ان کے علاوہ فرہنگ اور قاموس دیکھ دیکھ کر نئے نئے لفظون کو اب اس زبان میں رواج دینے سے پرہیز کرنا چاہئے، اِلّا یہ کہ علمی اصطلاحات یا کسی نئی چیز کے نام رکھنے کے لئے کسی نئے لفظ کی منگنی مانگنے کی ضرورت پیش آجائے۔

۳۔ لفظون کی عربی اور فارسی جمع، اور واو عطف اور فارسی اضافتون سے جہان تک ہوسکے بچا جائے اور ان کی جگہ ہندوستانی جمع، اور عطف اور اضافت کو رواج دیا جائے،

۴۔ ہندی کے اُن لفظون کو جو ہندوستانی میں کھپ سکتے ہیں، کھپانے میں ضد اور ہٹ سے کام نہ لیا جائے، غالب اور مومن سے پہلے ہماری شاعری میں ہندی کے سینکڑون اچھے اور پیارے لفظ تھے، جن کو ٹکسال سے بے سبب باہر کر دیا گیا ہے، اب آج کل کی نئی تحریک میں، پرچار، پریم، دیس، سوراج، سماج اور ایسے بیسیون لفظ ہیں جو ہمارے سیاسی مقررون کی زبان پر چڑھ گئے ہیں، اور وہ ہم کو اب اجنبی اور بیگانے نہیں لگتے،

عزیزانِ جامعۃ المسلمین! "یہ ادبی وعظ" جو کافی حد تک لمبا ہو چکا ہے، بہتر ہے کہ "اور" لمبا نہ ہو، ہم اپنے اس طولانی بیان کی معافی چاہ کر آپ سے رخصت ہوتے ہیں،

خطبۂ صدارت ہندوستانی اکاڈمی

جو
۲۶ جنوری ۱۹۳۷ء کو بمقام لکھنؤ ہندوستانی اکاڈیمی کی پانچوین اردو کانفرنس مین پڑھا گیا،

لکھنؤ سے نسبت شرفائے علم و ادب! کرم فرمائی کا ممنون ہون کہ آپنے اپنی اس علمی و ادبی مجلس مین ایک حقیر کو پائین سے اٹھا کر صدر مین بٹھایا، آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھجاتی ہے جب مین یہ دیکھتا ہون کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اُس سرزمین مین بخشی گئی ہے، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبون اور عالمون کا مرکز ہے، خاکسار کو گو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہین لیکن گذشتہ چھتیس برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے وہ وطن ہی کے مانند ہے اسی کی گود مین میرے ہوش و تمیز کی آنکھین کھلین، اسی کے دامن مین میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا مین میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے،

مفارقت کے داغ خوشی اور غم توام ہین، اس خوشی کے موقع پر اُن چند دوستون کی یاد آتی ہے جو اس سال ہم کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گئے، اور جو خود اس بزم ادب کے رکن رکین اور باعث تزئین تھے، منشی پریم چند کا ماتم اُس وقت تک رہے گا جب تک ہماری زبان مین

ان کی کہانیون کا ایک ورق بھی باقی ہے، وہ ہمارے ملک کے دیہاتیون کے دل اور زبان تھے، دیہات کے دکھ درد کو ان کا دل جو محسوس کرتا تھا، وہ اُن کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان لیکن درد اور تاثیر مین ڈوبی ہوئی کہانی، ان کا قلم ہمارے پرانے کیرکٹر اور قومی آن بان کا سچا قدردان تھا،

اصغر مرحوم کی یاد دل سے کوئی کیونکر بھلائے؟ گو اُن کے جسم خاکی کا وطن گونڈا تھا مگر ان کی شاعرانہ مقبولیت کا وطن اعظم گڈہ تھا، اسی ویرانے سے اُن کی شہرت کی بو نکل کر ملک کے چمن زارون تک پہنچی، وہین اُن کا پہلا دیوان مرتب ہوا، وہین ان کے شاعرانہ امتیازات کے جوہر کھولے گئے، اور وہین سے ان کا نشاط روح مطبوع ہو کر نشاط عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے ان شعرا مین سے تھے جنھون نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رخ پلٹا ہے، اور ایک نئے دور سخن کا آغاز کیا ہے،

ان جوانون کے ساتھ بوڑھے نیّر کے فضل و کمال سے ہماری محرومی بھی اس سال کا افسوسناک حادثہ ہے، وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، اور خود بھی شاعر اور شاعر سے بڑھ کر محقق فن تھے ہماری زبان مین فرہنگ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات ان ہی کے آزمودہ کار ہاتھون نے ترتیب دیا، سب سے آخر مین لکھنؤ کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر و مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خان طاہر کا ماتم کرنا ہے، جن کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا،

لکھنؤ کے خدمات | آج ہم جس تاریخی شہر مین جمع ہین، وہ گو ہمارے پورے ملک کی راجدھانی

کبھی نہین بنا لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ وہ ہمارے علوم وفنون اور شعر وادب کا مدتون پایہ تخت
رہا ہے، اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جن کا ٹیلہ اور ٹیلے پر والی مسجد مشہور ہے، یہان کے
سب سے پہلے عالم ہین، عالمگیر کے عہد مین سہالی سے فرنگی محل کو علم وفن کا وہ خاندان منتقل ہوا جو صدیون
تک ہمارے علوم وفنون کا محافظ اور شیراز ہند پورب کا دار العلوم رہا، اور اس نئے زمانے مین مسلمانو
کی نئی عربی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلما کی بنیاد یہین پڑی، یہان کا خاندان اجتہاد پورے ملک کے
طول وعرض پر تنہا حکمران ہے،

دلی کے باغ مین جب خزان آئی، تو یہان بہار کا دور آیا، اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ
خوش لحن تھے جنھون نے اڑ اڑ کر اس چمن کی شاخون پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو
سندھ اور پنجاب مین ہوئی، نشو ونما دکن مین پایا، تعلیم وتربیت دلی مین حاصل کی لیکن تہذیب اور
سلیقہ یہین لکھنؤ مین سیکھا،

اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی تو اس کو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی
میر، انشاء اللہ خان انشا، جرأت اور مصحفی وغیرہ نے ادھر کا رخ کیا، میر انیس کا خاندان دلی سے پہلے
ہی آچکا تھا، ان بزرگون کے دم قدم سے بادشاہون کے دربار، امرا کی ڈیوڑھیان، اور اہل علم
کی محفلین، شعر وسخن کے نغمون سے پرشور بن گئین، ناسخ وآتش، وزیر وصبا اور ان کے شاگردون
اور شاگردون کے شاگردون نے شعر وادب کے جواہر ریزون کے ڈھیر لگا دیئے،

شعر وسخن کے چرچون اور شاعرون کے تفریحی جھگڑون کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی محاورات
کی نزاکت، الفاظ کی تراش خراش اور اصول وقواعد کے وضع وتالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو

صدیون مین یہان انجام پایا، اُسی کا اثر ہے کہ اس نے بولی سے بڑھ کر زبان کا درجہ پایا، ملکِ سخن کے دو واخیر فرمانروا انیس و دبیر نے شاعری نہین کی، بلکہ اپنے نام سے زبان وادب کے سکّے ڈھال ڈھال کر اہلِ ملک مین تقسیم کرتے رہے،

ناسخ نے زبان کی نزاکت و لطافت مین وہ کام کیا، جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر جلا دینے مین کرتا ہے، ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح و غلط، ثقیل و سبک لفظون کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ اُن کی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سینکڑون الفاظ جو بول چال مین رائج تھے مگر شعر و انشا کی بارگاہ مین اُن کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعرون مین نظم کر کے پچھلون کے لئے سند پیدا کی، لکھنؤ مین غالباً یہی پہلے شخص ہین جنھون نے سنہ ۱۲۵۶ھ مین اردو لغت ترتیب دیا، جس کا نام نفس اللغۃ ہے، سید انشاء اللہ خان کے دریاے لطافت کا دھارا بھی یہین بہا،

شیخ امداد علی بحر المتوفی سنہ ۱۳۰۰ھ کی نسبت بھی مشہور ہے کہ انھون نے کوئی لغت لکھا تھا مگر اس کا سراغ نہین ملتا،

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے، اُن شعرا مین ہین جنھون نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضعِ اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالا مال کیا ہے، سرمایۂ زبانِ اردو، مفید الشعراء، تنقیح اللغات، گلشنِ فیض اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابین ہین جو اردو زبان کا سرمایہ ہین، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر، امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر اُن کا بہت بڑا احسان ہے، افسوس ہے کہ اردو

کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصّے الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے، ان کے جلیل القدر شاگرد نواب فصاحت جنگ جلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ رامپور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو ہماری زبان کی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازار میں بھی مشتاقوں کی آنکھیں اس عروسِ فن کی دید سے محروم رہیں،

لکھنؤ نے شعروسخن کے ذریعے سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی محفلوں کی بار بار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں اور جو شہرت کی بنا پر زبان زدِ خاص و عام ہیں، مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گنانی ہیں جن کو اس دور کے قدردان بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں،

عہدِ جدید کی تابانی لکھنؤ کے افق میں

ہمارے ملک میں سات سمندر پار سے آکر جب اہلِ یورپ نے اپنے نئے علوم و فنون کی نمائش کی ہے تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا جب وہ عیش و مسرت کی شراب سے بدمست تھا، اس وقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دساور کی نئی چیزوں کی قدر کرے اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں جس پر اُن کو بڑا غرور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے، تاہم اس میخانے میں کچھ اہلِ ہوش بھی تھے، انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا، اور جو چیز اُن کے ہاں نہ تھی، وہ فرنگستان کی دوکانوں سے خرید کر لائے،

یہ سب کو معلوم ہے کہ خاص حالات نے سرکار اودھ اور سرکار کمپنی کو متحد کر دیا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی رزیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکار اودھ کا وکیل کلکتہ میں اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے دو عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلے

پیوند لگا، اس زمانے کے رزیڈنٹ اور انگریز حکام اردو اور فارسی مین پوری مہارت رکھتے تھے، نواب سعادت علی خان کے دربار مین بیلی صاحب رزیڈنٹ اور انشاء اللہ خان کی ادبی نوک جھونک کی حکایتین آبِ حیات کے ذریعہ مشہور عام ہین،

سرکار اودھ کی طرف سے وکالت اور انشاء کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے وہ عموماً اہل علم کے طبقے سے ہوتے تھے، انگریزون کے میل جول سے وہ بھی انگریزی علوم و فنون سے آشنا ہو جاتے تھے، اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم مین مہارت پیدا کر لیتے تھے، خان علامہ تفضل حسین خان ان ہی لوگون مین سے تھے، وہ گورہنے والے سیالکوٹ کے تھے، اور ریاضیات و متوسطات کی تعلیم دلی مین پائی لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ مین ملا حسن فرنگی محلی سے حاصل کی، پہلے نواب سعادت علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے ان کو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا، اس اثنا مین انھون نے انگریزی اور لاطینی زبانین سیکھین اور جدید ریاضیات و ہیئت کو حاصل کیا، نواب سعادت علی خان کے زمانے مین درس و تدریس اور تالیف و تصنیف کا مشغلہ جاری کیا، اور جدید علم ہیئت اور جبر و مقابلہ مین کئی کتابین تصنیف کین سنہ ۱۲۱۵ھ مین وفات پائی،

نواب محمد علی خان کے زمانے مین منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی، گو ان کے بزرگون کا وطن بریلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بنا لکھنؤ مین آئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کے ساتھ جدید ہیئت و ریاضیات مین بھی ماہر تھے، انگریزی سیکھی تھی حدائق النجوم ان کی مشہور تصنیف ہے جو سنہ ۱۲۵۳ھ مین تالیف پائی، نئے علم کے لیے نئی اصطلاحون کا وضع کرنا ان کا خاص کارنامہ سمجھا جاتا ہے، کہتے ہین :-

"باید دانست کہ چوں ایراد الفاظ یونانی و برطانیقی (انگریزی) بعینہ در کتاب فارسی و عربی مکروہ و غیر مانوس است، و کتب عرب یکسر بہ مذہب بطلیموس کہ فیما نحن فیہ اگرچہ بعضے مطابق با نسبت لیکن بسیارے مخالف ازاں و برخے مجدد کہ نشانے ازاں در تصانیف قدما پیدا نیست، ناچار بوضع بعضے از اصطلاحات جدیدہ یا تصرفے در تعریفات وجز آں چنانکہ عادت مترجمان قدیم ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم اقتفائے ایشان کردہ می گویم" (ص ۹)

ان ہی لوگوں میں ایک اور قابلِ ذکر ہستی رائے منون لال فلسفی کی ہے، ان کا وطن سندیلہ تھا فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری تصانیف کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہیئت اور حکمت انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے ۱۲۴۸ھ میں وفات پائی،

سرکار اودھ کی طرف سے جو علما وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، اُن میں سے دو نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی، اور مولوی محمد حسین لندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہلِ ملک کو آشنا کیا، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی مراد آباد کے رہنے والے تھے، نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے منطق کی بعض پرانی کتابوں پران کے حاشیے ہیں، ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، جس میں یورپ کے نئے علوم و فنون، جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے،

نواب نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان دو کے علاوہ دو اور صاحب قابلِ تذکرہ ہیں

مولوی عبدالرب اور مولوی کمال الدین حیدر لکھنؤ مین جو یورپین علما رہتے تھے، ان سے برابر ان کی ملاقاتین رہتی تھین اسی کا نتیجہ وہ رصدخانہ ہے جو سنہ ۱۲۴۷ھ مین شاہ نصیرالدین حیدر کے زمانے مین جنرل مکلاوڈ کی کوٹھی مین بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانے مین بنکر تیار ہوا، اس رصدخانے مین کرنل ولکاکس وغیرہ انگریز علما کے علاوہ مولوی عبدالرب صاحب، مولوی کمال الدین حیدر صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب مرادآبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس مین امپیریل بنک کی عمارت قائم ہے،

اب تک ملک مین جدید علوم وفنون کی اشاعت کی تاریخ مین لکھنؤ کا نام نہین لیا جاتا حالانکہ شاہانِ اودھ کے زمانے مین لکھنؤ مین بھی ایک دارالترجمہ قائم تھا، نئے علوم وفنون کی کتابین یہان ترجمہ ہوکر مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھین، اس محکمے کی طرف سے انیس رسالے چھپ کر شائع ہوئے تھے، جن مین سے دس رسالون کے نام ہمین معلوم ہین، ان کی تفصیل مین نے معارف سنہ ۱۹۱۹ء مین کی ہے، یہ ہیئت، کیمیا، مناظر اور طبعیات اور اس کے اقسام، قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا، علم الحرارت وغیرہ سائنس کے مختلف علوم پر ہین، لارڈ بروہم (BYOUGHAM) کی کتاب (A TREATISE ON THE OBJECTS, ADVANTAGES & PLEASURES OF SCIENCE) کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانے مین چھپا، اور یہ کے دفتر صیغۂ تاریخ مین میری نظر سے گذرا ہے،

لکھنؤ کی اس علمی وتعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا، اور اس کی ایک جنرل کمیٹی تھی جو کتابون کے ترجمہ واشاعت کا کام کرتی تھی، اور رصدخانۂ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجمون کی نگا

کرتا تھا، ایک انگریز نے اُردو مین فن زراعت پر کتاب لکھی تھی،

ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا پتہ چلایا جائے اُور آیندہ دلّی سوسائٹی، اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے۔ اسی عہد کی ایک کتاب اردو حساب مین لوگارتھم ہے، جس کا ایک نسخہ ہمارے ہان ہے،

لکھنؤ کی ادبیات لکھنؤ نے اس کے بعد زبان کی جو خدمتین انجام دی ہین افسوس ہے کہ ان کی کوئی مفصّل تاریخ موجود نہین، بادشاہون کے زمانے مین داستان گوئی کا ایک مستقل فن تھا، اور بڑے بڑے زباندان اور زبان آور، بادشاہون اور امیرون کے شبستانون مین بیٹھ کر اپنی دلچسپ داستانون سے بادشاہون اور امیرون کے دل بہلایا کرتے تھے، حکیم ضامن علی جلاؔل کے والد بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے، اخیر زمانے مین اس فن پہ کتابین بھی لکھی جانے لگین، اُس وقت کہانیون کے کردار، دیو، پریان اور جادوگر اور طلسم ساز ہوتے تھے، داستان امیر حمزہ، بوستان خیال نوشیروان نامہ، طلسم ہوش ربا، ایرج نامہ وغیرہ مختلف نامون سے ہزارون صفحات مین خیالی آفرینش اور زرد پریان کا ایک طلسم کھڑا کیا گیا، اس کتابی طلسم کا فتّاح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا شہر پیش نہین کرسکتا، ان کتابون کے مصنف جن کو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے، میر محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور تو تا رام شایاں وغیرہ ہین، یہ نظم و نثر کے ہزارون صفحات حق یہ ہے کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہین، نثر مین سرور کا فسانۂ عجائب، اور نظم مین نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویان وہ جواہر پارے ہین جن سے کبھی ادب اُردو کی الماریان سجائی جاتی تھین،

امانت کا اندر سبھا مدتون تک اہلِ شوق کا تماشاگاہ رہا ہے اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا بلکہ واقعی لکھنؤ مین اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا اور اس کا تماشا پردون کے ساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا، اور اس طرح اردو مین ان جدید تماشون اور ناٹکون کی تمدنی بدعت بھی یہین پیدا ہوئی ،

مین نے ہندوستانی ادب کی اس صنعت کی یہ تمہیدی تاریخ اس لئے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ قدیم و جدید سے مل کر ہماری زبان مین ناولون کی پیدائش کے لئے لکھنؤ ہی کی زمین کیون موزون ہوئی، جو شرر، سرشار، مرزا رسوا، سجاد حسین، مرزا مچھو بیگ اور جوالا پرشاد برق کی تخلیق کا باعث ہوئی، شرر نے قومی تاریخ اور اصلاحِ معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے رسم و رواج اور طور و طریق کو، اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص حلقے کے خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہین کہ انیسوین صدی کا اخیر عہد انہی کے دم قدم سے پر رونق تھا، لکھنؤ کے اس ادبی دور مین سرشار کی سیر کہسار اور فسانۂ آزاد، شرر کی فردوسِ برین، اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادبِ اردو کی بہترین کتابین ہین۔

مطبعے | آجکل ادبیات کے سلسلۂ تاریخ کی ایک کڑی مطبعے بھی ہین، لکھنؤ مین مطبع سلطانی کے علاوہ مطبع محمدیہ (۱۲۵۵ھ) بعہد محمد علی شاہ (محمد یعقوب)، مطبع علوی علی بخش خان (۱۲۶۳ھ)، مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خان (۱۲۶۰ھ، کانپور، ۱۲۶۳ھ)، مطبع محمدی محمد حسین لکھنوی (۱۲۶۲ھ)، مطبع جعفریہ حکیم مرزا جعفر خان (۱۲۶۵ھ)، مطبع احمدی محمد عباس، مطبع صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبعے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطبعے مطبع سلطانی سلطان المطابع کے قانون زیرِ نگرانی

تھے، لوح پر اسکے مہتمم کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خان بہادر قبول ثابت جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا، یہ نام اس عہد کی مطبوعہ کتابون پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے،

مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی مین معیار کے بلند درجے پر تھا، علما اور طلبہ اس کی چھپی ہوئی کتابون کے قدردان تھے، اور اب بھی اس کی چھپی ہوئی کتابین اہل شوق مین اشرفیون کے مول خریدی جاتی ہین،

سب سے آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی زندگی اب اسّی برس کے قریب پہنچ چکی ہے، اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور نولکشور پریس ہے، یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء مین قائم ہوا، اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم وفنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابین اس مطبع نے شائع کین انکا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہین کرسکتا، ہماری زبان کی اکثر ادبی اور علمی کتابین اسی مطبع سے چھپ کر نکلین شعرا کے دواوین، مثنویان، قصائد، مرثیے، قصے، افسانے، داستانین اور درس کی عام کتابین سب اسی کی کوششون کی ممنون ہین تاہم غلط نویسی اور غفلت جو کثرت کا نتیجہ ہے اس کی شہرت کے چہرے کا بدنما داغ ہے،

شعرائے قدیم میر، سودا، ناسخ، آتش، جرأت، مصحفی، انشا، رند، وزیر، صبا، انیس، دبیر، امیر، مونس، اسیر اور اثیر وغیرہ کے دیوان اور کلامون کے مجموعے، اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے اور ملک کے گوشے گوشے مین زبان کی اشاعت کا سبب بنے،

مطبع تیغ بہادر بھی صدی کے وسط مین ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ تھا،

اخبارات زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اخبارات ہین، ہمارا یہ شہر اس سلسلے مین بھی پیچھے نہین رہا،

یہ نہیں معلوم کہ یہان کا پہلا اردو اخبار کون ہے، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صوبے مین اردو کا پہلا روزانہ اخبار، اودھ اخبار یہین سے نکلا اور جو آج تک نکل رہا ہے، اس کے آغاز کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے، اور یہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبون کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے مین بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شرر دونون اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے،

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقیہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا، سید سجاد حسین جن کی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے، اس کے اڈیٹر تھے، یہ وہ اخبار ہے جس کے صفحات مین منشی احمد علی کسمنڈوی، منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین اور نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طور و طریق سے آگاہ تھے، روشناس ہوئے،

سنجیدہ اخبارون مین مشیر قیصر (مرتبہ مولوی غلام محمد خان تپش ۱۸۸۳ء) اور آئینہ اور آزاد ہفتہ وار اخبار بھی گذشتہ صدی کے ادیبون کی پیدوار مین معین ہوئے، آزاد آخر مین اودھ پنچ کا ضمیمہ ہو گیا تھا، یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا، سجاد حسین مرحوم بے کار ہو چکے تھے، اُس وقت اس آزاد کی چند ماہ تک کی اڈیٹری کا فرض چند دوستون کے ساتھ مل کر مین نے بھی ادا کیا تھا،

اردو کے سب سے پہلے آزاد سیاسی اخبار ہندوستانی نے بھی اسی شہر مین جنم لیا، گنگا پرشاد ورما اس کے اڈیٹر تھے، یہ اپنے زمانے مین کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولانا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگریسی خیال کے تھے، اس کو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے،

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد و سیاسی اخبار ہیں لیکن زمیندار کے بعد ۱۹۱۰ء میں اس صوبہ کا سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مسلم گزٹ بھی یہین سے نکلا جس کے اڈیٹر مرحوم وحید الدین سلیم اور اس کے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلیؒ تھے،

رسالے | رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہان کا سب سے پہلا ادبی رسالہ محشر ہے، جو مولوی عبدالحلیم شرر کا پہلا ادبی کارنامہ تھا، یہ ۱۸۸۲ء مین نکلکر دو سال کے بعد بند ہو گیا تھا، ۱۸۸۶ء مین شرر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا جو اپنے زمانہ مین جدید طرز تحریر کا بہترین معیار تھا یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک مین اردو کے بے شمار ادیب اور نثار پیدا کئے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریرون سے ہمارے نوجوانون مین پیدا ہوا،

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے منشی نثار حسین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک زمانے مین شوق کے ہاتھون سے لیا اور عزت کی آنکھون سے پڑھا جاتا تھا، اس مین اس عہد کے بڑے بڑے شعراء امیر، داغ، جلیل اور تسلیم وغیرہ اور اُن کے باکمال شاگردون کی غزلین چھپتی تھیں، یہ انیسوین صدی کے اواسط مین حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا جس کی باتون کو سُن کر خدا جانے کتنون کو عروسِ سخن کا شیدائی بننا پڑا، اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا،

اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے، جو حکیم محمد علی خان کی اڈیٹری مین ہردوئی سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریف سمجھنا چاہیئے حکیم صاحب ناول نویسی مین بھی اپنے وقت مین شہرت رکھتے تھے، اور ان کا قلم وقت کا سمان اور سینری دکھانے مین خاص ملکہ رکھتا تھا،

اوپر کے صفحون مین جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس شہر کی اُن انفرادی کوششون کا ذکر تھا جنھون نے اس زبان کو ملک مین مقبول اور ہردلعزیز بنا دیا لیکن اب جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے، انفرادی کوششون کے بجاے اجتماعی کوششون کی ضرورت ہے، اب ہر چیز اسی پانی سے نشو ونما پا رہی اور بڑھ رہی ہے، اسی لئے زبان کی ترقی مین بھی اب شخصی کوششون کے بجاے قوم کی یکجائی کوشش کی حاجت ہے، مین چاہتا تھا کہ ذرا تفصیل سے آگے کے کام کا نقشہ پیش کرون، مگر وقت کی کمی کا خیال کر کے اختصار کے ساتھ اپنا مدعا عرض کرتا ہون،

۱- ہم کو اپنا لٹریچر اس لئے ناچیز معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہمارے سامنے ہماری پچھلی کوششون کے ثمرے ایک جگہ نہین ہین، اس لئے ایک وسیع کتب خانے کا قیام نہایت ضروری ہے، اس غرض کے لئے مین یہ تحریک کرتا ہون کہ ہندوستانی اکیڈیمی اگر پورے ہندوستان مین نہین تو یوپی گورنمنٹ کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے آیندہ اسمبلی مین یہ تجویز پیش کرائے کہ برٹش میوزیم لائبریری کے اصول کے مطابق صوبہ یوپی کا ہر مطبع ہر کتاب کا ایک ایک نسخہ اس کے کتبخانے کے لئے کلکٹر ضلع کے دفتر مین پیش کرے،

۲- ہم کو ہندوستانی زبان کی ترقی کے لئے اس پرانے خیال کو دل سے نکال دینا چاہئے کہ یہ زبان فارسی یا سنسکرت سے پیدا ہوئی ہے یا وہ کسی بھاشا کا ضمیمہ ہے، بلکہ وہ خود ایک مستقل زبان ہے جس کے الفاظ خود اسی کے ہین، اور جس کے قواعد خود اسی کے ہین، یہ نکتہ ذہن مین نہ رہنے کے سبب ہم مین سے بعض صاحبون کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی لفظون کی صحت اور غلطی کی پہچان عربی، فارسی یا ہندی اور سنسکرت سے کرتے ہین، اسی اکیڈیمی کے ایک لائق

صدر نے ہندوستانی مین موت اور روح وغیرہ لفظون کو مؤنث مانتے ہین اس لئے شک کیا کہ اصل سنسکرت مین وہ مؤنث نہین، اسی طرح مین نے ایک دفعہ جب عربی "اثر" کی ہندوستانی جمع اثرات استعمال کی، تو الہ آباد کے میرے ایک لائق اور پرانے اہل قلم دوست نے اس لئے مجھے ٹوکا کہ عربی مین اُس کی جمع اثرات نہین بلکہ آثار ہے، حالانکہ ہماری زبان مین لفظ اثر کی یہ دو جمعین دو معنون مین آتی ہین، عربی مین آثار کے کچھ ہی معنی ہون مگر ہندوستانی مین اس کے معنی قرینے کے ہین، آثار یہ ہین، آثار یہ معلوم ہوتے ہین، اور اثرات کا لفظ نتیجے کے معنی رکھتا ہے، اس لئے ہمین ہندوستانی زبان کو مستقل زبان مان کر اس کی خودمختاری کا اعلان کر دینا چاہئے،

اسی طرح لفظ "اصل" کو دیکھئے جس کے معنی عربی مین جڑ کے ہین، اس کی جمع عربی مین اصول ہے، مگر اردو مین اصول ایک مفرد لفظ کی طرح قاعدے کے معنی مین بولا جاتا ہے، اور اس کی جمع اصولون بنائی جاتی ہے، خود "قاعدہ" کے عربی معنی بنیاد کے ہین، اس کی جمع قواعد ہماری زبان مین دو معنون مین آتی ہے جب اس کو جمع بولین تو اصول کے معنی مین اور مذکر اور جب مفرد بولین تو فوجی قواعد کے معنی مین وہ مفرد ہے اور مؤنث،

"مواد" کا لفظ "مادہ" کی جمع ہے، مادے کے لغوی معنی ہین پھیلنے والی چیز اور اصطلاحی معنی میٹر لیکن اب مواد کا لفظ ہماری زبان مین مفرد ہے، اور زخم کی آلایش کے معنون مین ہے، اور میٹر کے معنون مین کسی مضمون کے ضروری معلومات اور مسالے کے لیے بھی وہ بولا جاتا ہے،

خود "مسالے" کی اصلیت عربی مین مصالح ہے، اور وہ مصلح کی جمع ہے یعنی وہ چیزین جو کسی کھانے کی اصلاح کے لئے اس مین ملائی جائین، مگر اب وہ ہماری زبان مین مسالا لکھا جاتا ہے،

(م س ال ا) اور لکھا جانا چاہیے، اور اب وہ کھانے کے مسالے کے ساتھ ہر مضمون کا مسالا بن گیا ہے۔ عربی کا "مشتعل" ہماری زبان میں مشال بن گیا ہے،

ایسی ہی مثالیں ہندی سے بھی دیجا سکتی ہیں،

۳- آخری مثالوں میں یہ بات بھی ہمارے بزرگ کچھ کچھ قبول کر چکے ہیں کہ عربی میں کسی لفظ کی اصلیت کچھ ہو اور اس کا املا بھی کچھ ہو مگر ہماری زبان کے استعمال میں اگر اس کا تلفظ اور املا بدل گیا ہے تو وہی غلط تلفظ اور املا ہماری زبان میں صحیح ہوگا، اب جیسے ہم مصالح کو مسالا اور مشعل کو مشال لکھنے اور بولنے لگے ہیں بلکہ صحیح کو بھی ہم نے سہی کر لیا ہے، ذرہ زرہ اور طیار تیار ہو گیا ہے، تو کیا اسی قسم کی کمی بیشی ہم دوسرے لفظوں میں نہیں کر سکتے؟ فارسی والوں نے عربی کے مصدروں کے آخر میں سے ت کو نکال دیا ہے، مثلاً مدارۃ سے مدارا، محاباۃ سے محابا، یا تماشی کو تماشا، تجلی کو تجلا، یا اسم فاعل کے آخر سے ی کو گرا دیا، مثلاً محاذی کو محاذ کر دیا، اور اب ہم بھی محاذ بولتے ہیں، اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہندوستانی اُن میں تصرفات نہ کریں، جیسے جن مصدروں یا لفظوں کے آخر میں ع ہو ہم ہندوستانی اپنے ہندوستانی لہجے میں ان کو نہیں بولتے، تو اگر ان کو لکھنے میں بھی گرا دیا جائے تو برا کیا ہے؟ جیسے اطلاع کو اطلا، اجتماع کو اجتما، اتباع کو اتبا، نزاع کو نزا، انتزاع کو انتزا، مطلع کو مطلے اور متبع کو متبے وغیرہ،

۴- دلی اور لکھنؤ کے استادوں نے ہمارے لیے ایک اور مثال متروکات کی چھوڑ دی ہے یعنی بہت سے لفظوں کو ثقیل یا نامانوس سمجھ کر چھوڑ دیا یا ٹکسال باہر کر دیا ہے، جیسے تک، تئین، دکھلانا اور جتلانا وغیرہ، کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی ہم اس اصول سے کام نہ لیں، "نظ" کا لفظ مانند اور طرح

کے معنون مین پہلے بولتے تھے، مگر اب نہین بولتے، اس لئے عربی، فارسی اور سنسکرت کے ان موٹے موٹے لفظون کو جن کے کام مین لانے کی ضرورت سرے سے نہین اور وہ اسی لئے بولے یا لکھے گئے، کہ اُن سے اُن کے لکھنے اور بولنے والے کی لیاقت ظاہر ہو، ان کو اپنی ڈکشنری سے الگ کر دین، اور ان کو ٹکسال باہر سمجھین،

۵۔ ان موٹے موٹے نامانوس لفظون کے استعمال کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی ہے کہ بڑے بڑے اہلِ علم اور خصوصًا یورپ کے فاضل بہت سے معنون اور چیزون کے ٹھیٹ ہندوستانی لفظون سے واقف نہ تھے، یا نہین ہین، وہ اُن کی جگہ پر عربی و فارسی کے لفظ جیسے تقاطر امطار اور سیلان، ریحان، بد دستور بول کر اپنی ناواقفیت پر پردہ ڈالتے تھے، اور اب بھی ڈالتے ہین، اسی لئے یہ ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ایک ایسا لغت لکھا جائے جس مین عربی و فارسی کے مشکل لفظون کے مرادف ٹھیٹ ہندوستانی لفظ ہون، اس کام کو لکھنؤ اور دہلی کے اہلِ زبان بہتر کر سکتے ہین، اور پھر وہ لفظ پورے ملک مین پھیل سکتے ہین،

۶۔ اس قسم کا لغت نئی اصطلاحون کے بنانے مین بھی کام آسکتا ہے، آپ دیکھین کہ چھاپے کا فن بالکل نیا ہے، اُس کے سارے پرزے اور کام کی چیزین سب نئی ہین، مگر چونکہ یہ فن پڑھے لکھے اربابِ لغت کے ہاتھون مین نہین، بلکہ اَن پڑھ جاہلون کے ہاتھون مین رہا ہے، اس لئے انھون نے اس کے لئے کسی اکیڈمی کی طرف رجوع کئے بغیر سارے لفظ اور اصطلاحین بنا لین، جو سب کی سب ہندوستانی ہین، یا ہندوستانی کر لی گئی ہین جس کاغذ پر لکھا گیا وہ کاپی، اسکی غلطیان دیکھی گئین تو تصحیح، ان غلطیون کو کاتب نے درست لیا تو ترمیم، اس کی نقل پتھر پر سے اتار

گئی تو پروف، دوسری دفعہ اتارا گیا تو مطابق تیسری دفعہ دکھایا تو مطابق، چوتھی دفعہ دکھایا گیا تو مطابق، پتھر سے حروف اڑ گئے تو جھن گئے، کاپی کو گرم پتھر پر رکھ کر دبایا تو کاپی کو جمایا، کاپی کے حروف بگڑ گئے تو کچل گئے، غرض اسی طرح ان ان پڑھون نے اپنی ساری ضرورتین پوری کی ہین اور اصطلاح بنانے والون کے ہاتھ نہین دیکھتے رہے۔

۷۔ ہمارے ہندی کے دوستون کو شکایت ہے کہ ہم ہندی کے لفظ قصداً چھوڑتے ہین حالانکہ بات یہ نہین ہے، زبان کا سارا دارومدار لفظون کے چلن پر ہے، ہندو مسلمان آپس مین جتنا ملین گے اتنے ہی فارسی اور ہندی کے لفظ گھلین ملین گے، چنانچہ جب ہمارے بزرگ آپس مین خوب گھلے ملے تھے، دیکھئے کہ سینکڑون ہندی کے لفظ مسلمانون کی زبان پر، اور سینکڑون عربی فارسی کے لفظ ہندو منشیون کے قلم پر چڑھ گئے، ولی کے زمانے کی زبان دیکھیے، اس مین آج سے کتنے زیادہ ہندی لفظ ہماری زبان مین تھے، آج تو ہندوستانی مین فارسی عربی لفظون کی ملاوٹ کے گنہگار مسلمان ہین، مگر ہندو مسلمان دونون سے الگ سات سمندر پار کے ایک بے لاگ کی گواہی سنیے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ۱۹۲۹ء کے اڈیشن مین ہے:

"اردو کا یون شدید طور پر فارسیت آمیز ہو جانا ایرانی اثر سے زیادہ ہندی اثر سے تھا، اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے اسلامی تھا تاہم اس مین فارسی عنصر کو کثرت سے داخل کرنے والے اُن ایرانیون یا ایرانی نژاد لوگون سے زیادہ ہندو وثال تھے جو حکومت مغلیہ مین ملازم اور فارسی دان تھے، کیونکہ وہ (ایرانی اور مغل) صدیون سے اپنے علم و ادب کے لئے صرف اپنی ہی فارسی زبان استعمال کرتے آئے تھے۔" (ص ۷۰۵، جلد ۱۱)

لیکن یہ بھی اسی لئے ہوا کہ فارسی تعلیم یافتہ ہندو عمال بکثرت مسلمان افسرون سے ملتے جلتے تھے، تو ان کے لفظ ان کی زبانون پر چڑھ جاتے تھے، اسی طرح جو مسلمان صوفی، درویش اور عام لوگ بلکہ بادشاہ تک جو کثرت سے ہندوؤن سے ملتے تھے اُن کی زبانون پر ہندی الفاظ بڑی آسانی سے چڑھ گئے تھے، آئین اکبری اور فارسی کی دوسری مغل تاریخون اور صوفیون کے ابتدائی دکھنی اور گجراتی ہندوستانی کلام مین اس کی جھلک معلوم ہوتی ہے آج سے صدیون پہلے خواجہ صدرالدین من دھنگ مین کہتے ہین،

اک روپ تھے، کیون ہوے بہروپ	ہر روپ مین دیکھا نو کے روپ
جگ ہے تو یہ جگ دستا ہے سارا	جگ نہین تو سکل جگت اندھارا
جس جگ مین گیان کی اچھی جوت	اس جگ کو سمجھے کہ ہو وہ لا یوت

مین مثال کے طور پر کہتا ہون کہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۵ء تک ہندو مسلمان مل کر ایک سیاسی تحریک مین شریک تھے، ہر جگہ مل کر وہ ہر مجمع مین جسمین ہندو مسلمان دونون ہوتے تھے، تقریرین کرتے تھے، اس موقع پر اپنی تقریر کا اثر بڑھانے اور مجمع کو اچھی طرح سمجھانے کے لئے دونون قومون کے بانی اپڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے کہ اُن کی ہر بات دونون سمجھ جائین، اب ہندو مجبور ہوتے تھے کہ ترک موالات بولین اور مسلمان مجبور ہوتے تھے کہ اسہیوگ کہین، چنانچہ اس زمانے مین سوراج، نراج، سامراج، اندولن، پرتساؤ، چناؤ، راج نیتک، سبھاپتی، کرپا، شانتی، سماج اور پریم کے لفظ بے تکلف بڑے بڑے جبہ و دستار والے بولنے لگے تھے، ایسے ہی ہندو دوست عربی اور فارسی کے سیاسی لفظ بے اختیار استعمال کرنے لگے تھے،

٨۔ اسی لئے میری یہ تجویز ہے کہ ایسے آسان ہندی لفظون کا ایک لغت فارسی خط مین لکھا جائے اور اُن کے ہم معنی ہندوستانی لفظ لکھے جائین تاکہ وہ آسانی سے ہندوستانی مین شامل ہو سکین

٩۔ ہم کو ہندو دوستون سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ بھی ہندی کے بڑے بڑے لفظ بولنے سے بچین، مجھ کو ہندو دوستون کے ساتھ کبھی کبھی اُن کے جلسون مین جانا پڑا ہے، اور بعض بعض ایسے اناڑیون کی تقریرین سنی ہین کہ جن کا ایک لفظ بھی میری سمجھ مین نہین آیا ہے، اور اس پر مزہ یہ کہ اس تجویز کی تائید بھی میرے ذمے تھی،

ہندو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر اپنے مضمون کی ضرورت سے میرے پاس اکثر آتے رہے لیکن اگر انگریزی کا سہارا نہ ہوتا تو مین نہ اُن کی سمجھ سکتا تھا اور نہ وہ میری، کیا مجھ کو اور اُن کو کوئی ایک دیس کا رہنے والا سمجھ سکتا ہے؟ ہندی جس طرح سنسکرت سے کٹ چھنٹ کر بنی ہے، اسی طرح ہندی سے کٹ چھنٹ کر ہندوستانی بنی ہے، اب ہمارے ہندو دوستون کی یہ کوشش کہ پھر سے ہندی لفظ کو اسی روپ مین بولین جس مین وہ ٹھیٹ ہندی مین بولا گیا ہے ایک طرح کا بڑا ظلم ہے، مین ایک مثال دیتا ہون، لیکن کے معنی مین "پرنتو" ایک ہندی لفظ ہے، وہ اردو مین کٹ چھنٹ کر "پر" ہو گیا، اب اسی جگہ پرنتو بول کر بے پر کی اڑانی کہان تک درست ہے؟ ہر کلام مین "اور" کی ضرورت کتنی دفعہ ہوتی ہے، یہ "اور" ہندی کا لفظ ہے جس کو اردو نے قبول کر لیا ہے مگر اس لئے کہ یہ اردو مین چل گیا ہے، اس کو چھوڑ کر "تتھا" بولنا کہان تک اچھا ہے؟ "پانی" ہندی کا لفظ ہے اور فارسی والے اتنے پرانے زمانے سے اس سے مانوس ہین کہ سنائی (۵۴۵ھ) اور سعدی تک نے اپنی زبان اسی پانی سے سیراب کی ہین، مگر اب شفطی چھوت کے ڈر سے پانی

کا لفظ بھی آپ چھوڑ دیں اور جل پینے لگیں تو یہ کتنی بے گانگی ہے؟

۱۰- ہماری پرانی اُردو میں جب وہ دکھنی یا گوجری یا ہندی کہلاتی تھی، ہندی کے سیکڑوں پیارے اور میٹھے لفظ تھے جو اردو کے چلن سے بعض نفاست پسندوں نے نکال دیئے جیسے موہن، موہ، سجن، بچن، پریم، داس، ریت، اِس، رنگ، پریت، درپن، جگت، برہ، ٹک، مکھ پی، چھب، پیا، نٹ کھٹ (ادا)، سنسار، دیا، چرن، پتیم، ادھک (بہت) نڈرک (بے دھڑک) نگر، اُپاس، میا، (مروت)، نیٹ، درس (دیدار)، پربت، وغیرہ، ان لفظوں کو دوبارہ کام میں لانا چاہئے،

۱۱- اس سلسلے میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ لفظوں کے لینے اور نکالنے میں عربی و فارسی یا سنسکرت و ہندی کی ڈکشنریوں کو کسوٹی بنانا اور ان میں سے دیکھ دیکھ کر لفظوں کو چننا اور کام میں لانا ہماری مشترکہ ہندوستانی زبان کے حق میں زہر ہے، اس کی سچی کسوٹی رواج اور چلن ہے! آج جو لفظ عربی، فارسی، ترکی، ہندی، مرہٹی، گجراتی، پرتگالی اور انگریزی کے عام طور سے برتے جا رہے ہیں، وہ بحیثیت ہندوستانی لفظ ہیں، ان کو اسی تلفظ کے ساتھ بولنا چاہئے جس کے ساتھ وہ بولے جاتے ہیں، ہمارے نامور شاعر غالب نے نمبر کو لمبر باندھا،

مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

اس سے محاورہ بنا، لمبر لے جانا، لمبر چھیننا، لمبر لگانا،

"رپورٹ" انگریزی لفظ ہے، تھانے والوں کی زبان میں یہ "رپٹ" ہو گیا، اور اس کے خاص معنی ہو گئے، یہاں تک کہ لسان العصر اکبر نے کہا،

رپٹ لکھوائی ہے یارون نے جا جا کر یہ تھانے مین   کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے مین ؎

دوسرے انگریزی لفظون مین بھی اسی قسم کا تصرف کیا گیا ہے، اور وہی صحیح ہے، عربی و فارسی لفظون کا بھی یہی حال ہے، بلکہ خود عربی و فارسی زبانون کا قاعدہ بھی یہی ہے جس کو تعریب یا تفریس کہتے ہین، اسی اصول پر سنسکرت اور ہندی کے لفظ بھی جس شکل مین ہندوستانی بول مین آ گئے ہین اُن کو پھر سنسکرت اور ہندی کے اصلی روپ مین بولنے اور لکھنے کی کوشش بنی بنائی زبان کو بگاڑنا ہے، اور یہ کرنا ہے کہ دوسری قومین اُن کی بات کو نہ سمجھ سکین، اس کو آشا، برہمن کو برہمنٹر اور گُن کو گُنڑ لکھنا ادبی پاپ ہے،

عربی مین لفظ "شہوت" مطلق خواہش کے معنی مین ہے، جو کھانے پینے، مطالعہ کتاب ہر ایک کے ساتھ بولا جاتا ہے، مگر ہماری ہندوستانی مین ایک خاص معنی مین بولا جاتا ہے، اور اس سے "اشتہا" بنایا گیا ہے جو کھانے کی رغبت کو کہتے ہین، یہ بھی اس معنی مین عربی نہین مگر یہ دونون ہماری ہندوستانی کے لفظ ہین اور صحیح ہین،

عربی مین "مشکور" اس کو کہتے ہین جس کا شکریہ ادا کیا جائے، مگر ہماری زبان مین اس کو کہتے ہین جو کسی کا شکریہ ادا کرے اسی لئے "مشکور" کی جگہ بعض عربی کی قابلیت جتانے والے اس کو غلط سمجھ کر صحیح لفظ "شاکر" یا "متشکر" بولنا چاہتے ہین، مگر ان کی یہ اصلاح شکریہ کے ساتھ واپس کرنی چاہئے، خود لفظ "شکریہ" کو دیکھئے اصل عربی ہے، مگر شکل عربی نہین، اب اس سے ہم نے دو لفظ بنائے ہین، شکر اور شکریہ، خدا کا شکر ادا کرتے ہین، اور انسانون کا شکریہ، وہ ناشکرا ہے جو زبان کی اس توسیع کی نعمت کی قدر نہین کرنا چاہتا،

۱۲- ہمارے علم و فن کے ماہرون کی ایک خو ہے کہ وہ اپنے لئے کسی لفظ کو اس وقت تک علمی اصطلاح بننے کے قابل نہین سمجھتے جب تک اس مین بیگانہ پن اور موٹا پن نظر نہ آئے، مثلاً دو دریاؤن کا میل جہان ہو اس کے لئے ملتقی البحرین، یا دریا مین جہان پانی پینے کے لئے جگہ ہو اس کو مورد کہین گے، حالانکہ پہلے کو آسانی سے سنگم اور دوسرے کو پنگھٹ کہہ سکتے ہین، ڈائل کو دھوپ گھڑی کی جگہ ساعت شمسیہ یا دائرۂ ہندیہ کہنا ظلم ہے، ہمارے عوام نے ریل، جہاز، ہوائی جہاز، گھڑی، گھڑی کی سوئی، سینکڑون لفظ بنا لئے مگر ان کو قاموس دیکھنے کی ضرورت نہین ہوئی، ہم جانتے ہین کہ علمی اصطلاحات مین دقتین ہین، مگر یہ آسانی سے ممکن ہے کہ اصطلاحات مین جہانتک ہو غرابت سے بچا جائے

یہی حال ہندی کے بعض فاضلون کا ہے کہ انھون نے بھی نئی ضرورتون کے لئے سنسکرت اور ہندی کے شبد ساگر کا غوطہ لگایا موتی اور پتھر جو ان کے ہاتھ مین آگیا اس سے ایک مصنوعی زبان بنائی میرے ایک تعلیم یافتہ ہندو دوست نے بتایا کہ ہندی کے شاعر ڈکشنری دیکھ دیکھ کر لفظ چنتے ہین، اور ان کو شعر مین باندھتے ہین، اور کہنے کے بعد وہ خود بھی نہین سمجھتے ہین کہ ہم نے کیا کہا، غرض کہنا یہ ہے کہ ہم ہندوستانی زبان کے لفظون کے پرکھنے کی کسوٹی دوسری زبانون کی ڈکشنریون کی جگہ رواج اور چلن کو بنائین، چلتے ہوئے سکون کو قبول کرین اور کھوٹے کو پھینک دین،

آخر مین یہ کہنا ہے کہ اس ہندوستانی کو ہندو مسلمانون کی ایک زبان بنانے کیلئے ضروری ہے کہ دونون ملکر اس کو اپنائین اور جہانتک ہو سکے اس کو آسان اور سب کی سمجھ مین آنے والی بنانے کی کوشش کرین اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہندو مسلمانون مین آپس مین بات کرنا بھی محال ہو جائیگا، انگریزی کے سہارے یگانگت کا خیال پرائے مال کے بل پر دولتمند بننے کی آرزو ہے!!

ہماری زبان کا نام

یہ تقریر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں ۹ مارچ ۱۹۳۷ء کی رات کو اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں کیگئی

حضرات! قوموں اور زبانوں کی تاریخ ایک دن میں نہیں بنتی، ان کا خمیر اٹھتے، مزاج بنتے اور ایک صورت پکڑتے صدیاں لگتی ہیں،

آج ہم جس ملک کو اس آسانی سے "ہندوستان" کہدیتے ہیں، اور اس سے ہمالیہ کے دامن سے بحر شور کے ساحل تک کا علاقہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس کا نہ یہ نام تھا، اور نہ یہ اس کی وسعت تھی، اور نہ مسلمانوں سے پہلے اس ملک کا کوئی ایک ایسا نام تھا جو اس پورے ملک کو بتا سکے جو پنجاب کی سرحد سے شروع ہوکر بنگال مدراس اور بمبئی کے کناروں پر جاکر ختم ہوتا ہے، بلکہ انتہا یہ ہے کہ اس پوری قوم کے لئے بھی جس نے آج اپنے کو "ہندو" کے نام سے ایک قوم بنالیا ہے کوئی ایک نام نہ تھا، کہتے ہیں کہ اس ملک کے ایرانی ہمسایوں کی زبان میں اس ملک کا نام سندھو تھا، اور قدیم ایرانی اور سنسکرت زبانوں میں "س" اور "ہ" کا باہم مبادلہ ہوجاتا ہے، اس طرح سندھو ہندو ہوا، اس ملک کے دوسرے بحری ہمسائے

کی زبان مین دو لفظ تھے، السند والہند، کشمیر کی ترائی سے لے کر موجودہ سندھ کے کنارون تک کو وہ سندھ اور گجرات اور لار سے باقی اندرونی ملک کو وہ "ہند" کہتے تھے، اس ہند نے یورپ جاکر اند کی اور اند نے انڈیا کی صورت اختیار کرلی، ہندوالون کو عرب "ہندی"، اور خراسانی "ہندو" کہتے تھے، اور عرب ہندی کی جمع "ہنود" اور خراسانی "ہندوان" بناتے تھے،

مسلمان جب اس ملک مین آئے تو ان مین سے اہل عرب نے اس ملک کو ہند کا اور اہل خراسان نے ہندوستان کا نام دیا، لفظ ستان جگہ یا زمین کے لئے فارسی اور سنسکرت دونون مین بولتے ہین، اس لئے ہندوستان ہندواستھان بھی ہوسکتا تھا،

اس ملک مین جو بولی بولی جاتی تھی وہ بھی ایک نہ تھی، ہر صوبہ کی بولی الگ تھی لیکن مسلمانون نے یہان کی ہر بولی کا ایک ہی نام رکھا یعنی ہندی یا ہندیہ،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس سرزمین کا ایک نام ہند یا ہندستان اور یہان کی رہنے والی قومون کا ایک نام ہندو اور یہان کی مختلف زبانون کا ایک نام ہندی مسلمانون نے رکھا، اور حقیقت مین یہ مسلمانون ہی کی ذہنیت اور ذہانت تھی جس نے اس پوری سرزمین کو ایک ملک، اور یہان کے رہنے والون کو ایک قوم اور یہان کی بولیون کو ایک زبان سمجھنے کا تصور پیش کیا،

اس ملک مین عرب عربی، ایرانی فارسی اور ترک ترکی بولتے ہوئے آئے، مگر کچھ ہی دنون کے بعد یہان کے اصلی باشندون سے گھل مل کر تتلا تتلا کر یہین کی سی کوئی زبان بولنے لگے، جس کا نام انھون نے ہندی یا ہندوی رکھا، ورنہ ہندی نام کی کوئی زبان اس ملک مین ان کے آنے سے پہلے نہین بولی جاتی تھی، اس زبان نے ترقی شروع کی تو گجرات مین اسکو

گوجری، دکھن مین دکھنی، اور اودھ مین اودھی کہنے لگے لیکن صوبہ وار نامون کو چھوڑ کر پورے ملک کی اس ملی جلی بولی کا نام ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی بھی پکارا جانے لگا مین نے آج سے چند سال پہلے یہان "ہندوستان مین ہندوستانی" کے نام سے جو مقالہ پڑھا تھا، اس مین ہندوستانی نام کے پرانے تاریخی حوالے پیش کئے ہین ،

شاہجہان کے زمانہ مین جب دہلی شاہجہان آباد بنی تو شاہی قلعہ یا بازار کے لئے ترکی لفظ "اردو" اردوئے معلّی کی توصیفی ترکیب سے رواج پایا، اور صوبہ وار بنی دیسی بولیون کے لئے اس اردوئے معلّی کی شاہی بولی کا ڈھنگ اس زبان کی صحت اور صفائی کا معیار بنا، اور اس طرح اس نئی معیاری بولی کو اضافت کیساتھ "زبان اردوئے معلّی" کہنے لگے، اور آج سے کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے زبانِ اردوئے معلّی کی لمبی ترکیب کے بجائے "زبانِ اردو" یعنی اُردو کی زبان بنی، اور پھر اس سے بھی مختصر ہوکر "اردو" ہوئی ،

جب انگریزون کے اقبال کا ستارہ چمکا، تو فورٹ ولیم مین سیاست کے کھلاڑیون نے علم و دانش کے پانسے پھینکے، دوربینی سے ملک کی دو قومون کو جو ایک ہزار سال کی محنت اور جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھین جسکا تمدّن جس کی زبان، اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی، اس کو پھر دو قومون مین بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کئے جانے کی کوششین شروع کین اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو دو زبانین بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے منشی اور مولوی نوکر رکھکر دو زبانون کے لئے سامان درست کر لیا، ابھی اٹھارہوین صدی ختم بھی ہونے پائی تھی کہ فرنگی جادوگرون کے منتر سے اردو اور ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بنکر ملک کے طول و عرض

ہیں مرنے کٹنے لگے،

ہندو بھائیوں کے دلوں میں یہ خیال زور پکڑنے لگا کہ اب جب مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے وہ آزاد ہو چکے ہیں تو ہم کو اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہئے، اس بنا پر انگریزوں کی تفریق کی سیاسی تحریک بہت کارآمد ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملہ میں ظاہر ہوا، اور ہندی کے نام سے ایک زبان کی تبلیغ شروع ہوئی، اور بعض صوبوں میں یہ کیا گیا کہ اردو خط تک عدالتوں سے خارج کر دیا گیا، اور اب یہ تحریک یہاں تک زور پکڑ رہی ہے کہ یہ کوشش کیجا رہی ہے کہ اس صوبہ کے چند شاعروں نے جس بھاشا میں کچھ مذہبی نظمیں کہی لکھی تھیں وہی پورے ملک کی زبان بنا دی جائے،

لیکن اس کے برخلاف ملک کے بہت سے سمجھدار ہندو اور مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ہزار سال کی محنت میں جس زبان کو پیدا کیا اور بڑھایا اور یہاں تک پہنچایا وہی ہمارے دیس کی زبان، اور ہندو مسلمان دونوں قوموں کے میل ملاپ کی پہچان ہو،

بہرحال اب صورت یہ ہے کہ ملک کی اس زبان کی جگہ جس کو ہم بولتے ہیں، اور جس کو ہمارے بزرگ ہندی یا ہندوی کہتے تھے ہندو بھائی زبردستی اپنی ایک خاص زبان و خاص رسم الخط کو ہندی کہنے لگے اور اس نام کو اس زبان کے معنی میں اتنا انھوں نے برتا کہ وہ انہی کی چیز ہو گئی، اور مسلمانوں نے بھی غیرت کے مارے غیریت برتی، اور خوشی سے یہ نام ان کے حوالہ کر دیا، اور اپنی زبان کو پہچان کے لئے ہندی یا ہندوی کے بجائے اردو کہنے لگے اور اس طرح سارے ہندوستان کے میدان کو چھوڑ کر صرف اردوئے معلٰی کی چہار دیواری میں سمٹ کر رہ گئے،

یہ حالت دیکھ کر آج سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین ہال مین سب سے پہلے یہ تحریک پیش کی گئی کہ اس زبان کا نام "اردو" کے بجائے جو اٹھارہوین صدی کے خاتمہ کی ایجاد ہے، جب واقعی ہندوستان کی شاہی سمٹ کر اردوئے معلّی کے صحن و ایوان مین محدود ہو گئی تھی اس کو واقعی طور سے اس کے پرانے نام ہندوستانی سے یاد کیا جائے، جو اُس وقت کا نام ہے جب ہندوستان کی شہنشاہی سارے ملک ہندوستان مین پھیلی ہوئی تھی، تاکہ یہ زبان پورے ملک کی مملکت کا دعویٰ کر سکے،

مسلمانون کا یہ سمجھنا کہ یہ تجویز ہندوٴن کی خوشنودی کے لئے ہے، یا ہندوٴن کا یہ سمجھنا کہ یہ انکو دھوکا دینے کے لئے سازش کیجا رہی ہے بدگمانی کی انتہا ہے،

یہ تحریک خالص لسانی اصول و مبادی کی بناپر اٹھائی گئی ہے جس کے بہت سے سبب ہین مین ان مین سے ایک ایک کو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہون،

۱- اس زبان کے دو پرانے نام تاریخون مین ملتے ہین، زیادہ تر ہندی یا ہندوی اور اسکے بعد ہندوستانی، اب چونکہ ہندی کا نام ایک خاص زبان اور رسم الخط کے لئے بولا جانے لگا ہے اسلئے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو اس زبان کے لئے خاص کرنا چاہئے، جس کو اب غلطی سے عام طور سے "اردو" کہنے لگے ہین،

۲- دنیا کی ساری یا اکثر زبانون کے نام کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس قوم کی نسبت سے مشہور ہوتی ہے، جو اس کو بولتی ہے، یا اس ملک کی نسبت سے موسوم ہوتی ہے جس مین وہ بولی جاتی ہے، اسی اصول کی بناپر عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی، ترکستان کی زبان ترکی،

انگلستان کی انگلش فرانس کی فرنچ، جرمن قوم کی جرمن، ترکی قوم کی ترکی وغیرہ کہی جاتی ہے، اسی اصول کے مطابق اس زبان کو جو ہندوستان کے طول وعرض میں بولی جاتی ہے، ہندوستانی کا نام دینا چاہیے

۳- ایک شایستہ اور مہذب زبان کا خاصہ یہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے، جس کو اس زبان سے نسبت ہے، نہ یہ کہ زبان کا نام لینے کے بعد اس کے ساتھ ایک تاریخی یا تعریفی فقرہ اضافہ کیا جائے، جس سے اس کے جنم بھوم کی کہانی معلوم ہو، لفظ "اردو" سے اس قسم کی کوئی مدد ذہنِ انسانی کو نہیں ملتی، اس لئے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ہندوستانی کو رواج دینا چاہیئے،

۴- ہم کو اپنی بولی کا ایک ایسا نام رکھنا چاہیئے جس کے سننے کے ساتھ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ اس پورے ملک کی بولی ہے، لفظ اردو کے ساتھ اس قسم کا کوئی تصوّر ذہن میں نہیں آتا، برخلاف اس کے ہندوستانی نام بولنے کے ساتھ پورے ملک کا نقشہ ہمارے ذہن میں آجاتا ہے، اور اس کے پورے ملک کی بولی ہونے کا یقین منطق کی آمیزش کے بغیر، صرف نفسیاتی اثر سے ہمارے اور ہر سننے والے کے دل کے اندر پیدا ہو جاتا ہے،

۵- اس زبان کو ایک غیر متعلق بدیسی لفظ سے موسوم کرنے سے ہر اجنبی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ جیسا بدیسی نام ہے ویسی ہی بدیسی زبان بھی ہوگی، اور ہم کو اس کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک لمبی تقریر کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، یہ نقص ہندوستانی نام قبول کرنے سے فوراً دور ہو جاتا ہے،

۶- ہم کو اپنی زبان کے لئے ایک ایسا نام چاہیئے جس سے ملک کے ہر صوبہ کو برابر کی نسبت ہو

تاکہ ہر صوبہ اس کو اپنے وطن کی بولی سمجھنے اور قرار دینے کا برابر کا دعویٰ کر سکے، لفظ اُردو میں یہ بات نہیں، یہ بات ہندوستانی کو حاصل ہے، جس کی بنا پر صرف لکھنؤ اور دہلی ہی نہیں بلکہ مبئی، مدراس، لاہور، کلکتہ، پٹنہ، پشاور سب کو اس کی ملکیت کا حق پہنچتا ہے، اور سب کو اس میں یکساں ملکی اور وطنی محبت معلوم ہوتی ہے، اور کسی صوبہ میں وہ اجنبی اور بیگانہ نہیں قرار دیجا سکتی ہے،

۷۔ لفظ اردو میں ایک فوجی تسلط اور شخصی شہنشاہی کی تاریخ چھپی ہوئی ہے جس میں مرعوبیت کے سوا کوئی محبت کا جذبہ نمایاں نہیں ہوتا، اگر ہم اپنے پیارے ملک کی نسبت سے اس زبان کو پکاریں، تو اس نام سے ہر ہندوستانی کے دل میں وطنی محبت کا جذبہ ابھریگا،

۸۔ اس ملک کا نام ہندوستان مسلمانوں کے آنے کے بعد پڑا، اسی طرح یہ بولی بھی مسلمانوں کے اس ملک میں آنے اور اس ملک کے لوگوں سے میل جول پیدا ہونے کے بعد نکلی، اس لئے اس بولی کا نام ہندوستانی رکھنا مناسب ہے، تاکہ تاریخی مناسبت کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے برابر کے میل جول کی کہانی بھی ہم کو ہمیشہ یاد رہے،

۹۔ لفظ اردو سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مسلمان ترکستان و خراسان سے کوئی بولی لے کر یہاں آئے تھے جس کو وہ ترکی میں اردو کہتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ باہر سے آنے والے مسلمانوں کی زبانیں اور تھیں اور یہ وہ بولی ہے جس کو انھوں نے ہندوستان آکر اختیار کر لیا، یہ واقعہ اس بولی کو ہندوستانی کے اصلی اور صحیح نام سے پکارنے سے ساری دنیا کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، اور اس کے بدیسی پن کا بے وجہ شبہہ دور ہو جاتا ہے،

۱۰۔ اس زبان کو اردو کہنے کا نتیجہ یہ ہے کہ نا واقف گرامرین اس کی صرف و نحو کو عربی

فارسی کی صرف ونحو سے جانچکر اس کے اصول بنانے لگے، اور انھون نے اس غلط طریق وروش کی بنا پر بہت سی غلطیان کین اور اس کے جوڑون کو عربی وفارسی قاعدون سے جوڑنے لگے گو اب ہماری زبان کے نئے نحویون نے اس غلطی کو ہر طرح سے دور کرنے کی کوشش کی، مگر ابھی تک بات حلق سے نیچے نہین اتری ہے، اب اس کو عام طور سے ہندوستانی کہکر پکارنے سے اس زبان کی صرفی ونحوی اور لغوی تحقیقات کا رخ ایران وخراسان وترکستان کی طرف سے مڑکر ہندوستان کے صحیح قبلہ کی طرف ہوجائے گا، اور اس سے زبان کی اصولی ولغوی تحقیقات کی بہت سی راہین کھلین گی،

۱۱- اگر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ پورے ملک کی مشترک زبان ہے تو اس دعویٰ کی اس سے زیادہ مضبوط دلیل کوئی اور نہین ہوسکتی کہ اس کا نام ہندوستانی ہے، اس کے اس پرانے نام کو رفتہ رفتہ بھلا دینے سے غلط طور کی ہمدردی کرکے ہم نادانستہ اس کے دعویٰ کی بنیاد کھوکھلی کررہے ہین،

۱۲- چونکہ شروع شروع مین جو پرتگالی، یا اسپینی یا اور اگلے یورپین یہان آئے، بلکہ خود انگریزون نے بھی اس زبان کو صحیح طور سے ہندوستانی کہا تو ہم مین سے اکثرون کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ نام انگریزون کا بخشا ہوا ہے، حالانکہ اس زبان کا یہ نام ہم اپنے ہندوستانی کے مقالے مین بتا چکے ہین کہ بادشاہ نامہ اور تاریخ فرشتہ تک مین موجود ہے، فرشتہ مین عادل شاہ ثانی والی بیجاپور کے متعلق ہے کہ "تا بہ ہندوستانی متکلم نمی شد" شاہجہان کی درباری تاریخ بادشاہ نامہ مین ہے "نغمہ سرایان ہندوستانی زبان" تلاش سے اور بھی مثالین مل سکتی ہین، اس لئے یہ شبہہ دور ہوجانا چاہئے کہ اس زبان کا یہ نام فرنگیون نے رکھا ہے، بلکہ بعض

کرنا چاہئے کہ ہندی کے بعد ہماری زبان کا یہ وہ نام ہے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا، اور ہم کو بھی اس نام کو باقی رکھنا چاہئے،

۱۳- اہلِ نظر سے چھپا نہیں کہ اس زبان کی صحیح تاریخ کے سمجھنے میں میر امن دہلوی سے لیکر سر سید، بلکہ آزاد مرحوم تک جو غلط فہمی ہوئی کہ یہ لشکری بولی ہے یا بازاری جیسا کہ میر امن کا بیان ہے

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُنکر حضور میں جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی۔"

جب حضرت شاہجہان صاحب قران نے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شہر دہلی کو اپنا دار الخلافت بنایا، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہاں کے بازار کو اردوئے معلّیٰ خطاب دیا،

سر سید نے یہی حکایت شاہجہان کے عہد کی نسبت لکھی ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبانِ اردو کہا کرتے تھے اس غلطی کا سبب صرف لفظ اردو ہے، اس لئے اس نام کو باقی رکھنا اس غلط تاریخ کا باقی رکھنا ہے اور اس کی اصلی تاریخ کو جواب پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے، برباد کرنا ہے،

۱۴- بعض دوست کہتے ہیں کہ چونکہ نہرو رپورٹ اور پنڈت جواہر لال نے اپنی آپ بیتی میں "ہندوستانی زبان" کی اکثریت کو تسلیم کیا ہے اور اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی تجویز منظور ہوئی ہے، اور ان سب سے مراد "ہندی" ہند

ہے، اس لئے ہندی اور ہندوستانی ہم معنی لفظ ہوگئے ہیں، اس لئے ہم کو اس لفظ سے پرہیز کرنا چاہیے،

میری عرض یہ ہے کہ یہ تو مسلمانوں کی بے احساسی سے ایسا ہوا، شاہ عبدالقادر صاحب کے زمانہ تک اردو کا نام "ہندی" متعارف تھا، اور سرسید نے آثار الصنادید کے طبع اول میں اردو کے لئے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے، اور اسی کو ہندی کہتے تھے، ہندی والوں نے اس لفظ پر ایسا قبضہ کیا کہ آپ کو اس نام پر سے ملکیت کا دعویٰ اٹھا لینا پڑا، اب ایک لفظ "ہندوستانی" رہ گیا تھا، جو خالص طور پر اردو کے معنوں میں ہمیشہ استعمال ہوا ہے، اگر آپ اس کو بھی چھوڑ دینگے تو دوسروں کے قبضۂ مخالفانہ سے وہ ہرگز نہیں بچ سکتا، یہی وقت ہے کہ آپ معاملہ کی سنجیدگی کو سمجھیں، اور اپنے قبضہ سے خود ہاتھ اٹھا لینے کا گناہ نہ کریں، لیکن ہم اپنے بدگمان دوستوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے اصرار سے اور مسلمانوں ہی کی طفل تسلی کے لئے رکھا گیا ہے، اور اس سے مراد ہماری وہی زبان ہے جو ہماری عام بول چال میں ہے، ہم کو جو کچھ شکایت ہے وہ یہ ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کو ہم معنی اور مرادف کیوں ٹھہرایا گیا ہے، افسوس ہے کہ ایسے مسئلہ کو جو سراسر ادبی اور لسانی ہے، غلط طور سے سیاسی بنایا جارہا ہے، جذبات سے خالی ہوکر واقعات اور دلائل پر غور کرنا چاہئے اور وہ قدم اٹھانا چاہئے جو ہماری زبان کی حفاظت اور ترقی کا باعث ہو،

یہ تجویز کسی تحریک و تائید اور رائے شماری کی غرض سے نہیں پیش کیجارہی ہے، اور نہ اس طرح سے ادبی و لسانی مسئلوں کا فیصلہ ہوتا ہے، بلکہ جو کچھ ہمارے سامنے ہے وہ اپنی

زبان کی بھلائی اور ترقی کا خیال ہے، اس قسم کی تحریکین پیدا ہوتی ہین، پھر آہستہ آہستہ بڑھتی جاتی ہین، یہانتک کہ وہ راے عامہ کو متاثر کرلیتی ہین، اردو کا نام اردو کس ایک شخص یا نفر نے رکھا؟ یہ تو پہلے کسی کی زبان پر آیا، پھر بڑھتا اور پھیلتا گیا، یہانتک کہ سب پر چھا گیا، غور کیجئے کہ ابھی چند سال ہوئے کہ اس خیال کو کہ اردو کا موزون نام ہندوستانی ہے آپکے درمیان پیش کیا گیا، اور کبھی کبھی مضمونون مین ادھر اشارے کئے گئے، استنے پر یہ نام مدراس وغیرہ کے رسالون مین چھپنے لگا، اور کہین کہین اس کا چرچا ہونے لگا، یہانتک کہ آج اس کھلے اجلاس مین اس پر بحث تک نوبت پہنچ گئی، غرض ضرورت مباحثہ اور مناظرہ کی نہین ہے، بلکہ اسکی ضرورت ہے کہ جو اصحاب اس تجویز سے اتفاق رکھتے ہین وہ اپنی زبان اور قلم سے اس کا استعمال شروع کردین، اس سلسلہ مین ہماری مدد سب سے زیادہ اخبارون اور رسالون کے اڈیٹر کرسکتے ہین، امید ہے کہ وہ ادھر توجہ فرما کر اپنی زبان کے قدیم نام کو زندہ کرکے پچھلے سو برس کی غلطی کو دور کرین گے، اور ثابت کرین گے کہ ہندوستان کی عام زبان کا نام "ہندوستانی" ہی ہونا زیادہ موزون ہے، اور یہ وہی زبان ہے جو عام طور سے ہم ہندوستانیون کے بول چال مین ہی

یہ بھی صحیح نہین ہے کہ اردو کا علمی نام ہندوستانی رکھنے کی تحریک آج کل کی زبانی کشمکش کا نتیجہ ہے، بلکہ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اسی ناگپور مین جس مین ساہتیہ پرشد نے اپنا مشہور فیصلہ سنایا، آج سے چھبیس برس پہلے سنہ ۱۹۱۱ء کی مسلم لیگ کے اجلاس مین مرزا عزیز مرزا مرحوم نے ٹھیک یہی تحریک پیش کی تھی اور اس کے بعد ساہتیہ پرشد کے اجلاس سابق سے چند سال پہلے اسی یونیورسٹی کے یونین مین یہ تجویز دوبارہ پیش کی گئی تھی،

یہ سمجھنا بھی درست نہین کہ اس تجویز کے پیش کرنے والون کا یہ مقصد ہے کہ ہم اپنی زبان مین کوئی ایسی تبدیلی کرلین جس سے وہ ہندی، یا ہندی کے قریب بنجائے، حاشا وکلا اس قسم کی کوئی بات نہین ہے، بلکہ بعینہٖ اسی اردو اسی زبان، اسی بول چال کو جو ہم بولتی ہین ہم ہندوستانی کہتے ہین ہم کو اس سے بھی اختلاف نہیں کہ اس زبان کا گھریلو نام اردو باقی رہے، لیکن عمومی طور پر اسکے پرانے نام ہندوستانی ہی کو رواج دیا جائے، ہمارے بزرگون نے اس زبان کو دو قسمون مین تقسیم کیا تھا، ایک کا نام ریختہ جو غزل کی زبان تھی، اور دوسرے کا نام ہندی بتایا تھا، جو عام بول چال کی زبان تھی، ہندی کا لفظ چھن گیا، اب جو کچھ ہم چاہتے ہین وہ یہ ہے کہ آپ اسکے پرانے نام ہندی کی جگہ اس کے دوسرے پرانے نام ہندوستانی کو رواج دیجئے، خواہ اپنی غزلون کا نام ریختہ کی جگہ اُردو ہی رکھئے اس مین کچھ ہرج نہین، مگر اپنی علمی، تعلیمی، وطنی اور سیاسی تحریکات مین عام طور سے اس کو ہندوستانی کے صحیح نام سے یاد کرکے ثابت کیجئے کہ یہ پورے ملک ہندوستان کی زبان ہے، اور اس کا یہی نام اس کے پورے ملک کی زبان ہونے کی دلیل ہے۔

ہم اس فریب مین مبتلا نہین ہین کہ اس صحیح نام ہندوستانی کے رواج دے دینے سے ہماری زبان کی ساری مشکلین ختم ہوجائین گی، گویا یہ نام کوئی جادو کی چھڑی ہے جس کے گھوماتے ہی ساری بلائین دور ہوجائین گی، بلکہ ہم یہ سمجھتے ہین کہ آج جب ہم اپنی زبان کی اصلی پوزیشن کو دنیا پر واضح کرنے اور اس کے ہمہ گیر تخیل کو ثابت کرنے، اور اس کو سارے ملک کی زبان بنانے کا تہیہ کررہے ہین، تو ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کو اس کے اس نام سے روشناس کرائین جس سے اس کی اصلی حیثیت واضح ہوتی ہے، اور پورے ملک کی اس کے

اندر سمائی ہوتی ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس پورے ملک کی زبان ہے، اور جو اس پورے ملک کی زبان بننے کی مدعی ہو اس کا یہی نام ہونا چاہئے،

ہم کو امید ہے کہ اس زبان کے بہی خواہ اس تحریک کی تائید کرینگے، اور بحث و مناظرہ کے بجائے جو افسوس ہے کہ ہر مفید تحریک مین ہماری عادت ہو گئی ہے، عملاً اس کے رواج دینے کی کوشش کرینگے، تاکہ اس کا جو نام صرف خواص کو معلوم ہے وہی عوام مین پھیل جائے،

ابھی مولوی عبد الحق صاحب نے آپکے سامنے جو صدارتی خطبہ پڑھا ہے، اس مین انگریزی کے جتنے پرانے اقتباسات انھون نے پیش کئے ہین، آپنے خیال کیا ہوگا کہ ان مین ہر جگہ اس زبان کا نام یورپکے سیاحون تاجرون کمپنی کے حاکمون، اور لکھنے پڑھے ہندوستانیون کی زبان پر ہندوستانی ہی آیا ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اس کا اصلی نام پہلے یہی مشہور و معروف تھا جو اب عام طور سے متروک ہو رہا ہے، ہمارا مقصد اسی غلطی کی اصلاح اور اسی مرے ہوئے نام کو دوبارہ جلانا ہے،

ہماری زبان
بیسوین صدی مین

(یہ مضمون نومبر ۱۹۳۶ء مین ایک ادبی مجلس کی صدارتی تقریر کے طور پر لکھا گیا تھا)

ہمارے ادبی محققون نے اپنی زبان کی پرانی تاریخ کی تحقیق اور ترتیب مین جو کاوشین کی ہین وہ شکریہ کے قابل ہین لیکن ضرورت ہے کہ ہم ماضی اور مستقبل سے قطع نظر کرکے حال پر توجہ کرین۔ اس مین شک نہین کہ اس صدی کے آغاز سے لے کر آج تک ہماری زبان نے جو ترقی کی ہے، وہ کئی پچھلی صدیون کی ترقیون سے زیادہ ہے، کسی زندہ زبان کے جو اجزا اور عناصر آج سمجھے جاتے ہین یعنی اخبار رسالے، چھاپہ خانے، کتابین، کتبخانے، ان مین سے ہر ایک چیز کی حیثیت سے اس زبان نے اس حد تک ترقی کی ہے، جو مایوسی سے بالاتر اور تسلی کے قریب قریب ہے۔ پچھلی صدی کے خاتمہ اور اس نئی صدی کے شروع مین ملک والون مین اور خاصکر مسلمانون مین اس زبان کی ترقی کے وجوہ یہ نظر آتے ہین،

۱۔ سرسید کی تحریک،

۲۔ تعلیم کی عام اشاعت،

۳۔ مذہبی تحریکات،

۴۔ اُردو ہندی کے جھگڑے،

۵۔ سیاسی تحریکات،

۶۔ جامعۂ عثمانیہ کا قیام،

۷۔ قومی زبان کا تخیل،

۸۔ آمدورفت کی سہولت،

سرسید کی تحریک

سرسید کی علمی و تعلیمی تحریکات کا ایک اہم نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری زبان لکھنؤ اور دہلی کی قید سے باہر نکلی، ملک کے گوشہ گوشہ میں ہر لکھے پڑھے شخص کو اس زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی اجازت ملی، اور ہر جگہ اس کا چرچا پھیلا، نئی نئی کتابیں، جو صاف ستھری سادہ اردو میں لکھی جاتی تھیں وہ لوگوں میں اس زبان میں لکھنے پڑھنے کا ولولہ پیدا کرنے لگیں، اور ہر جگہ ان کی نقالی ہونے لگی کچھ دنوں کے بعد نقل نے اصل کی کیفیت پیدا کر لی،

ابتدائی تعلیم کی عام اشاعت

ابتدائی تعلیم کی زبان حکومت نے ملک کی زبان کو قرار دیا، اس لئے دیہات سے لے کر شہروں تک ابتدائی تعلیم کے جو مکتب اور اسکول کے درجے کھولے گئے، ان کے لئے نصاب کی کتابیں اردو میں لکھی اور لکھوائی گئیں، اور وہ بچوں کے نصاب میں داخل ہوئیں، اس سے زبان کی ترقی اور اشاعت کو بہت بڑی مدد ملی، اس

سلسلہ مین سب سے زیادہ کام پنجاب نے اور اس کے بعد صوبہ متحدہ نے کیا،

مذہبی تحریکات | اردو زبان کی اشاعت مین مذہبی تحریکات کو بہت بڑا دخل ہو، رد بدعت کی جو تحریک شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے اٹھی تھی، اس نے رفتہ رفتہ پورے ملک کو چھالیا، اسی کی خاطر قرآن وحدیث کے ترجمے ہوئے، عقائد پر کتابین لکھی گئین، رد بدعات پر رسالے تالیف ہوئے، اور توحید خالص کی اشاعت پر مسلسل تحریرین چھپتی رہین، اس سلسلہ کی پہلی کڑی شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمۂ قرآن، اور شاہ اسمٰعیل صاحب کی تقویۃ الایمان ہے، اور ان کے بعد ان کے ساتھیون اور ہمخیالون نے عوام کی درستی اور عوام تک پہنچنے کے لئے اسی زبان کو اپنی تحریکات کا ترجمان بنالیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہماری زبان مین ہر علم وفن سے زیادہ مذہبی علوم ومسائل کی کتابین ہین،

اردو ہندی کے جھگڑے | اردو اور ہندی کی لڑائی پچھلی صدی کے خاتمہ اور نئی صدی کے شروع مین شروع ہوئی، نئی صدی کا پہلا سال (۱۹۰۱ء) تھا کہ لکھنؤ کے پرانے گنگا پرشاد ورما لائبریری مین نواب محسن الملک کی صدارت مین اردو زبان کی حمایت کا جلسہ ہوا، اس وقت مرحوم نے اُردو کی طرف اشارہ کرکے یہ مصرع پڑھا تھا، ع

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے،

قضا کار کیا ہوا کہ اس دھوم دھام مین مردہ عاشق کفن پھاڑ تابوت سے نکل کر اُٹھ بیٹھا، اور آج وہ "عہد شباب" کی اس منزل مین ہو کہ ہم آپ اس وقت اس کی برات مین شامل ہین،

غرض اس اردو ہندی کے جھگڑے نے مسلمانون کو اس زبان کی حفاظت اور ترقی کی طرف

متوجہ ہونے پر مجبور کیا اور اس کے نتیجہ کے طور پر ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، اور ان ٹھوس علمی کاموں کا سلسلہ بڑھا اور پھیلا جو گذشتہ صدی میں صرف سرسید کی تعلیمی تحریک کے دائرہ میں محدود تھا۔

سیاسی تحریکات ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ملک میں جو مختلف سیاسی تحریکیں پھیلیں انھوں نے اس زبان کی اشاعت میں بہت بڑی مدد دی، جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم خلافت اور کانگریس کی یکے بعد دیگرے تحریکوں نے اخبارات کی اشاعت، روزانہ اخباروں کی پیداوار اور ملک کے صوبہ صوبہ میں جلسوں کی کثرت اردو بولنے والے رہنماؤں کی تقریریں اور ہر صوبہ کے ممبروں کے بار بار اجتماع اور جلسوں کے تو بر تو انعقاد نے اس زبان کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا، اور اردو کے بہتیرے مقرروں، محرروں اور قومی شاعروں کو پیدا کر دیا اور ترک موالات نے یہ سمجھا دیا کہ بدیسی زبان کو چھوڑ کر اپنی زبان اختیار کرنا ترقی کا راز ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کا قیام ہمارے ملک میں جب نئی تعلیم کا آغاز ہوا تو پہلے پہلے اردو ہی تعلیم کا ذریعہ بنی تھی، چنانچہ ۱۸۵۵ء سے پہلے ڈاکٹری کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی، دلی کالج وغیرہ قدیم و جدید طرز کے جو نئے مدرسے بنائے گئے تھے ان میں ریاضیات اور طبیعیات کی تعلیم بھی دیسی زبان میں دیجاتی تھی مگر دفعۃً انگریزوں نے تعلیم کا رخ بدل دیا، اور انگریزی کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا، اور انتہائی تعجب ہے کہ سائنٹفک سوسائٹی والے سرسید احمد خان نے بھی بالآخر یہی سمجھا اور سب کو سمجھایا کہ جدید علوم کا سمندر اردو کے کوزہ میں نہیں سما سکتا، یہ تخیل کچھ اس مضبوطی سے دلوں میں جم گیا کہ اسکول، کالج، یونیورسٹی اور جدید علوم و فنون کا تخیل انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں آتا ہی نہ تھا، یہ حالت ۱۹۱۶ء تک

قائم رہی، ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا گیا، جس میں تعلیم کا ذریعہ اردو ہو، اس تجویز کے بلند بانگ مدعیوں کو تو سب جانتے ہیں، مگر وہ خاموش ہستی جس کے دماغ میں یہ تجویز سب سے پہلے آئی، اور جس نے حیدرآباد کے ارباب بست و کشاد کو سمجھا کر اس کے عملدرآمد پر آمادہ کیا، اور اس کے ابتدائی مدارج میں اس کی رہنمائی کی، اس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور وہ مولانا حمید الدین صاحب مرحوم سابق صدر دار العلوم حیدرآباد دکن ہیں، اللہ کی رحمت اُن پر ہو، شروع شروع تو سب کو بڑا اچنبھا ہوا، مگر آہستہ آہستہ تعجب حیرت سے اور حیرت امکان سے اور امکان عمل سے بدل گیا، دار الترجمہ قائم ہوا، اور جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، ہزاروں اصطلاحات پیدا ہو گئے، سینکڑوں کتابیں ترجمہ ہوئیں، اور اب اس کا وجود مادری زبان میں تعلیم کے امکان اور فائدہ کی مستقل اور مجسم دلیل ہو گئی، دوسرے صوبوں پر بھی اس کا اثر پڑا، جامعات میں اردو کو مناسب جگہ ملنے لگی، اور دوسری یونیورسٹیوں میں بھی مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ آگے بڑھنے لگا

قومی زبان کا تخیل | جدید تعلیم اور قومی تحریکات کی ترقی نے یہ نکتہ بتا دیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں اور صوبوں کو ایک کرنے کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے، جو ہماری قومی زبان بن سکے، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اردو دہلی کی محدود زبان اب ہندوستانی بن کر ہندوستان کی عام زبان بن چکی ہے، ہندوؤں کا سنجیدہ طبقہ بھی اس زبان کو کم از کم پنجاب، یوپی اور بہار میں عملاً اپنی قومی زبان سمجھتا ہے، خواہ وہ اسکو کسی خط میں لکھتا ہو، اس تخیل نے ہماری زبان کی ترقی میں اچھی خاصی مدد کی اور دور دست صوبوں میں جہاں مقامی بولیاں بھی بولی جاتی ہیں، وہ قومی زبان کی حیثیت سے قبول کی جاتی ہے،

آمد و رفت کی سہولت | ہم نے اس زبان کی ترقی میں اس ایک اہم سبب کو اب تک بھلا دیا

جس کو پہلے بتانا چاہئے تھا، یعنی ملک کے دور دراز حصے آج ڈاک اور آمد و رفت کی سہولت کی بنا پر گھر آنگن بن گئے ہین، پنجاب کے لوگ بنگال، اور بنگال کے لوگ بہار اور یوپی مین، سندھی گجرات اور گجراتی سندھ مین آجا رہے ہین، ایک شخص پشاور سے کلکتہ اس طرح پہنچتا ہے، کہ اس کو صوبہ سرحد، پنجاب، متحدہ، بہار اور بنگال پانچ صوبے دو دن مین طے کرنے پڑتے ہین، ہر اسٹیشن پر اس کو اترنا چڑھنا، لینا دینا، ملنا جلنا، اور بولنا چالنا پڑتا ہے، اور اگر ہماری خوش قسمتی سے طرفین مین سے ایک یا دونون انگریزی کا کوئی حرف نہین جانتے تو یہی ہندوستانی اس سفر مین ان کی زندگی کا سہارا بنتی ہے، اور لازمی طور سے مشترک ہندوستانی زبان کی ترقی کا ہر قدم اس آمد و رفت کی سہولت سے ہر روز آگے بڑھ رہا ہے،

غرض یہ اسباب ہین جنھون نے ایک مشترک ہندوستانی زبان کے تخیل کو واقعہ بنا دیا ہے اور وہ بولی جو کبھی کسی ضرورت سے شروع ہوئی تھی، اب پورے ملک کی زبان ہو گئی ہے،

زبان کی ترقی کے اصول اور معیار

بیسوین صدی مین ہندوستانی نے جو ترقی کی ہے، اس کے جانچنے کا معیار ہمارے پاس یہ ہے کہ ہم دیکھین کہ وہ تعلیمی، اخباری، کتابون کی تعداد کی، جانچنے کی وسعت اور جغرافی پھیلاؤ کے لحاظ سے کہان تک بڑھی ہے، ذیل کے مضمون مین ہم اسی معیار پر اس زبان کی ترقی کو جانچتے ہین، اگر پورے اعداد و شمار کے موجود نہ ہونے کے سبب سے یہ روداد پوری مکمل نہین، تاہم یہ ادھورا بیان بھی اس قابل ہو کہ ہم اس کوشش کر اپنی مسرت کا اظہار کرین،

تعلیمی ترقی

اس مدت مین ہماری زبان دلی اور لکھنؤ کے حدود سے نکل کر ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچ گئی ہے، پشاور سے لے کر کلکتہ تک وہ بولی، اور سمجھی جاتی ہے، وہان کے اسکولون اور مکتبون

مین پڑھائی جاتی ہے، وہان کی یونیورسٹیون مین اس کی تعلیم دیجاتی ہے، اکثر کالجون مین اس کی ایک کرسی ہے، اور ایم اسے کے امتحانون مین اس کے ادبیات مین تکمیل کی سند دیجاتی ہے،

پنجاب یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی، کلکتہ یونیورسٹی، مدراس یونیورسٹی بمبئی یونیورسٹی، اور عثمانیہ یونیورسٹی مین اس کے پروفیسر مقرر ہین، اوران مین ایک مستقل زبان کی حیثیت سے اس کی تعلیم دیجاتی ہے، لیکن اس سلسلہ مین یہ تعجب کی بات ہے، کہ ابھی تک اس زبان کو ان ہی شہرون کی تعلیم گاہون مین اس اعتبار اور استناد کی عزت نہین ملی ہے جو اس زبان کے مولد و منشا ہین یعنی لکھنؤ، دلی اور آگرہ کی یونیورسٹیون مین اس کی یہ علمی حیثیت ابھی تک تسلیم نہین ہوئی ہے، اور اس موقع پر حضرت عیسیٰؑ کے اس فقرہ کی سچائی پر ایمان لانا پڑتا ہے، کہ "نبی بے عزت نہین مگر اپنے وطن مین"۔

کیا یہ سن کر حیرت نہ ہوگی، کہ جاپان مین مشرقی زبانون کی جو سرکاری درسگاہ ہے اس مین ہندوستانی کی تعلیم بھی باقاعدہ دی جاتی ہے، دلی کے نورالحسن برلاس صاحب اس کے پروفیسر ہین، ابھی علیگڈہ کی گذشتہ اردو کانفرنس کے موقع پر اس درسگاہ کے ایک جاپانی استاد پروفیسر گاموپہلی دفعہ ہندوستان آئے تھے اور علی گڈہ کی کانفرنس مین موجود تھے، اور اردو خاصی بولتے اور لکھتے تھے، روس مین بھی اس کی تعلیم کا اہتمام ہے، اور برانکوف صاحب نے اردو کے سلسلے لکھے ہین، لندن اور پیرس کی یونیورسٹیون مین بھی اس کی تعلیم کا بندوبست ہے، اس وقت گریہم بیلی صاحب لندن یونیورسٹی مین اس کے پروفیسر ہین، پیرس یونیورسٹی مین اس زبان کی پروفیسری بہت پرانے زمانہ سے ہے، ڈی تاسی صاحب کا نام ہماری زبان کی تاریخ مین نہایت ممتاز

ابھی جامع ازہر کے مصری وفد کی زبانی یہ خوشخبری بھی آپ کو مل چکی ہے، کہ عنقریب جامع ازہر میں ہندوستانی زبان سکھانے کے لئے ایک درجہ کھولا جائے گا لیکن ان سب سے زیادہ اس کی تعلیمی ترقی کی بلندی یہ ہے کہ دکن میں جو ایک معنی میں اس کا جنم بھوم ہے، اس کی پوری یونیورسٹی قائم ہے، جہاں ہر علم وفن کی تعلیم کا وہ تنہا ذریعہ ہے،

ہمارے عربی مدرسے جو خیبر کے دروں سے لے کر بحر ہند کے کناروں تک پھیلے ہیں ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہے، جس کو ان کے ہر دیس کا طالب علم یکساں سمجھتا ہے،

اردو کے مکتب اور ابتدائی مدرسے گاؤں اور دیہاتوں میں قائم ہیں لیکن یہ افسوس کے قابل ہے کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی طرف سے ان کو وہ امداد نہیں ملتی جس کے وہ مستحق ہیں، تاہم وہ اس زبان کے بولنے والوں کی ذاتی کوششوں سے جیسے تیسے چل رہے ہیں، مجھے مدراس کے بہت سے دور دراز قصبوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، جہاں یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ چھوٹے چھوٹے بچے خاصی اردو بولتے اور پڑھتے تھے، لاتور، وانمباڑی، عمرآباد اور ترچناپلی میں اردو زبان کے مدرسوں اور مکتبوں کا معائنہ کیا ہے، اور کامیاب پایا ہے، میسور میں بھی، اردو اسکول، اور اردو ٹریننگ کلاسز ہیں، مسلم یونیورسٹی نے ان کے لئے جن کی مادری زبان اردو نہیں، اردو کا کورس مقرر کیا ہے، اور وہ پڑھایا جاتا ہے،

ہندوستانی کی جغرافی وسعت | اس بیان سے آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی زبان پورے ملک میں کس طرح چھائی ہوئی ہے، مسلمان عالم اور واعظ جو عام طور سے یوپی دلی اور اس کے اطراف یا پنجاب کے ہوتے ہیں وہ بنگال، گجرات، کاٹھیاواڑ، بمبئی، سندھ، اور مدراس تک جاتے ہیں، وہ ہندوستانی

بولتے ہین، ان کی تقریرون اور وعظون مین ہزارہا لوگ شریک ہوتے ہین، اور مقرر و واعظین کی زبان کو اچھی طرح سمجھتے ہین، وہان کی عام اسلامی کانفرنسین اور انجمنین اسی زبان مین تجویزین لکھتی ہین، تقریرین کرتی ہین، اور رودادین چھاپتی ہین، سرحد کی پہاڑیون سے لے کر بحر ہند کے کنارون تک ہندوستانی کے اخبار اور رسالے چھاپے جاتے ہین، اور پڑھے جاتے ہین، ہندوستان کے ہر گوشہ مین مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے اور کہین بھی مجھے اپنی زبان کی بے زبانی کا اقرار کرنا نہین پڑا ہے،

ملک سے باہر جہان کہین بھی نکلا، سیاح کو اس زبان کے نقشِ قدم ملتے گئے، کابل گیا، تو وہان کے بادشاہ سے وزرا، علما، اور ادبا تک اس زبان مین بولتے یا سمجھتے ہوئے ملے، عراق، حجاز اور بیت المقدس (فلسطین) مین ہندی زائرون اور حاجیون کی آمد و رفت کے سبب سے اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے ہین، خصوصاً حجاز مین تمام دوسری اسلامی زبانون سے زیادہ یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، عدن مین نہ صرف یہ بولی جاتی ہے، بلکہ یہان ہندیون کے لئے ہندوستانی کے مکتب اور اسکول ہین، یمن کی ریاست مکلا مین ملاحون کی زبان سے اردو سنی، افریقہ کے ایطالوی مقبوضہ مصوّع مین اترا، تو گجراتی تاجرون سے ہندوستانی ہی مین بات چیت ہوئی، اسکندریہ کے بازار مین اس کے بولنے والے پائے، سوئز کے ملاحون کو کام چلاؤ اردو بڑی تیزی سے بولتے سنا، کیمبرج یا آکسفورڈ کی انڈین مجلس مین بھی جس مین ہندوستان کے ہر صوبہ کے ہندو، مسلمان، پارسی اور عیسائی طالب علم تھے، انگریزی کے بعد ہندوستانی ہی زبان عام اور مشترک زبان پائی اور اسی مین تقریر کی،

ادھر ایشیاے وسطی سے ایشیاے قصی تک اردو زبان کا سکہ چلتا ہے، ادھر بخارا، خیوا، قندھار، غزنی، کابل، سمرقند، بدخشان سے کاشغر تک اور ادھر چین، جاوا، ملایا، اور سنگاپور تک کے طالبعلم ہمارے عربی مدرسون مین تعلیم پاتے ہین، ندوہ لکھنو، دارالعلوم دیوبند، امینیہ دہلی، جامعہ ملیہ دہلی، مدرسۂ عبدالرب، دہلی، مدرسۂ عالیہ رامپور، اور جامعہ عربیہ ڈابھیل گجرات وغیرہ مین مختلف اسلامی ملکون کے باشندہ لڑکے پڑھتے ہین، اور یہان چند سال کے قیام مین ہندوستانی زبان اچھی طرح سیکھ لیتے ہین، اور اس کو تحفہ کے طور پر اپنے ملکون مین لیجاتے ہین،

ترکستان وخراسان وکابل کے طالب علم پہلے بھی ہندوستان کے عربی مدرسون مین پڑھنے آتے تھے، مگر چونکہ ان مدرسون مین ہندوستانی زبان کی ادبی تعلیم کا شوق نہ تھا، اس لیے وہان کے طالب علم بول چال کی زبان تو سیکھ لیتے تھے، مگر اس زبان مین لکھنے پڑھنے سے عاری رہتے تھے، لیکن دارالعلوم ندوہ، اور جامعہ ملیہ نے چونکہ تعلیمی مضامین مین اس کی اہمیت بھی رکھی ہے، اس لئے اس کے نتیجے سامنے ہین، ندوہ مین مولوی عبدالرحمن صاحب کاشغری نے اردو ضرب الامثال پر بہت سے مضامین لکھے ہین، اور مثل مادری زبان کے اس کو بولتے ہین، جامعہ مین چین کے بدرالدین نے اردو زبان ایسی سیکھی، کہ چین کے مسلمانون پر خود اپنے قلم سے کتاب لکھی ہے، اور جو دارالمصنفین مین چھپی ہے، ابھی میرے پاس ختن کے ایک ندوی طالبعلم کا خط آیا، جس کو پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی، ندوہ کے ایک جاوی طالب علم عدنان نے اتنی اردو سیکھ لی ہے کہ میرے رسالہ رسول وحدت کا جاوی مین ترجمہ کیا، اور اب خطبات مدراس کا ترجمہ کر رہا ہے، محمد حسن مالدیپی، مالدیپ کے رہنے والے ہین، ندوہ سے پچھلے سال فراغت

پائی، اردو خوب سیکھ لی، ابھی چند روز ہوئے مالدیپ سے ان کا اردو خط آیا، تو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، سوماترہ کا ایک نوجوان محمد صابر ندوہ مین ہے، جو ایسی اردو جانتا ہے کہ اردو کتابون اور رسالون کا ترجمہ اپنی زبان مین کر لیتا ہے،

ابھی ہمدرد و جامعہ دہلی مین ایک مضمون کے سلسلہ مین یہ اطلاع نکلی ہے:-

"جامعہ مین بہت سے غیر ملکیون نے اردو خوب سیکھی، ابھی چند سال پہلے جزیرہ مالدیپ کے ایک طالب علم محمد وحیدی یہان تھے، یا تو وہ اردو کا ایک حرف نہین جانتے تھے یا رنگین عبارتین لکھنے لگے، کالج مین ایک جاوی ہین، محمد عثمان سوید، وہ جماعت کا سارا کام اردو مین کرتے ہین، معاشیات، تاریخ، مدنیات وغیرہ مضامین خالص اردو مین لکھتے ہین اور بدرالدین چینی تو ان سب کے سردار ہین، . . . . . محمد بن عبدالقیوم افریقی بھی مدرسہ ابتدائی کے بڑے ہوشیار ہونہار طالب علم ہین، ان پر بھی یہ شبہ نہین ہو سکتا کہ وہ افریقی ہین"

(دسمبر ۳۶ء ص ۱۳)

گذشتہ علی گڈھ اردو کانفرنس کی صدارتی تقریر مین نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمایا تھا،

"جنوبی افریقہ سے حال مین ایک ڈیلیگیشن آیا تھا، ان سے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ جو ہندوستانی لوگ اس ملک مین آباد ہین، وہ ہندوستانی بولتے ہین، مارشس مین بھی ہندوستانی بولتے ہین"

مارشس کا مجھے بھی تھوڑا سا ذاتی تجربہ ہے ۱۹۲۰ء کی جولائی مین مین فرانس کی صحت گاہ ویشی مین تھا، مین فرانسیسی سے بالکل نابلد تھا، اتفاق دیکھئے کہ اس انجان شہر مین مجھے مارشس کے دو

ہندو طالب علم ملے، جو پیرس میں ڈاکٹری پڑھنے آئے تھے، ان کے مورث غدر کے زمانہ میں ہمارا شٹر سے بھاگ کر اس جزیرہ میں چلے گئے تھے، وہ اتنے دنون اور نسلون کے بعد بھی ہندوستانی زبان سمجھ لیتے تھے،

مارشیس میں اردو کے اسکول بھی ہیں اور علماء اور واعظ وہان جاکر اسی زبان میں تقریر کرتے ہیں یہی دوسرے جزائر ہند کا بھی حال ہے، رنگون ان اطراف میں اردو زبان کا مرکز بن رہا ہے، جہان کے بازارون میں ہندوستانی عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے اور وہان ہندوستانی کے اسکول اور کتب خانے قائم ہیں، برہما کے ایک ہندوستانی مضمون نگار (سکریٹری مسلم کمیٹی رنگون) کا یہ بیان دلچسپی سے سنا جائیگا،

"یہان کے اکثر شہرون اور خصوصاً رنگون کی شہری زبان اردو ہے کسی ملک کا رہنے والا ہو شہر میں داخل ہونے کے ساتھ اردو کا جاننا ضروری ہے، وہ ہر بازاری پیشہ کے لئے اردو ہی میں گفتگو کرسکتا ہے، اگر غیر ممالک کے لوگون خصوصاً ہندوستان کی ہر زبان بولنے والی قوم کا خلط ملط جس قدر برہما میں ہے، اس قدر ہندوستان کے کسی شہر میں آج تک نہ ہوسکا، اور یہی وجہ ہے کہ اسی ملک کی بدولت ہندوستان کے ان مقامات تک اردو پھیل گئی جہان شاید ایک عرصہ دراز تک پھیلانا سخت مشکل تھا، مدراس، کوکناڈا، ترچناپلی، ناگور وغیرہ جیسے مقامات کے لوگ برہما کی کثرت سے آمد و رفت کی وجہ سے اس قدر آسانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں کہ آج وہان کے جس دیہات میں چلے جایئے، عام طور پر اردو جاننے والے ملین گے، چٹاگانگ کی بہت بڑی آبادی جس کا برہما سے تعلق ہے، اردو سے مانوس ہے،

نہیں بلکہ اردو کی معاون و مددگار ہے، مالابار میں بھی اسی ملک کے بدولت اردو کی کافی اشاعت ہو چکی ہے...... یہاں چینی قوم بھی کثرت سے آباد ہے اس کا ایک ایک بچہ اردو جانتا ہے اور بولتا ہے یورپین ممالک کے لوگ بھی کثرت سے موجود ہیں، اور ہندوستانی ہی زبان میں بازاری کاروبار کرتے ہیں" (اجمل بمبئی یکم دسمبر ۱۹۳۶ء)

ہندوستان کے تین احاطے، مدراس، بنگال اور بمبئی ایسے ہیں، جہاں ہندوستانی زبان کے علاوہ صوبائی بھاشاؤں کا بھی چلن ہے، مگر یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ ان مقامی بولیوں کے ساتھ ساتھ ملک کی یہ مشترکہ زبان بھی ہر جگہ ترقی کرتی جاتی ہے، مجھے احاطۂ مدراس کے مختلف شہروں، مدراس، بنگلور، ترچناپلی، آمبور، میسور وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا، اور ہر جگہ اردو میں تقریریں ہوئیں، اور عموماً ہوتی ہی رہتی ہیں، اور وہ اچھی طرح سمجھی جاتی ہیں، اور شمالی ہند کے اردو اخبار رسالے اور تصنیفات وہاں پڑھی جاتی ہیں، بلگام جیسے دور دراز علاقہ میں جو مدراس اور بمبئی کی سرحد پر ہے، اردو کا رواج کافی ہے، اور اردو کے مدرسے اور کتب خانے قائم ہیں،

بمبئی جانے کا اتفاق ہر شخص کو ہوتا ہوگا، وہاں دیکھا گیا ہوگا، کہ صوبہ کی مختلف بولیوں مرہٹی، کنٹری اور گجراتی کے ساتھ بازاروں اور پبلک مقاموں پر ہندوستانی ہی کا قبضہ ہے، یہاں کارپوریشن کی طرف سے اکثر محلوں میں اردو کے میونسپل اسکول جاری ہیں، مہاراشٹر کے مرکزی شہر پونہ میں میرا دو سال قیام رہا، ہر جگہ نظر آیا کہ بازاروں میں اور مشترک مقاموں پر سمجھنے بوجھنے کا واحد ذریعہ اردو ہی ہے، یہاں اردو کا ایک ٹریننگ اسکول بھی ہے، اور اردو اسکولوں کے لئے الگ انسپکٹر بھی مقرر ہیں،

یہان پر اپنے قیام پونہ کا ایک لطیفہ یاد آیا، دکن کالج مین میرے شریک کار ایک مرہٹہ برہمن پروفیسر تھے، دوپہر کی راحت کے گھنٹہ مین ہم لوگ ایک ہی میز پر بیٹھ کر چائے پیتے تھے، ہمارے مرہٹہ پروفیسرون اور چپراسیون کی مادری زبان مرہٹی تھی، مگر جب ان پروفیسر صاحب کو چپراسیون پر غصہ آتا تھا تو اُردو مین آتا تھا، ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا مرہٹی بڑی پیاری زبان ہے اس مین غصہ کرتے نہین بنتا، اور اردو زبان "ملٹری لنگویج" ہے، اس مین غصہ کرتے خوب بنتا ہے

گجرات کے مسلمانون مین گجراتی کے ساتھ اردو زبان بھی بخوبی رواج پذیر ہے، اور گجراتی ہندو بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیتے ہین، گجرات کے عام شہرون مین بلکہ دیہاتون تک مین اردو لکھنے پڑھنے کا رواج ہے شہر بڑودہ، جوناگڑھ، مانگرول، بھروچ، احمدآباد، سورت، راندیر وغیرہ مقامات مین اور خصوصًا سورت اور اُس کے آس پاس مین ہندوستانی مادری زبان کی حیثیت رکھتی ہے یعنی باقاعدہ سیکھے بغیر اردو بولتے جانتے ہین، اور گھرون مین بولی جاتی ہے،

بنگال مین بنگالیون کی واحد زبان بنگالی ہے خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان، مگر ہر شخص جاکر دیکھ سکتا ہے، کہ بنگال کے دارالحکومت کلکتہ پر ہندوستانی کا قبضہ ہے، بنگال کے پرانے متمدن شہرون مرشدآباد اور ڈھاکہ مین اردو گویا مادری زبان ہے، چاٹگام مین ان سے کم مگر پھر بھی ہندوستانی زبان سمجھ لیجاتی ہے، بنگال مین عربی مدرسے بکثرت ہین، اور خیال کیا جاتا ہے کہ کم سے کم ساٹھ ہزار مسلمان طالب علم وہان عربی پڑھتے ہین، اور ان سب کی تعلیمی زبان ہندوستانی ہی ہے، ہم کو اس کا علم ہے کہ بنگالی مسلمانون کو بھی اپنی صوبائی زبان سے بہت محبت ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہندوستانی بولنے پر مجبور ہین، ہندوستان کے اکثر عربی مدرسون

مین بنگالی طالب علمون کا بڑا حصہ آیا کرتا ہے، اور یہین وہ چند سال رہ کر تعلیم پوری کرتا ہے اس کا اثر ہے کہ وہ گھر جا کر بھی اس کو نہین بھولتا، بنگال مین بہت سے اردو کے ایسے نامور شاعر اور ادیب ہین، جو کسی حیثیت سے اس صوبہ کے اردو شاعرون اور ادیبون سے کم نہین ہین

راجپوتانہ راجپوتانہ مین اجمیر کا شہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے، وہ سارے کا سارا اردو بولتا ہے، اس کی ریاستون کی سرکاری زبان اردو رہا کی ہے، وہان کے رہنے والے یا تو ٹھیٹھ ہندوستانی بولتے ہین، یا ایسی بولیان جو ہندوستانی سے بالکل ملتی جلتی ہین، اور دہلی کے اثر سے متاثر ہین، ٹونک کی مادری زبان اردو ہے، وہان کے نواب اور امرا اس زبان کے شاعر ہوئے ہین، وہان کے عام شرفا مین بھی اس زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب ہین،

دوسری ریاستون مین بھی ہماری زبان کا سکہ چلتا ہے، جے پور مین بھی یہ بولی جاتی ہے، ریاست کے محکمۂ تعلیمات نے تمام سرکاری اور امدادی مدرسون مین اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا ہے، مارواڑ وغیرہ مین جو مقامی بولیان ہین وہ ہندوستانی ہی کی ایک قسم ہین، گو لہجہ مین اس سے کڑی،

ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد اُردو کی جغرافی وسعت کے سمندر مین بہتے ہوئے خدا جانے ہم کہان سے کہان چلے آئے، کہنا تو یہ تھا کہ اُردو کی ترقی کا آغاز اس صدی کے آغاز کے ساتھ ہوا، اور سال کے ہر قدم کے ساتھ اس کا قدم آگے کو بڑھتا جاتا ہے، اس کے جانچنے کا سب سے آسان ذریعہ ہندوستانی بولنے والون اور سمجھنے والون کی تعداد پر سرسری نظر ڈالنا ہے،

نواب مہدی یار جنگ بہادر اردو کانفرنس علیگڈھ (۲۴-۲۵ ر اکتوبر ۱۹۳۶ء) کے صدارتی خطبہ مین فرماتے ہین،

"سائمن کمیشن رپورٹ کے دیباچہ مین ہے کہ ہندوستان کے باشندون کی سب سے بڑی تعداد ہندوستانی زبان بولتی ہے" (روداد مذکور صفحہ ۵۳)

انڈین نیشنل کانگریس کے محترم صدر، پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح عمری مین لکھا ہے،

"جہان تک ہندوستان کا تعلق ہے، مجھے صحیح اعداد تو یاد نہین پڑتے، لیکن میرا خیال ہے کہ اس زبان کی مختلف بولیون کے بولنے والون کی تعداد ۱۴ کروڑ سے کم نہین، اسکے علاوہ اس کے سمجھنے والون کی ایک بہت بڑی تعداد اور ہے، جو پورے ملک مین پھیلی ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی زبان کی ترقی کے لئے بڑے امکانات ہین، یہ سنسکرت زبان کی مستحکم بنیادون پر قائم ہے، اور فارسی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ دونون زبانون کے خزانون سے یہ مالا مال ہو سکتی ہے" (اردو ترجمہ ص ۲۹۹ ج ۳)

مدراس، بنگال اور بمبئی کی امید گاہین

ہندوستانی زبان کی رفتار ترقی کے لئے سب سے کٹھن منزلین بمبئی، مدراس اور بنگال کی ہین، بنگال مین ڈھاکہ یونیورسٹی، مدرسہ عالیہ کلکتہ، اور عربی کے دوسرے مدرسون کے ذریعہ سے یہ زبان اہل صوبہ کی مخالفت کے باوجود آگے بڑھ رہی ہے، بمبئی مین اسمٰعیل کالج ہندوستانی ادبیات کی ترقی کے لئے کوشان ہے، اور رفتار کامیاب نظر آرہی ہے، مدراس مین جامعہ دارالسلام عمر آباد سے بہت کچھ امیدین ہین، میسور مین بنگلور اردو کا خاص مرکز ہے۔

ابھی حال میں ملیبار میں ایک انجمن اصلاح اللسان کے قیام کی خبر ملی ہے، جو چھ سال سے ملیبار کے گیارہ لاکھ مسلمانوں کی قومی زبان، اردو بنانے کے لئے کوشاں ہے، اس انجمن کی کوششوں سے وہاں بچوں، نوجوانوں اور بوڑھوں میں اردو کا ذوق پیدا ہو چلا ہے، اور اب وہاں سے نارجلستان نام ایک ادبی رسالہ کی اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے[1]،

صوبۂ بہار | صوبہ بہار، اطراف دہلی اور یوپی کے بعد اردو کا تیسرا مرکز ہے، اور اردو یہاں کی مادری زبان ہے، تاہم اکثر صاحبوں کو یہ معلوم ہوگا، کہ گذشتہ صدی کے خاتمہ کے قریب اس زبان کا رسم الخط سرکاری عدالتوں سے خارج کر دیا گیا تھا، لوگوں کی کوششوں کے بعد آنریبل سر فخر الدین مرحوم کے عہدِ وزارت میں یہ حکم منسوخ ہوا، اور پٹنہ کمشنری میں اردو رسم الخط کی سرکاری اجازت حاصل ہو گئی، اس اجازت کا اس صوبہ میں اردو زبان کی ترقی پر بہت اچھا اثر پڑا، کئی اخبار اور رسالے نکلے، اور پبلک شوق بھی نمایاں ہوا، پچھلی عارضی وزارت میں بعض بنگال سے ملے ہوئے اضلاع کے علاوہ سارے صوبہ کو اردو خط کی اجازت مل گئی، کانگریس کی نئی وزارت نے بھی اس اجازت کو قائم رکھا ہے اور اب یہ صوبہ بھی بدستور سابق اردو کا گھر بن رہا ہے، اور ہندستانی زبان کو صوبہ کی قومی و تعلیمی زبان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں،

سرحد | صوبہ سرحد کی مادری زبان پشتو ہے، تاہم ہندوستانی وہاں کا ہر شہری باشندہ بولتا اور دیہاتی باشندہ سمجھتا ہے، پچھلے دنوں سر عبدالقیوم کی وزارت میں اردو رسم الخط اس صوبہ کا سرکاری خط قرار دیا گیا، ایک ادبی انجمن اور اسلامیہ کالج کی فضا اس زبان کی ترقی کے لئے سازگار ہے،

---

[1] اخبار قوم بنگلور، ۲۶ فروری ۱۹۳۷ء،

ابھی کوہاٹ مین ایک بزم اُردو کا قیام عمل مین آیا ہے جس کا مقصد اس صوبہ مین ہندوستانی زبان کی ترقی اور اشاعت ہے۔[۱]

زبان کی ترقی کے دوسرے معیار اُس زبان کے مطبوعات اور ادارے ہین مطبوعات مین اخبارات، رسالے اور تصنیفات ہین۔

اخبارات | پچھلی صدی کے خاتمہ پر ہندوستانی زبان کے ایک دو روزانہ اور دو تین سہ روزہ اخبارات تھے خیال آتا ہے، کہ اس زمانہ مین لاہور مین ایک روزانہ اخبار اخبار عام چھپتا تھا اور دوسرا لکھنؤ سے اودھ اخبار صدی کے خاتمہ پر غالباً سب سے پہلے پیسہ اخبار روزانہ ہوا اور سنہ ۱۹۱۰ء تک یہی حال رہا، بلقان کے سیاسی ہنگامون مین زمیندار روزانہ نکلنے لگا، اور اسی کے قریب مولانا محمد علی نے روزانہ ہمدرد کا اجرا کیا، اب آج میرے علم مین صرف لاہور سے اردو کے دس روزانہ اخبارات نکل رہے ہین، زمیندار، انقلاب، احسان، سیاست، ملاپ، پرتاپ، ویر بھارت، ہندو وغیرہ، دہلی سے چار ملت، وطن، وحدت اور تیج، لکھنؤ سے چار حقیقت، حق، اودھ اخبار، اور ہمدم، کلکتہ سے چار عصر جدید، روزانہ ہند، مسلم گزٹ اور الہلال، تیسرا بند ہوگیا، بمبئی سے پانچ خلافت، اجمل، ہلال، ہند، ہندوستان، اسلام، مدراس سے دو، قومی رپورٹ اور آزاد (آج کل شاید بند ہین) حیدرآباد سے چھ روزنامے، پیام، صحیفہ، رہبر دکن، مشیر دکن، صبح دکن، منشور، رنگون سے دو، تیج رنگون، اور حق، بدبہ اور پشاور سے آزاد، اور سرحد اور بنگلور ملک میسور سے نکلا، جو پہلے ہفتہ وار تھا، اب روزانہ ہوگیا

۱؎ احسان لاہور، مارچ سنہ ۳۲ء ص ۲،

ایک روزانہ اخبار سندھ سے شائع ہوتا ہے،

صدی کے خاتمہ پر سہ روزہ اخبار دو تھے، ایک مغرب مین، دوسرا مشرق مین مغرب مین وکیل امرتسر جس نے انشاء اللہ خان کی اڈیٹری مین روم و یونان کی جنگ مین کافی شہرت حاصل کی، مشرق مین ریاض الاخبار، گورکھپور مشہور شاعر ریاض کا اخبار اس کی ادبی حیثیت زیادہ نمایان تھی، اب اس وقت سہ روزہ اخبارات مین صداقت کشمیر، پیغام لاہور، وکیل امرتسر مدینہ بجنور، الامان دہلی، انصاری دہلی، الجمعیتہ دہلی، اتحاد پٹنہ مسلم پٹنہ، الہلال پٹنہ، آزاد پٹنہ ہین

صدی کے خاتمہ پر ہفتہ وار اخبارون مین پیسہ اخبار لاہور انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈہ، کرزن گزٹ دہلی، البشیر اٹاوہ، اودھ پنچ لکھنؤ، ہندوستانی لکھنؤ، نیر اعظم مرادآباد، ذوالقرنین بدایون، روہیل کھنڈ گزٹ بریلی، قہر تیمروزا (یوپی کے کسی شہر سے نکلتا تھا) اپنچ پٹنہ، اردو گائڈ کلکتہ، شمس الاخبار اور تخبر دکن مدراس،

صدی کے آغاز مین سب سے پہلا پرزور ہفتہ وار ۱۹۰۱ء مین انشاء اللہ خان کی اڈیٹری مین وطن نکلا جو ترکی، اور عام اسلامی دنیا کا نقیب اور سفیر تھا، ترکی کے دستوری انقلاب کے بعد اس کا وقار رفتہ رفتہ گھٹ گیا، اور آخر ہندوستان کے سیاسی انقلاب مین وہ مٹ گیا، اس کے بعد سیاسی ہفتہ وار اخبارات مین ۱۹۱۲ء مین مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ بڑے زور شور سے نکلے، بہرحال یہ ہفتہ وار اخبارات مین ترقی کی ابتدائی تاریخ ہے، اس وقت سے لے کر آج تک پشاور و کشمیر سے لے کر رنگون تک جگہ جگہ سے ہفتہ وار اخبارات اتنے نکل رہے ہین، کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے ہفتہ وار اخبارون مین خلافت، احسان، انقلاب

زمیندار، ملاپ، تیج، اجمل اور ہند کے ہفتہ وار ایڈیشن خوبی سے نکل رہے ہین، ہفتہ وار صحیفون مین دیوان سنگھ مفتون کا ریاست عام لوگون مین بہت مقبول ہے، بھوپال سے ندیم بمبئی سے صداقت، اور مصور، کلکتہ سے ہفتہ وار ہند، مدراس سے سہیل اور اب ملت بنگلور سے پہلے الکلام، اور اب قوم، رنگون سے میونسپل گزٹ اور کراچی سے بلوچستان جدید اور الحبیب اور ان کے علاوہ چھ اور ہفتہ وار اخبار نکل رہے ہین،

ابھی حال مین کشن گنج پورنیہ (بہار) سے ایک ہفتہ وار اخبار آئینہ نکلنے لگا ہے، یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء کو اس کا بارہوان نمبر چھپا ہے، ایبٹ آباد سرحد سے عزیز الملک نکلا ہے اور اکولہ صوبہ برار سے البرہان، ناگپور سے مسلم کشمیر سے النور بمبئی سے مختلف نامون کے ۱۳ ہفتہ وار اخبار

گذشتہ صدی کے اواخر مین ہندوستانی زبان کے اخبارات کی تعداد جو ممالک مغربی و شمالی اور پنجاب مین لکھنؤ سے لاہور تک چھپتے تھے، سو کے قریب تھی (رسالہ حسن حیدرآباد جلد پنجم نمبر ۱۲ ص ۱۱۴) اگر اس تعداد سے آج کے اخبارات کی تعداد کا موازنہ کیا جائے تو ہندوستانی زبان کی ترقی کا پورا حال معلوم ہوگا، چنانچہ اب سارے ہندوستان مین آٹھ سو بارہ اخبار اور رسالے اس زبان مین نکلتے ہین، جن مین سے ستاون روزنامہ اور تین سو بیالیس ہفتہ وار[1] ہین،

رسالے! ہندوستانی زبان کا سب سے پہلا ادبی رسالہ شرر کا دلگداز لکھنؤ ہے، جو سنہ ۱۸۸۷ء سے نکلنا شروع ہوا تھا، سب سے پہلا مذہبی و اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق سر سید احمد خان نے

---

[1] اخبار اجمل بمبئی ۷ جنوری سنہ ۱۹۳۸ء،

جو ۱۸۸۰ء سے ۱۹۰۶ یا ۱۹۰۵ء تک نکلا۔ سب سے پہلا علمی رسالہ مخزن الفوائد حیدرآباد دکن ہے جس کے اڈیٹر نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے، یہ ۱۸۷۴ء میں نکلا تھا، اور سب سے پہلا تحقیقی و تاریخی رسالہ حسن ہے، جو حیدرآباد میں ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک جاری رہا، نواب عماد نواز جنگ حسن بن عبد اللہ اس کے اڈیٹر تھے، اور ہر قسم کے علمی، ادبی، تاریخی اور اخلاقی مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ علی گڈہ کا معارف ہے جس کے اڈیٹر وحید الدین سلیم اور نواب محمد اسمٰعیل خان تھے، یہ ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۱ء تک نکلتا رہا،

پچھلی صدی کے یہی مایۂ ناز رسالے تھے، جو ملک کے مختلف گوشوں سے نکلے لیکن نئی صدی اپنے ساتھ بہت سے نئے ساز و سامان لائی، نئی تعلیم کی پود اب بڑھ کر جوان ہو چکی تھی، چنانچہ سب سے پہلے ۱۹۰۱ء میں (سر) شیخ عبد القادر کی اڈیٹری میں لاہور سے مخزن نکلا، آج کے ادھیڑ اور بوڑھے اس زمانہ کے نوجوان تھے، سر اقبال، میر نیرنگ، چودھری خوشی محمد ناظر، اعجاز حسین، علمدار حسین، سید حسرت، مولانا شروانی، سید علی محمد شاد وغیرہ اس کے مضمون نگار تھے، مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میری عمر کا سب سے پہلا مضمون "وقت" اسی میں شائع ہوا تھا، یہ پہلا رسالہ ہے جس نے نئی تعلیم کے نوجوانوں کو ملکی ادب کے کام میں لگایا، اس کے بعد ۱۹۰۳ء میں سید حسرت موہانی نے علی گڈہ سے اردوئے معلی نکالا جس میں ادبی اور سیاسی مضامین کی گنگا جمنی ہوتی تھی، اس زمانہ میں علی گڈہ منتھلی میگزین کو میر ولایت حسین اڈٹ کرتے تھے، اور وہ کالج کے بجائے ملک کا رسالہ تھا، نئے نوجوان اس میں مشق سخن کرتے تھے، ان کے نوآموزوں میں میرا نام بھی داخل ہے، ۱۹۰۳ء میں دکن کے افق سے مولوی ظفر علی خاں

کا دکن ریویو اور افسانہ طلوع ہوا، ۱۳۲۲ھ ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ سے الندوہ نکلا، جو روشن خیال علماء کا ارگن تھا، مولانا شبلیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن شروانی اس کے اڈیٹر تھے، ۱۹۰۴ء ہی میں زمانہ کا آغاز ہوا، جو منشی دیا نراین نگم کی اڈیٹری میں اب تک جاری ہے، منشی نوبت رائے نظر کا خدنگ نظر بھی ۱۹۰۴ء کی یادگار ہے،

اس کے بعد انڈین پریس الہ آباد سے ادیب ۱۹۰۸ء میں، لکھنؤ سے الناظر ۱۹۰۹ء میں لاہور سے ظفر علی خان کا پنجاب ریویو ۱۹۱۰ء میں لکھنؤ سے پیارے لال شاکر میرٹھی کا العصر ۱۹۱۱ء میں آگرہ سے دلگیر اکبرآبادی کا نقاد ۱۹۱۳ء میں حیدرآباد سے ہوش بلگرامی کا ذخیرہ ۱۹۱۵ء میں اعظم گڈھ سے معارف ۱۹۱۶ء میں چکبست کا صبح امید لکھنؤ سے ۱۹۱۸ء میں نکلا، اور اس کے بعد ملک کے مختلف گوشوں سے اردو کے جس کثرت سے رسالے نکلے ہیں، وہ آپ کے سامنے ہیں، اور جس کی وسعت پورے ملک کو محیط ہے، پنجاب میں ہمایون دہلی میں جامعہ، اور (شاید یوپی میں معارف بھی) ہماری زبان کے معیاری ماہوار رسالے ہیں اردو کا سب سے پہلا سہ ماہی رسالہ اردو جو انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا ارگن ہے ۱۹۲۱ء میں نکلا، جو خالص ادبی رسالہ اور اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے لئے مشہور ہے، دوسرا سہ ماہی اورینٹل کالج میگزین لاہور ۱۹۲۵ء سے نکل رہا ہے، جو مشرقی علوم و فنون و تاریخ پر محققانہ مضامین چھاپتا ہے، اور تیسرا سہ ماہی رسالہ ہندوستانی اکاڈمی کا ہندوستانی الہ آباد ہے جو ۱۹۳۱ء سے جاری ہے اور ہندوستانی زبان و ادبیات کی خدمت گذار ہے،

ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے بھی ماہوار رسالے نکلتے رہی

اور بند ہوتے رہے، مثلاً کلکتہ سے لسان الصدق (سنہ ۱۹۰۲ء) مولانا ابوالکلام کی اڈیٹری مین اور تنویر المشرق، اور ڈھاکہ سے جادو، جوناگڈہ سے زبان اور شہاب، پونا سے رفیق الطلبہ (انیگلو اردو ہائی اسکول پونا) مالیگاؤن ضلع ناسک صوبہ خاندیس سے بیدار اور اب (سنہ ۱۹۲۸ء) مین کشن گنج پورنیہ سے نہار نکلا ہے،

مدراس مین سفینہ اور بشری شہر مدراس سے کوثر بنگلور سے، اور مصحف عمرآباد شمالی ارکاٹ سے ابھی ان ہی سالون مین نکلے اور بند ہوئے، اب آمبور سے مینا نکلا ہے، اور مصحف عمرآباد سے دوبارہ نکلا ہے،

سفیر سخن پشاور سے، میزان الافکار، تنویر، زبان ہند اور ارمغان کراچی سندھ سے نخلستان ملتان سے، اور لالۂ صحرا بہاولپور سے سنہ ۳۰ء سے سنہ ۳۶ء تک نکلے، اور اب بمبئی کے افق سے صبح امید طلوع ہوا ہے،

ہندوستان سے باہر بھی کچھ رسالے اور اخبار اس زمانہ مین نکلے، جنمین سے نوائے کیمبرج اور نوائے وطن امریکہ ذکر کے قابل ہین،

زنانہ رسالے یہ وہ رسالے ہین جو ادب وعلم کی عام شاخون سے متعلق ہین لیکن صدی کے خاتمہ کے قریب ہی سے مخصوص رسالون کی اشاعت شروع ہوگئی، سنہ ۱۸۹۸ء مین مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم نے لاہور سے تہذیب نسوان جاری کیا، جو اب تک اسی شان سے نکل رہا ہے، یہ خاص لڑکیون اور عورتون کا ہفتہ وار اخبار ہے، اور مہینہ کی آخری اشاعت ایک خاص نمبر کی شان سے نکلتا ہے، سنہ ۱۹۰۶ء یا سنہ ۱۹۰۷ء مین علی گڈہ سے

خاتون نکلا جو ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم نسوان کا آرگن تھا، ۱۹۰۸ء مین مولنا راشد الخیری
صاحب نے عصمت جاری کیا، جو اب تک کامیابی سے نکل رہا ہے، بھوپال سے
ظل السلطان ہر ہائینس سلطان جہان بیگم مرحومہ کی زندگی بھر نکلتا رہا، اور اُن کے بعد بھی
کچھ دنون نکلا کیا، منشی محمد امین صاحب زبیری اس کے اڈیٹر تھے، ظل السلطان کے بعد ہما
کے نام سے زنانہ اخبار نکلنے لگا، مگر اب وہ بھی بند ہو چکا ہے،

چھپرا (بہار) سے زیب النساء اچھا رسالہ ۱۹۲۳ء مین نکلا تھا، پھر بہار (گوڑگانوان)
سے دوسرا رسالہ ۱۹۲۷ء مین عفت نکلا، دونون بند ہو گئے، پنجاب سے سہیلی اور نورجہان
دو اچھے رسالے نکلے تھے، مگر شاید بند ہو گئے، اب جالندھر سے مسلمہ کے نام سے مسلمان
عورتون کا مذہبی رسالہ، اور جوہر نسوان کے نام سے دلی سے ادبی اور اخلاقی رسالہ خوبی
سے نکل رہا ہے، کانپور سے مستورات، دہلی سے رہبر نسوان اور صدائے نسوان لاہور
سے لیلیٰ، اور نسوانی دنیا وغیرہ بہت سے رسالے نکلے لیکن شاید اپنی زندگی پوری کر چکے،

اب آجکل چار برس سے بمبئی سے خاتون نام زنانہ ہفتہ وار اخبار کامیابی کے ساتھ
نکل رہا ہے، منشی محبوب عالم (پیسہ اخبار) کی صاحبزادی فاطمہ خانم اس کی نگران ہین، ۱۹۳۷ء
مین خاتون سرحد کے نام سے پشاور سے ایک زنانہ رسالہ نکلا ہے،

بچون کے رسالے | یاد آتا ہے کہ اس صدی کے شروع مین سب سے پہلے منشی محبوب عالم
صاحب مرحوم نے پیسہ اخبار کے دفتر سے بچون کا اخبار نکالا اور وہ کچھ دنون چلا، پھر
تہذیب نسوان کے دفتر مین پھول کھلا جو اب تک عطر بیز ہے، بنات کے نام سے

دفتر عصمت سے بچون کے لئے رسالہ نکل رہا ہے، ہونہار، نونہال وغیرہ پرچے ہین، مگر ان سب کا مین کامیاب جامعہ ملیہ دہلی کا پیام تعلیم ہے،

الہ آباد سے بچون کی دنیا، بہار سے تربیت، دہلی سے بچہ نکلے، رنگون سے معصوم ۱۹۳۳ء مین نکلا "بچون کی دنیا" آج بھی الہ آباد مین ہے،

فنی رسالے | فنی رسالون مین سب سے زیادہ طب پر رسالے نکلے، اور اب تک نکل رہے ہین حامی صحت (۱۹۳۶ء) دہلی، تبصرۃ الاطبا لاہور، حاذق (۱۹۳۳ء) دہلی، معین الشفا لاہور، (۱۹۳۶ء) مسیحا رامپور ۱۹۳۶ء، ہومیوپیتھک میگزین لاہور، ڈاکٹر لاہور، طبی میگزین (۱۹۳۳ء) پٹنہ، حکیم دکن حیدرآباد ۱۹۳۲ء سے، طبیہ کالج میگزین علی گڈہ سے، اجمل میگزین بمبئی سے، شمس الاطبا لاہور سے، اور بہار صحت ۱۹۳۴ء سے دہلی سے اچھے نکل رہے ہین، اور اب دہلی ہی سے چشمۂ حیات نکلا ہے،

فن اقتصادیات پر ایک مخصوص رسالہ مالیات پٹنہ سے ۱۹۳۵ء مین نکلا، جامعہ دہلی بھی کچھ دنون تک اپنی اشاعتون کے تین نمبر اقتصادیات پر نکالتا رہا، اور اب وہ خالص اقتصادی و سیاسی رسالہ ہوگیا ہے، اور لاہور سے ۱۹۳۶ء مین اقتصادی دنیا شائع ہوا،

حیوانیات پر مسلم یونیورسٹی علی گڈہ کے شعبۂ حیوانیات کا رسالہ حیوانیات ۱۹۳۱ء مین نکلا تھا، مگر بہت کم زندہ رہا،

سائنس کے تمام متعلقہ علوم پر انجمن ترقی اردو کا مشہور سہ ماہی رسالہ سائنس خوبی

سے نکل رہا ہے،

تعلیمی رسالے بھی بہت سے نکلے اور بند ہوئے، اور بعض ایسے مقامات سے نکلے جو اردو کے مرکز سے دور ہیں، جیسے رفیق طلبہ (سنہ ۱۹۱۲ء) پونہ سے، طلبہ (سنہ ۱۹۳۵ء) پورنیہ (بہار) سے، بہارستان (سنہ ۱۹۳۶ء) امراوتی برار سے، اور مشعل (سنہ ۱۹۳۶ء) پشاور صوبہ سرحد سے، پھولچند ودیارتھی کا رہنمائے تعلیم لاہور اس سلسلہ کا پرانا رسالہ ہے، اس وقت تعلیمی رسالوں میں پنجاب ایجوکیشنل جرنل لاہور ممتاز ہے، یہ سنہ ۱۹۳۶ء سے نکل رہا ہے، اور شیخ نور الٰہی، پروفیسر ظفر اقبال اور پروفیسر گوپال داس اس کے اڈیٹر ہیں، حیدرآباد میں معلم اور اتالیق دو رسالے ہیں،

ادارے | صدی کے خاتمہ پر ہندوستانی زبان کا کوئی ادارہ قائم نہ تھا، انگریزوں کے بنائے ہوئے ادارے تو غدر کے طوفان میں بہ گئے، سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی بھی سیاسیات کی انجمنوں میں پھنسکر رہ گئی، صدی کے آغاز میں سنہ ۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، جس کے پہلے معتمد مولنا شبلی تھے، اس سے کتابوں کے ترجمے، اور بعض مستقل تصنیفیں شائع ہوئیں، سرکار آصفیہ نے اسی زمانہ میں سررشتہ علوم و فنون قائم کیا جس کے پہلے اور آخری معتمد مولنا شبلی تھے، اس کی طرف سے الکلام، علم الکلام، موازنہ انیس و دبیر، اور سوانح روم وغیرہ کتابیں لکھی گئیں،

سنہ ۱۹۱۴ء میں مولنا شبلی نے دار المصنفین کا خیال ظاہر کیا اور آخر نومبر سنہ ۱۹۱۴ء میں دار المصنفین کی بنیاد پڑی، سنہ ۱۹۱۷ء میں دار الترجمہ حیدرآباد قائم ہوا، سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریکات کے سلسلہ میں

جامعہ ملیہ کی بنا پڑی، اور اس کے ایک شعبہ کی حیثیت سے اردو اکاڈیمی قائم ہوئی ۱۹۲۷ء مین ہندوستانی اکاڈیمی کا قیام عمل مین آیا، اس کے بعد دائرۂ ادبیہ پشاور، انجمن ترقی اردو کراچی، انجمن ترقی اردو پٹنہ اور انجمن مذکور کی دوسری شاخین ہین، جنکی تعداد ۱۹۳۴ء کی روداد مین ۵۵ بتائی گئی ہے،

ستمبر ۱۹۳۷ء مین عمر آباد شمالی ارکاٹ (مدراس) مین ہندوستانی اکاڈیمی جنوبی ہند کی بنیاد پڑنے کی خبر آئی ہے، ملیبار مین بھی ایک انجمن بروے کار ہے،

ابھی ابھی (جنوری ۱۹۳۸ء) دہلی سے ندوۃ المصنفین کے نام سے ایک نئے علمی وادبی ادارہ کی بنیاد پڑنے کی خبر آئی ہے،

ان کے علاوہ ذاتی اور شخصی ادارے بھی قائم ہوئے، جیسے دائرۂ ادبیہ لکھنؤ، ایوان اشاعت گورکھپور، اردو مرکز لاہور، قومی کتب خانہ لاہور، کتابستان الہ آباد وغیرہ، ان سب نے ملکی ہندوستانی زبان کی ترقی واشاعت کی اہم خدمت انجام دی ہے،

دفتر عصمت دہلی اور دفتر تہذیب نسوان لاہور عورتون کے لئے اور جامعہ ملیہ بچون کے لئے مفید لٹریچر پیدا کر رہے ہین،

اردو کتابون کی تعداد افسوس ہے کہ اردو کتابون کا کوئی ایسا ذخیرہ ہمارے پاس موجود نہین اور نہ کوئی ایسی مکمل فہرست ہی جس سے شروع سے آج تک کی اردو کتابون کی تعداد کا ٹھیک پورا تخمینہ معلوم ہو سکے، ۱۹۲۳ء مین پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی نے الفہرست کے نام سے اردو کتابون کی جو فہرست حیدرآباد دکن سے شائع کی ہے، اس مین چھ ہزار اٹھ سو چھیانوے

مطبوعہ کتابوں کا اندراج ہے، اس کے بعد چودہ برسوں میں جو کچھ اضافہ ہوا ہے، وہ ظاہر ہے، ۱۹۲۷ء میں ہندوستانی ایکاڈیمی کے ایما سے پروفیسر ضامن علی صاحب (الٰہ آباد) نے اردو کتابوں کی پیدایش کی مختصر روداد شائع کی ہے، اس میں باجمال بلا نام سترہ ہزار نوسو ستانوے کتابوں کا شمار ظاہر کیا ہے، اس شمار پر بھی نواں برس گذر رہا ہے، اور عجب نہیں کہ بیس ہزار تک نمبر پہنچا ہو،

بہرحال پروفیسر سجاد مرزا بیگ مرحوم کی الفہرست کے اندراجات کے رو سے آج سے چودہ برس پہلے ان کے علم میں ہر علم و فن کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد یہ تھی،

۱- مذہبیات

قرآن پاک کے ترجمے	۷۳	دینیات اہل تشیع	۹
تجوید و قرأت	۲۴	فلسفۂ مذہب و کلام	۱۲۶
حدیث	۵۹	مذہب نصاریٰ	۴۶
فقہ اہل سنت	۹۹	مذہب ہنود	۹۸
فقہ اہل تشیع	۱۰	علم اخلاق	۱۸۸
دینیات اہل سنت	۶۶	اخلاق ہنود	۱۲۲
			۷۹۰

۲۔ علوم

حساب	۹۶	نقشہ جات	۳۰
جبرومقابلہ	۲۹	علم طبعیات	۶۰
مساحت	۴۶	علم برق	۲۰
علم مثلث	۱۵	علم کیمیا	۷
تراشہائے مخروطی وجرثقیل	۱۳	علم ہیئت	۳۴
علم تعمیرات	۱۷	طبقات الارض	۷
علم ہندسہ	۴۳	نباتات	۸۴
منطق	۳۵	حیوانات	۲۹
فلسفہ	۳۲	علم الابدان	۱۹
علم النفس	۲۵	طب	۷۶۶
مناظر	۱۲	ڈاکٹری	۹۰
موسیقی	۴۹	ہومیوپیتھک	۱۱
معاشیات	۳۲	علاج شمسی	۵
اجتماعیات	۵۹	بیدک	۵
جغرافیہ	۲۰۳	بیطاری	۴۴

حفظان صحت،	۳۲	قانون،	۱۵۵
			۱۹۰۴

۳- تواریخ

انساب،	۲۱	جنگ یورپ،	۷
عام تاریخ	۱۳	تاریخ مصر،	۱۳
تاریخ اسلام،	۶۴	ترکوں کی تاریخ،	۴۰
تاریخ عرب،	۲۰	تاریخ ایران،	۱۳
تاریخ اسپین،	۱۰	تاریخ افغانستان،	۱۱
تاریخ انگلستان	۲۴	تاریخ ہندوستان،	۹۶
تاریخ روس،	۲	تاریخ ہندوستان و برما و لنکا،	۱۵۰
تاریخ جاپان و چین،	۶	تاریخ کی متفرق کتابیں،	۳۶
یونان،	۷	سفرنامے،	۱۱۵
حالات اقوام،	۱۷		۶۶۵

۴- سوانح

سیر انبیاء	۳	سوانح بزرگان دین،	۳۰
میلاد و سیرت	۳۵	تذکرۃ الشہداء،	۳۹

حالاتِ اولیاء اللہ،	۱۹	تذکرۂ نسواں،	۴۹
احوالِ شہادت،	۹۲	تذکرۂ شعراء،	۴۱
عام سوانح عمریاں،	۵۱۷		۷۵۳

۵-ادبیات

قصے،	۳۰۰	ترکیب بند،	۴
ناول،	۴۷۰	واسوخت،	۱۶
ڈرامے،	۳۷	مرثیے،	۴۱
ادب،	۴۵	علمِ زبان،	۲۵
عروض و شاعری،	۴۷	لغت	۴۳
دیوانِ غزلیات،	۲۶۸	صرف و نحو اردو،	۵۵
نعت	۶۸	صرف و نحو عربی،	۲۰
مثنوی،	۸۷	صرف و نحو فارسی،	۳۳
نظم،	۶۸	لغت زبانہائے غیر،	۲۳
رباعیات	۷	انشاء،	۷۸
مجموعہائے نظم،	۱۱۰		۲۰۴۴

۶- متفرقات

قواعد فوج	۱۰	رمل ونجوم	۷۰
علم قیافہ	۱۳	شعبدے	۲۱
کھیل تماشے	۳۰	خوشنویسی	۲۷
			۴۲۵
مسمریزم	۱۳	تعلیم نسوان	۱۵۹
صنعت وحرفت	۱۲۴	فن تعلیم	۲۶
			۱۸۵
عملیات	۱۱۷	مجموعی میزان	۶۸۹۶

کتبخانے یہ امر افسوس کے قابل ہے کہ اردو کتابون کا کوئی خاص مرکزی کتب خانہ ابتک نہین، عموماً مشرقی کتب خانون کے ضمیمہ کی حیثیت سے اُن کا وجود ہے، میرے علم مین خالص اردو زبان کا سب سے پرانا کتب خانہ میرے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ مین کتب خانہ الاصلاح کے نام سے قائم ہے، یہ کتب خانہ ۱۸۹۹ء مین چند ناولون سے شروع ہوا، اور اب چھتیس برس کی پیہم کوششون سے اس مین خالص اردو زبان کی تین ہزار نو سو بارہ کتابین جمع ہین جن کی فن وار تعداد حسب ذیل ہے،

مذہب	۵۳۶	ادب نثر	۴۵۰
ادب نظم	۴۹۰	سوانح وسیر وتذکرہ	۴۰۰
ناول	۴۶۵	تاریخ وجغرافیہ	۳۸۰

تذکرۃ الشعراء و تاریخ اردو	۱۴۰	سائنس	۲۷
لغات و قواعد	۱۲۷	معاشیات و سیاسیات	۲۱
میلاد النبی نظم و نثر	۹۰	متفرق	
سفرنامے اور روزنامے	۵۰	مجلدات رسائل	۴۸۵
مطبوعات فورٹ ولیم کالج	۶۲	کشکول	۱۵۰
فلسفہ و منطق	۳۹	میزان	۳۹۱۲

یہ ایک حقیر انجمن کا کام ہے، اگر باقاعدہ کوشش کیجائے، تو تعداد اس سے بدرجہا زیادہ ہو سکتی ہے،

ہمارے ہان دار المصنفین مین اردو کتابون کی خریداری کا انتظام نہین تاہم اس کے باوجود جو سرمایہ جمع ہے، اس کی تفصیل یہ ہے،

۱- تفسیر	۳۱	۸- مناظرہ	۲۳
۲- علوم القرآن	۵۳	۹- تصوف	۴۴
۳- حدیث	۱۱	۱۰- سیرۃ نبوی	۷۴
۴- فقہ	۱۳۰	۱۱- سیر صحابہ	۳۳
۵- کلام و عقائد	۷۷	۱۲- طبقات	۸۳
۶- ردِ بدعت	۲۴	۱۳- سوانح	۱۱۵
۷- ترغیب و ترہیب	۴۳	۱۴- تاریخ	۲۵۱

١٥- تاریخ علوم وفنون	٦٣	٢٦- فلسفہ	٤٨
١٦- سفرنامے	٣٧	٢٧- طبعیات	٣٦
١٧- جغرافیہ	١٢	٢٨- کیمسٹری	١١
١٨- دواوین	٣٠٠	٢٩- علم سکون وحرکت	٩
١٩- ادب،	٩١	٣٠- ہندسہ وریاضی	٢٧
٢٠- مکاتیب	١٧	٣١- ہیئت	١١
٢١- عروض وقوافی	١٧	٣٢- طبقات الارض	٥
٢٢- لغت	١٣	٣٣- سیاسیات	٢٥
٢٣- افسانے	١٠٢	٣٤- معاشیات	١٩
٢٤- تعلیمات	٣٢	٣٥- طب	٥٨
٢٥- منطق	١٠	٣٦- مجلدات رسائل	٥٥٤
		میزان	٢٤٢٧

ہندوستانی ایکاڈیمی الہ آباد بھی اردو کتابون کا ذخیرہ فراہم کررہی ہے۔ اس وقت تک اس کے کتب خانہ مین اردو کی ٢٥٢١ کتابین جمع ہوئی ہین جن کی تفصیل یہ ہے،

مذہب	١٩٢	معاشرت	١٤
تاریخ مذاہب	٥٦	سیاسیات	٢٦
نعت	٤٧	اقتصادیات	٦
منطق وفلسفہ	٢٨	سیر وسیاحت	٤

تعلیم	۵	انتخاباتِ نظم	۹۴
معاشرتی تاریخ	۷	نقد وغیرہ	۷۶
گرامر	۷۳	ڈرامے	۱۶۵
سائنس	۲۲	ناول اور افسانے	۴۸۴
فلکیات	۷	مضامین	۱۰۴
ریاضی	۷	تقریرین	۳۱
طبقات ارض	۱	خطوط	۲۸
نباتات	۷	ادب	۱۰۰
حیوانات	۴	تمدن	۹
زراعت	۷	سفرنامے	۱۴
حفظانِ صحت	۲۰	سوانح	۱۶۵
دوادین	۲۵۲	تاریخ اقوام	۳
مرثیے	۳۶	تاریخِ ممالک	۶۷
مثنویات	۵۷	تاریخ وطبقات	۲۲۶
رباعیات	۸	میزان:-	۲۵۲۱
متفرقاتِ نظم	۶۶		

انجمن ترقی اردو کے سلسلہ مین انجمن مذکور سے اردو کے جو کتب خانے متعلق ہین، انکی

تعداد حسب ذیل ہے حیدرآباد دکن ۷، بنگال وآسام ۴، صوبہ متحدہ ۷، بہار واڑیسہ ۱۸، راجپوتانہ ۸، گجرات وکاٹھیاوار ۳، سندھ ۲۵، بمبئی ۲، سی پی ۱۶، دلی کے لالہ سری رام مصنف خمخانۂ جاوید کے پاس اردو شعر وادب اور تذکروں کا اچھا ذخیرہ تھا، اب وہ ہندو یونیورسٹی بنارس کی ملکیت ہے،

یورپ میں ہندوستانی زبان کی کتابوں اور کتب خانوں کا پتہ سب سے پہلے مسٹر نے پیش کیا، اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں جب مجھے پہلے پہل انڈیا آفس لائبریری کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ یہاں ہندوستانی زبان کا اتنا بڑا خزانہ جمع ہے جس کی فہرست تین سو صفحوں میں سمائی ہے اور اس میں ہندوستانی کی پرانی چھپی ہوئی کتابیں جنہیں بڑا سرمایہ غدر سے پہلے کے مطبوعات کا تھا موجود ہیں، سنہ ۱۹۲۰ء تک کی کل کتابوں کی مجموعی تعداد تو معلوم نہیں ہو سکی لیکن ان کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ سارے مطبوعات چھ عنوانوں علوم وفنون، تاریخ وجغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات اور متفرقات پر تقسیم ہیں، اور ان میں سے ہر ایک عنوان بیسیوں تحتی عنوانات پر مشتمل ہے، مثلاً علوم وفنون کے عنوان کے نیچے زراعت، صنعت وحرفت، ہیئت ونجوم، نیرنگ وطلسم، سپہ گری، انگریزی قانون، ہندو قانون، اسلامی قانون، منطق وفلسفہ، طب وتشریح، موسیقی، طبیعیات معاشیات، اجتماعیات وغیرہ ۲۴ بابوں پر، تاریخ وجغرافیہ کا عنوان، علم الانساب، عام تاریخ سوانح اور سفرنامے وغیرہ نو بابوں میں پھیلا ہے، اسی طرح ادبیات کا حصہ دواوین، افسانے تذکرے، خطوط وغیرہ ۱۴ بابوں پر، تعلیمی درسی کتابوں کا عنوان قواعد، ریاضیات وطبعیات

وغیرہ کے ۲۰ بابون پر، الہیات و دینیات کا عنوان، برہمنی و لامذہبی، بودھی، عیسائی، ہندو، جینی، اسلام، سکھ مت وغیرہ ۲۰ عنوانون پر بٹا ہوا ہے، متفرقات، تعلیمات، تعلیم نسوان، تعلیم صبیان، تقریرون کے مجموعون، ماہوار رسالون اور انجمنون کی روداددون اپنے ذیلی عنوانون پر منقسم ہے، ۱۹۲۶ء مین اس کتب خانہ کی ہندوستانی قلمی کتابون کی جو فہرست چھپی ہی اس مین ۲۶۹ قلمی نسخے درج ہین،

ہمارے دوست مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی نے یورپ کے اکثر کتب خانون کی سیر کرکے وہان کے قلمی نسخون پر ایک جامع کتاب لکھی ہے، اس مین ان کتب خانون کی فہرست دی ہی، جہان ہندوستانی کتابون کا ذخیرہ ان کو نظر آیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے،

کتب خانہ انڈیا آفس، کتب خانہ برٹش میوزیم، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، بوڈلین لائبریری اوکسفورڈ، کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی، کتب خانہ کنگ کالج کیمبرج، کتب خانہ کابر کالج کیمبرج، کتب خانہ کرائسٹ کالج کیمبرج، ایٹن کالج، کتب خانہ اڈنبرا یونیورسٹی، قومی کتب خانہ پیرس،

جاپان کے مشرقی زبانون کے مدرسہ مین بھی ہندوستانی کتابون کا نیا ذخیرہ ہے، کابل کی انجمن ادبی کے پاس بھی ان کا سرمایہ ہے، ابھی جب یہ سطرین لکھ رہا ہون، بدخشان کے کتبخانہ کے لئے ۲۵۰ ہندوستانی کتابین ہمارے یہان سے بھیجی جا رہی ہین، جو انجمن ترقی اردو اور دارالمصنفین کا عطیہ ہین،

ہندوستانی زبان کے مرکزون سے بہت دور دریاے شور کے کنارون پر بلگام احاطہ بمبئی مین کتب خانہ رزاقیہ کے نام سے جناب عبدالرزاق صاحب نے صرف اپنی ذاتی

محنت سے اردو کا ایک کتبخانہ فراہم کیا ہے، جس کو مین نے ۱۹۱۷ء مین دیکھا تھا، اس وقت اس مین دو ہزار ۹ سو چھتیس کتابین ہین، بڑی بڑی جلدون کی کتابون کو بھی ایک کتاب فرض کیا گیا ہے، جن کی فن وار فہرست یہ ہے،

۱- دینیات

قرآن مجید کے ترجمے	۱۳	اصولِ فقہ	۱
تجوید	۴	ضابطہ و قانون	۸
اوراد و وظائف	۱۴	ردِ فرق	۶۴
علوم القرآن	۱۵	عقائد	۱۵
تفاسیر	۲۱	مناظرہ و کلام	۱۳۸
احادیث	۲۰	تصوف	۳۰
فقہ حنفی	۴۵	مواعظ و خطب	۱۴
فتاوی	۱۰	کتبِ مذاہبِ عالم	۲۳
فرائض	۹		

۲- جغرافیہ

کتبِ جغرافیہ	۱۱	سفرنامے	۴۱
نقشے	۹		

۳۔ تاریخ

تاریخِ قدیم	۴	مستقبلِ اسلام	۴
تاریخِ مصر	۳	اندلس	۷
ایران	۷	مراکش	۲
یونان	۳	تونس وطرابلس	۲
روما	۱	افغانستان	۴
چین وجاپان	۴	تاریخ عام ہندوستان	۱۶
تاریخ قبل اسلام	۱۵	دکن ومہاراشٹر	۱۲
تاریخِ خلفار	۲۶	لکھنؤ وبھوپال وگجرات	۱۰
تاریخ تمدنِ اسلام	۹	تاریخ تمدن	۹
تاریخ فرقِ اسلام	۳	سیاسیاتِ ہند	۷۵

۴۔ سوانح

انبیار	۵	خواتینِ اسلام	۲۸
سیرۃ نبوی	۱۷	شاہانِ اسلام	۳۷
سیرِ رجال	۱۲۵	مشاہیرِ عالم	۴۶

خواتین عالم	۶	تذکرۂ شعرار	۱۷

۵۔ نظم و ادب

منظومات	۲۰۱	مباحث شعر و ادب	۲۲
دواوین شعراے قدیم	۶۰	قواعد و عروض	۲۸
شعراے جدید	۷۰	خطوط	۱۸
نعتیہ	۱۱	مقالات	۷۰
مثنویات	۱۵	لغات و محاورات	۵۲
مرثیے	۱۶		

۶۔ اخلاق و معاشرت

اخلاق قدیم و جدید	۶۲	معاشیات و اجتماعیات	۱۸

۷۔ نسائیات

عورتوں کی معاشرت	۳۵	خانہ داری	۴۲
زنانہ قصے	۵۲		

۸۔ علوم

فلسفہ و منطق،	۲۲	ریاضیات،	۸
سائنس اور فلکیات،	۴۴		

۹۔ قصص

پرانے قصے،	۱۹	ناول،	۲۲۰
افسانے،	۱۶	ڈرامے،	۲۸

۱۰۔ متفرقات

تقریریں،	۲۳	فہرستِ کتب،	۵
طب،	۶۰	درسیاتِ اردو،	۶۳
صنعت و حرفت،	۳۲	تعلیمیات،	۱۵
تجارت وغیرہ،	۸	رسائلِ مختصرہ،	۱۲۰
باورچی خانہ،	۸	سالانہ رودادیں،	۶۶
زراعت و باغبانی،	۲۲	ماہانہ رسائل،	۳۲۰

اسی احاطہ بمبئی مین اردو کی مطبوعہ کتابون کا ایک دوسرا کتب خانہ سنہ ۱۹۰۹ء مین بڑودہ مین نواب سید صدرالدین خان مرحوم کے پاس دیکھا، اب اُن کی وفات کے بعد جب سنہ ۱۹۳۱ء مین بڑودہ گیا، تو وہ جامع مسجد بڑودہ مین منتقل ہوگیا تھا، چنانچہ وہ اس وقت

بھی وہیں ہے، اُن کے صاحبزادہ سید معزالدین خان نے بتایا کہ اس میں چھ ہزار کتابیں ہیں تفصیل معلوم نہ ہوسکی،

دکن کے ایک دوسرے سرے پر یعنی بنگلور میں مسلم لائبریری ۲۵ برس سے قائم ہے مجھے اس کے دیکھنے کا اتفاق ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا، کتابوں کی تعداد معلوم نہیں،

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے پاس بھی اردو کا بڑا کتب خانہ ہے لیکن اس کی فہرست دریافت نہ ہو سکی، تاہم یہ معلوم ہے کہ قدیم اردو کتابوں کا قلمی سرمایہ اس کے پاس سب سے زیادہ ہے، اور جن کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے، ہمارے دوست ڈاکٹر سید حفیظ صاحب (الہ آباد) کے پاس بھی قدیم اردو کی کچھ قلمی کتابیں ہیں،

دلی میں لالہ سری رام انجمانی کا کتب خانہ جسمیں قلمی دیوان اور تذکرے تھے، اب ہندو یونیورسٹی بنارس کی ملکیت ہے،

اہم تصنیفات ان اداروں کے ذریعے اور مختلف ذاتی کوششوں سے ہندوستانی زبان میں ہر سال مفید تصنیفات کا سلسلہ اتنا آگے کو بڑھ رہا ہے، جو اگر شکر کے لائق نہیں تو شکوہ کے لائق بھی نہیں، معارف کے چند سال کی تنقیدات سے ان کی سالانہ فہرست یہ ہاتھ آئی ہے، جو ظاہر ہے کہ اصلی تعداد سے بہت کم ہے،

سنہ	کتابیں	رسالے	میزان
سنہ ۱۹۳۱ء	۷۳	۳۲	۱۰۵
سنہ ۱۹۳۲ء	۱۱۱	۱۸	۱۲۹

سنہ	کتابیں	رسالے	میزان
سنہ ۱۹۳۳ء	۹۰	۳۰	۹۰
سنہ ۱۹۳۴ء	۱۳۹	۴۵	۱۸۴
سنہ ۱۹۳۵ء	۱۴۷	۳۵	۱۸۲
سنہ ۱۹۳۶ء	۹۵	۳۸	۱۳۳

یہ ایک رسالہ کی تنقیدات کی تعداد ہے،

بہر حال اس وقت ہندوستانی زبان کا سب سے بڑا تصنیفی ادارہ سررشتۂ تالیف وترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہے، یہ ادارہ سنہ ۱۹۱۷ء سے کام میں مشغول ہے، اس وقت تک مختلف علوم وفنون کی ۲۳۶ کتابیں اس نے شائع کی ہیں، ۶۲ کتابیں زیر طبع ہیں اور ۱۰۵ کتابیں زیر ترجمہ وتالیف ہیں، اور ۱۱۹ کتابیں زیر تجویز ہیں، ان کی فن وار فہرست درج ذیل ہے،

فہرست کتب دارالترجمہ حیدرآباد دکن

تا نومبر سنہ ۱۹۳۶ء

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۱	مصطلحات	۰	۰	۱
۲	تاریخ ہند	۳۳	۶	۱۵

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۳	تاریخِ یورپ	۱۱	۱	۰
۴	تاریخِ انگلستان	۶	۱	۱
۵	تاریخِ یونان	۸	۰	۰
۶	تاریخِ روما	۸	۰	۰
۷	تاریخِ اسلام	۱۸	۰	۲۵
۸	جغرافیہ	۵	۰	۰
۹	سیاسیات،	۷	۱	۷
۱۰	دستورِ انگلستان،	۳	۱	۰
۱۱	معاشیات	۹	۴	۵
۱۲	عمرانیات،	۲	۰	۰
۱۳	منطق	۴	۰	۰
۱۴	نفسیات	۱۰	۲	۰
۱۵	فلسفہ	۱۲	۴	۶
۱۶	مابعد الطبیعیات	۲	۱	۰
۱۷	اخلاقیات	۹	۰	۱
۱۸	قانون	۱۰	۱	۳

شمار	علوم	شائع شدہ	زیر طبع	زیر ترجمہ یا تالیف
۱۹	ریاضیات	۲۲	۵	۵
۲۰	طبعیات	۲۱	۰	۲
۲۱	کیمیا	۱۰	۱	۷
۲۲	نباتیات	۰	۳	۰
۲۳	حیوانیات	۰	۳	۰
۲۴	طب	۹	۱۰	۱۹
۲۵	انجینیری	۱۷	۱۰	۸
۲۶	فن تعلیم	۰	۰	۳۰
۲۷	میزان	۲۳۶	۶۲	۱۰۵

انجمن ترقی اردو کے مطبوعات کی تعداد ۹۵ ہے جس مین تذکرے، قواعد، درسیات، معاشیات، تعلیمات، طبعیات، نفسیات، ارتقا، نباتیات اور تاریخ کی کتابین داخل ہین، ان کی فن وار تقسیم یہ ہے،

۱	ادب	۳۵	ان مین، شعرائے قدیم کے تذکرے اور ۶ اردو کی قدیم کتابین ہین،		
۲	تاریخ وسیر	۱۵	۴	تعلیم	۳
۳	سائنس	۱۲	۵	فلسفہ	۳

۶۔ قواعد زبان و لسانیات وغیرہ،	۷	۹ لغت	۱
۷۔ درسی	۱۵	۱۰ معاشیات	۱
۸۔ مذہب،	۲	حفظان صحت	۱۰

ہندوستانی اکاڈمی نے اپنی دس برس کی زندگی میں اردو کی چھبیس کتابیں شائع کی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے،[۹۵]

تمدنی تاریخ	۴	تعلیم و تربیت،	۱
اقتصادیات	۲	سیاسیات	۱
حیاتیات	۱	ترجمے	۳
فلسفہ	۲	انتخابات دواوین،	۲
ادبیات	۵	ادب اردو کی پیدائش	۱
سیاسی تاریخ	۲	متن کتب	۲
		میزان	۲۶

ذکر کے قابل پنجاب یونیورسٹی کے مطبوعات بھی ہیں، جہاں سے تذکرہ اور تاریخ اردو کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، اسی طرح اسلامیہ کالج پشاور بھی شکریہ کا مستحق ہے، جہاں کے پروفیسروں نے نظریہ اضافیت اور ہیئت و فلکیات پر کتابیں شائع کی ہیں، ان کے علاوہ اردو اکاڈمی (جامعہ) دہلی ہے، جو ہر سال کچھ کتابیں شائع کرتی ہے جن میں نفسیات فلسفہ، اقتصادیات، اور سیاسیات کا حصہ زیادہ ہوتا ہے، کتابستان الہ آباد نے تاریخ

فلسفہ اور ادب پر متعدد کتابیں چھاپی ہیں، قومی کتب خانہ لاہور نے افسانے ترکون کی موجودہ تاریخ اور ادبیات لطیفہ کی بعض کتابوں کی اشاعت کی ہے، نظامی پریس بدایون نے شعر و سخن مرثیے، دیوان اور تاریخین چھپوائی ہین، الناظر بک ڈپو نے بھی تاریخ سفرنامے اور آدب کی بہت سی کتابین اضافہ کی ہین، ایوان اشاعت گورکھپور نے فلسفہ ادب اور افسانون کے مجموعے شائع کئے ہین، اردو مرکز لاہور نے منتخبات نظم و نثر کی، ۳ جلدین شائع کی ہین، طبیہ کالج دہلی نے طب کی اہم کتابون کا اتنا اچھا ذخیرہ ہندوستانی مین جمع کر دیا ہے، کہ طبیہ کالج دہلی، طبیہ کالج علی گڈھ، طبیہ اسکول لکھنؤ، اور طبیہ اسکول پٹنہ کی تعلیم کے لئے وہ بہت کچھ کافی ہو رہی ہین،

حیدرآباد مین کئی تجارتی ادارے ہین جن سے ادب، ادب کی تاریخ تنقید اور افسانے شائع ہوتے رہتے ہین، مدراس یونیورسٹی نے بھی اپنے فرض کو محسوس کیا ہے، اور مولوی محی الدین صاحب لکچرار اردو مدراس کی کوشش سے دیوان بیدار، واقعات اظفری کا ترجمہ اور بعض کتابین چھاپی ہین، اب دلی مین حالی پبلشنگ ہوس کے نام سے ایک نیا اشاعت خانہ قائم ہوا ہے،

دارالمصنفین کے اشاعت خانہ نے اپنی بائیس سال کی زندگی مین ۷۲ کتابین شائع کی ہین جن کی فن وار فہرست یہ ہے،

۱- سیرت و سوانح	۲۱	۴- ادب	۱۱
۲- تاریخ	۱۸	۵- تعلیم	۳
۳- فلسفہ	۱۲	۶- تصوف	۲

۷- فقہ	۲	۹- فلسفۂ تاریخ	۱
۸- مذہب	۳		

سلسلۂ دار المصنفین کا آخری نمبر ۵ ہے،

علوم وفنون | کتابون کی کثرت اور تعداد کو چھوڑ کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی دینیات مین قرآن پاک، حدیث اور فقہ کے بہت سے ترجمے ہوچکے، جدید اور قدیم علم کلام کا ذخیرہ بھی اچھا ہے، اسلامی قومون اور ملکون کی تاریخین بھی خاصی ہوگئی ہین، یورپ اور امریکہ کی تاریخین بھی موجود ہین، طب، ہومیوپیتھی، اور ڈاکٹری کی کتابین بھی لکھی جاچکی ہین، سائنس اور ریاضیات کی کتابین اتنی ترجمہ ہوچکی ہین کہ ان کے بل پر ایک یونیورسٹی کا پورا شعبہ چل رہا ہے، فلسفہ مین افلاطون، برکلے، کانٹ، ہیوم، شوپنہار، برگسان کے فلسفے ہندوستانی مین آچکے ہین، اسی طرح روسو، نٹشے اور ٹالسٹائی کے خیالات بھی اس زبان کا جامہ پہن چکے ہین، اخلاقیات، نفسیات اور معاشیات کا ذخیرہ بھی قابل قدر ہے، علمی اصطلاحات کی کئی ڈکشنریان بن چکی ہین، ترقی اردو نے انگریزی اردو، اور اردو انگریزی ڈکشنری، پیشہ ورون کا لغت اور اردو کا عام لغت تیار کیا ہے، دار المصنفین نے عربی اردو کا لغت لکھوا یا ہے، عام لغات مین فرہنگ آصفیہ کے بعد اس عہد مین نیر کاکوروی مرحوم کی نور اللغات اور لاہور مین عام استعمال کے لئے جامع اللغات کئی جلدون مین لکھی جاچکی ہے، ان مین گو غلطیان بھی ہین، مگر ایک طرح سے انسائیکلوپیڈیا کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے،

اردو ادب کی تاریخ کے سلسلہ مین پنجاب، صوبۂ متحدہ اور دکن کے اہل قلم نے اس صدی

مین بہت کچھ کام کیا ہے، اور شک نہین کہ اس زبان کی پیدایش کی کہانی اب مسلّم تاریخ بن رہی ہے، اس تحقیق کا آغاز ہمارے صوبہ مین مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم کی گلِ رعنا سے ہوا، اور اس کی تکمیل دکن اور پنجاب کے اہلِ تحقیق نے کی، ترقی اردو نے شعرا کے پرانے تذکرون اور پرانی زبان کی ابتدائی کتابون کا بڑا ذخیرہ ہمارے سامنے رکھدیا ہے،

ہندو مذہب اور تاریخ و تمدن کا سرمایہ بھی اس زبان مین موجود ہے، ویدا مہابھارت، رامائن، منوشاستر، گیتا، ہندو تہذیب، رہنمایانِ ہند، قدیم ہند کے ترجمے ہو چکے ہین، ہندی ادب، ہندی شاعر کبیر داس، ہندی تیوہارون پر کتابین لکھی گئی ہین، مگر ابھی یہ ذخیرہ ناکافی ہے اور مزید ترقی کا محتاج ہے،

خاتمہ | یہ ہندوستانی زبان کی نصف صدی کی رفتار کا ادھورا خاکہ ہے، معلومات ملک کے گوشہ گوشہ سے اکٹھے نہین کئے گئے، بلکہ جو کچھ یاد تھے، ان کو کاغذ پر کھینچ دیا ہے،

(معارف - دسمبر ۱۹۳۷ء)

مقالات

اکبر کا ظریفانہ کلام

دلی دکھنی سے لیکر امیر و داغ و جلال کے زمانہ تک ہماری شاعری جس تنگ و محدود شاہراہ پر چل رہی تھی، اہل محفل کا دل اس سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اگر نئے راستے پیدا نہ ہوتے تو اردو شاعری فنا ہو چکی ہوتی، مولانا شبلی کی تاریخی شاعری، مولانا حالی کا پند و موعظت، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی اخلاقی کہانیاں، ڈاکٹر اقبال کا فلسفہ، میر اکبر حسین صاحب کی پرمعنی اور لطیف ظرافت، اردو شاعری کی جدید تاریخ کے شاندار ابواب ہیں،

ارباب تجارت دو طرح کے ہیں، ایک وہ جو بازار کا چلن دیکھکر اپنی دوکان میں ہر ضرورت کی چیزیں ادھر ادھر چن دیتے ہیں، خریدار راستہ سے گذرتے ہیں، اور اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق دوکان سے مختلف چیزیں اٹھا لیتے ہیں، ان دوکانداروں کو پھر جو سستی اور چلتی ہوئی چیز نظر آتی ہے، اس کو لے کر اپنی دوکان سج لیتے ہیں، دوسرے وہ سوداگر ہیں، جنھوں نے اپنے مذاق اور استعداد کے مطابق کوئی چیز پسند کرلی ہے اور وہی

ایک جنس اُن کی دوکان مین ملتی ہے، اگر تم کوکسی اور چیز کی ضرورت ہو تو اسی قسم کی کوئی اور دوکان تلاش کرو، جہان صرف اُسی جنس کی تجارت ہوتی ہو، عموماً بڑے بڑے تاجر اسی دوسری قسم کے ہین،

شاعری کا بھی یہی حال ہے، فردوسی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، خیام نیشاپوری، عرفی شیرازی، جن کا کلام قبول عام حاصل کر چکا ہے تھوک فروش سوداگر تھے ان کے یہان شاعر کے مذاق کے مطابق کلام ملیگا، اُن مین ناظرین کے مذاق و انتخاب سے بحث نہین، ایک شاعر و خطیب مین سب سے بڑا نازک فرق یہی ہے، شاعر دنیا کو صرف اپنا دل دکھلاتا ہے، خطیب سامعین کے دل دیکھتا ہے، اور اُن کے خیالات و جذبات کو متاثر کرنا چاہتا ہے یہی سبب ہے کہ تمام بڑے بڑے شعرا کا ایک خاص رنگ مذاق ہے جس کے مطابق وہ اپنے کلام کو فروغ دیتے ہین،

قدیم شعراے اردو مین **میر**، **غالب**، **انشا** اور **نظیر** اکبرآبادی کے سوا کسی اور کا کوئی مخصوص موضوع سخن نہین، جدید شاعری کے ہماری زبان پر دو بڑے احسانات ہین، ایک تو غزل و قصیدہ کے متفرق و پراگندہ خیالات کے بجائے عربی شاعری کی طرح مسلسل مضامین کی اس نے بنیاد ڈالی، دوم یہ کہ زلف و شانہ کے الجھاو اور گرفتاری سے اس نے نجات پائی، اور ہر قسم کے مسلسل خیالات شعر مین بندھنے لگے، ہماری تعلیم اور عام فضل و کمال کے مشاہیر جس طرح اب تک وہی قدیم تعلیم یافتہ تھے، جنھون نے بوریا نشین ہوکر تعلیم پائی اور اب تک قومی اسٹیج کے وہ مالک تھے، اسی طرح جدید شاعری کے میدان

مین بھی اب تک وہی بزرگوار پیشرو ہین جنھون نے قدیم شاعری سے اکتا کر اس نئے کوچہ مین قدم رکھا۔

مولانا حالی، اور میر اکبر حسین دونون قدیم شاعری کے استاد و مسلم الثبوت ہین، ان کے دیوانون کا ایک حصہ ان ہی قدیم غزلون کا مجموعہ ہے جس کے شکست و ریخت مین عمر کا بڑا حصہ ضائع کیا گیا ہے، میر صاحب غالبًا وحید الہ آبادی کے شاگرد ہین، جنکو آتش یا ناسخ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اسی بنا پر میر صاحب کی شاعری مین لکھنؤ کا مذاق نہایت نمایان ہے، اور وہی رنگِ طبیعت نکھر کر ایک اور عالم بن گیا ہے، اب تک ان کے دو دیوان شائع ہو چکے ہین، کلام کی تقسیم مختلف مضامین پر ہے لیکن درحقیقت ہم ان کو صرف تین جلی تقسیمات مین درج کرتے ہین، غزلین سنجیدہ اور متین کلام، ظریفانہ نظمین، اول اور دوم صنفِ سخن کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہین صرف تیسری صنف ایسی ہے جو انکی خاص چیز کہی جا سکتی ہے

لکھنؤ کے شعرا مین سید انشا (لکھنؤ آکر) اور امانت لکھنوی کا جو رنگ ہے میر صاحب کی ظریفانہ نظمون کا درحقیقت وہ اساسِ سخن ہے، آج سے تیس برس پہلے لکھنؤ سے اودھ پنچ نام سے ایک اخبار نکلا تھا اور مدت تک زندہ رہا، میر صاحب کے فطری رنگ کی پختگی مین اس اخبار سے بڑی مدد ملی، اسکی ہفتہ وار اشاعتون مین میر صاحب کا کلام خاص ذوق سے لوگ پڑھا کرتے تھے، اودھ پنچ کے گر جانے کے بعد اور ماہوار رسائل مین بھی میر صاحب کا کلام چھپکر مطبوع ہونے لگا، اور اب ہماری زبان کا ہر ممتاز رسالہ اور اخبار اُن کے اشعار کے لئے ہر مہینہ بیقرار رہتا ہے

میر صاحب کا اعلیٰ مذاق اور ان کی شاعری کا موضوعِ عام پر مبنی اور سنجیدہ ظرافت ہے

ان کو مذہب، فلسفہ، سیاست، قومیات جس موضوع پر بھی جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس کا مغزِ سخن خواہ جو کچھ ہو لیکن اس کا قشرِ بالائی صرف سنجیدہ ظرافت ہوتی ہے، ظرافت کا رنگ جو سید انشا اور سعادت علی خان کی بدولت لکھنؤ کی شاعری مین پیدا ہو گیا تھا اس کا مقصد صرف تفریحِ طبع اور دل بہلانا تھا، ضلع جگت اور رعایتِ لفظی لکھنؤ کا خاص مذاق ہے، اسکا مقصد بھی محض تفننِ طبع تھا، اور لکھنؤ مین امانت اس اقلیم کا بادشاہ ہوا ہے، جان صاحب کا ظریفانہ رنگ گو زنانہ لہجہ مین آکر بدنما ہو گیا تھا، تاہم اس کی بنیاد بھی محض تفریحِ طبع پر تھی، میر صاحب کا احسان یہ ہے کہ انھون نے سعدی، ابن یمین اور خیام کے مغزِ سخن کو امانت کے الفاظ مین اور سید انشا کی بولی مین اس طرح ادا کیا کہ وہ نہ صرف تفریحِ طبع اور واہ واہ کا ساماں رہا بلکہ اس کی تہ مین، پند و موعظت، اخلاقی تعلیم، سیاسی نکتے، فلسفیانہ اسرار، مذہبی مسائل اجتماعی مباحث بھی نظر آنے لگے، سید انشا کے زمانہ کی سرکاری زبان فارسی اور ترکی تھی، وہ اسی شیرہ اور قوام سے اپنا شربت تیار کرتے تھے، اب انگریزی سرکاری زبان ہے، میر صاحب اس بادۂ فرنگی کی آمیزش سے ذوقِ کلام کو لطف دیتے ہین،

ہم اوپر کہہ آئے ہین کہ میر صاحب کے اصنافِ کلام مین گو ہر جنس کی چیزین ملتی ہین لیکن ان کے ہر جنس مین لذت درحقیقت ظرافت کی ہوتی ہے، جسکے مزہ سے دل اور زبان دونون لطف اٹھاتے ہین،

میر صاحب اسی شیر و شکر مین پند و موعظت اور نصیحت گری کی ان تلخ دواؤن کا گھونٹ گلے سے اتار دیتے ہین، جنکو یون پینا اس جدید دورِ لطافت و تنزہ پسندی

مین ناممکن تھا، میر صاحب بھری محفل مین، علماے کرام، مشائخ عظام، امرا و حکّام مدعیان رہبری عام، اور نوجوان تعلیم یافتون کا خاکہ اڑاتے ہین، اور اُن کی چتون پر میل تک نہین آتا،

میر صاحب کا اصل رنگ یہ ہے کہ جدید طرزِ معاشرت، یورپین اخلاق و عادات، تعلیم جدید کے نقائص، مغربی تقلید کے معائب کو ظرافت کے پردہ مین اس طرح نمایان اور واضح کرین کہ مخاطب جھینپ کر خاموش ہو جائے، اور اپنے فعل پر تھوڑی دیر کے لئے اس کے چہرہ پر ندامت سے پسینہ آ جائے، کہتے ہین،

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے | بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ مین تجھ سے پوچھتا ہون ہندی | یورپ کا تری رگون مین کچھ خون بھی ہے

آگاہ ہون معنیِ خوش اقبالی سے | واقف ہون بناے رتبۂ عالی سے
شرطین عزت کی اور ہین اکبر | چلتا نہین کام صرف نقالی سے

تعلیم مین اُن علوم کے ہو مصروف | نیچر کی جو طاقتون کو کر دے مکشوف
لیکن تم سے اُمید کیا ہو کہ تمھین | عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

مذہب کی کہون تو دل لگی مین اڑ جائے | مطلب کی کہون تو پالسی مین اڑ جائے
باقی سرِ قوم مین ابھی ہے کچھ ہوش | غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی مین اڑ جائے

میر صاحب کی ظریفانہ شاعری پر اگر تنقید کی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی ظرافت کے مختلف سات عنصر ہین جنکی تفصیل حسب ذیل عنوانون مین کیجا سکتی ہے،

رعایت لفظی یا ضلع جگت | دنیا مین کوئی چیز بری یا بھلی نہین ہے، ہر چیز کا محل استعمال برا یا بھلا ہے

ضلع جگت درحقیقت ایک بازاری چیز ہے، اس لئے سنجیدہ کلام اس کا متحمل نہین ہوسکتا، امیر خسرو نے اعجاز خسروی کے ذریعہ اس عالم مین اپنی پیغمبری کا لاکھ ثبوت دیا لیکن اہلِ ہوش وخرد کے نزدیک مقبول نہ ہوئی،

رعایتِ لفظی اور ضلع جگت، متاخرین بلکہ متوسطین شعراے لکھنؤ تک کا مذاقِ خاص رہا ہے، اکثر صرف اسی اساس پر اُن کی شاعری کی ساری بنیاد قائم ہوتی ہے، ان لوگون نے بڑی غلطی یہ کی کہ اس کا کوئی خاص محل استعمال متعین نہین کیا، بلکہ ہر قسم کے کلام کو اس زیور سے آراستہ کرنا چاہا، یہی وجہ ہے کہ وہ اونچے طبقون مین مقبول نہین ہوا لیکن میر صاحب نے رعایتِ لفظی کو صرف ظریفانہ کلام کے ساتھ مخصوص کردیا جو اس کے لئے خاص طور پر موزون تھی، میر صاحب کے ظریفانہ کلام کے رنگ کو جابجا اسی عنصر کی آمیزش نے نہایت شوخ کردیا ہے، مثلاً گولیان دوا کی بھی ہوتی ہین اور بندوقون کی بھی، اس تجنیس سے دیکھو میر صاحب کس طرح فائدہ اٹھاتے ہین،

گولیون کے زور سی کرتے ہین وہ دنیا کو ہضم　　　اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہین

رسالہ کی تجنیس سے دیکھئے کس طرح کام نکالتے ہین،

ملکی ترقیون مین دوا ے نکالئے　　　پلٹن نہین تو خیر رسالے نکالئے

مِس کی تجنیس دیکھئے کیا رنگ دکھاتی ہے،

سراسر نور تقوی سایہ پر قربان کرآئے　　　یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے مِس لائے

تثلیث اور تین،

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہین کچھ گھر مین بیٹھے ہوئے واینتین پڑھا کرتے ہین

اس رعایت لفظی اور تجنیس کے شوق میں بعض اوقات وہ اردو و انگریزی و فارسی الفاظ کو بھی باہم متجانس کر لیتے ہین، اور اس مین بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے، "ہمبل" انگریزی مین خاکسار کو کہتے ہین، وہ اس کو امام حنبل بناتے ہین،

ہر طرح ہے اب عاجزی ہم مین اب ہمارے امام ہمبل ہین

پاس کرنا اور پاس رہنا،

لندن مین بگڑ جاؤ گے وسواس یہی ہے تم پاس رہو میرے بڑا پاس یہی ہے

گڈ ڈے اور گڈے،

ضرورت کچھ نہی اسکی کر تسیمن بھی ہو جاے سلام و رحمۃ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ اور گڈ ڈے

حیات مذہبی سے بھاگتا تھا کھیل گڑیون کا کہان کی قوم ہان کچھ نکلے ہین نازنین گڈے

کم آل اور کمال،

ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر کہتا ہے "کم آل" جسکو حاصل ہے کمال

کم آل (تم سب آؤ) اور کمال کی تجنیس صوتی اس ظرافت کی بنیاد ہے،

جدت قافیہ | میر صاحب کی ظرافت کا بڑا حصہ اکثر اوقات قافیہ کی جدت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر انگریزی الفاظ کو بطور قافیہ کے استعمال کرتے ہین، مثلاً

ہوائے طوبیٰ ہے اب نہ سر مین نہ موج کوثر ہے اب نظر مین

ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائین پائنیر مین

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے نوک دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے

خواہش ہو تجھے اگر غنی بننے کی — دولت کی ہوس ہی اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ اے ہندی — کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

بلبل ہیں آج ہم چمنستان کمپ کے — پروانہ کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے
فکر بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی — اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں ہمپ کے
رکھتے تھے جو بزرگ قدم پھونک پھونک کے — خوگر ہوئے ہیں لیپ کے اسکپ کے جمپ کے

عینک آنکھوں میں منہ میں مصنوعی دانت — ٹیچر نے سکھا کے کر دیا جسم کو تانت
اب تک ہے وہی مگر ہوس حضرت کی — ہے طول امل ہنوز شیطان کی آنت

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے — تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو عموماً قافیہ نہیں بنتے لیکن میر صاحب اس قسم کے الفاظ کی ترکیب سے بعض موقعوں پر قافیہ کا کام لیتے ہیں، اس لئے اس سے نہایت ندرت اور جدت پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لیکر — بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لیکر
سودا اس کو ہے جو سدھار لندن — وہ دولت و جنس گھر میں جوتھی لیکر

پوتھی، موتھی کا قافیہ جوتھی کتنا عجیب ہے۔

میر صاحب کو قافیہ نکالنے میں کمال حاصل تھا، مولانا شبلی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ میرے نام کا قافیہ نکال لیں تو جانیں، وہ اس وقت چپ ہی ہو رہے

دیر کے بعد میر صاحب نے دعوت کا منظوم رقعہ بھیجا،

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی ہے بات یہ صاف بھائی شبلی

قبلہ قبلی اور شبلی کا قافیہ ان ہی کی تلاش سے مل سکتا تھا،

مخاطب کے دعوی کی تشریح

میر صاحب کے کلام میں بعض وقت ظرافت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مخاطب کے دعوی کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن اس کی تشریح اس طرح کر دیتے ہیں کہ مدعا اس کے بالکل مخالف ثابت ہوتا ہے، مثلاً موجودہ بیداری سید احمد خان کی کوششوں کا نتیجہ خیال کیجاتی ہے، میر صاحب اس کو تسلیم کرتے ہیں مگر کہتے ہیں اسمیں للہیت اتنی تو ہو کہ لوگ اٹھتے وقت اللہ کا نام لیں،

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور کہتا نہیں تم سے کہ ہو اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن اللہ کا نام لیکے اٹھنا ہے ضرور

جدید تعلیم یافتہ گروہ کالج کو تمام قومی کاموں کا تنہا اور واحد مرکز بتاتا ہے، میر صاحب اس کے اس دعوی کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی طرح واحد اور ایک جس طرح ایک بے مایہ کی ایک واحد جھوپڑی، یا اندھے کی ایک لکڑی،

مسلمانوں نے کالج کی بڑی کیا راہ پکڑی ہے وہی تو اک ٹھکانا ہے وہی اندھے کی لکڑی ہے

جدید تہذیب کے دلدادہ بے پردگی کے حامی، اور عورتوں کو پبلک مجمع میں دیکھنے کے مشتاق ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ جو انگریزی نہ جانے گویا وہ تعلیم سے عاری ہے، میر صاحب ان کے دعوی کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں،

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی   اب وہ شمع بزم ہے پہلے چراغ خانہ تھی

"شمع بزم" اور "چراغ خانہ" کی تشریح سنکر عجب نہین کہ عورتون کی بے پردگی اور انگریزی تعلیم کے مدعی چراغ پا ہو جائین،

ابہام | یعنی کسی فقرہ کے دو مطلب ہون، قریب تر غیر مقصود اور بعید تر مقصود ہو،

یورپ والے جو چاہین دل مین بھردین   جس کے سر پہ جو چاہین تہمت دھر دین

بچتے رہو ان کی تیزیون سے اکبر   تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دین

تین ٹکڑے کرنے سے قطع و برید نہین، تثلیث مراد ہے لیکن ابہام قطع و برید کا ہوتا ہے اور یہی اس شعر کا لطف ہے،

بے پردہ کل جو آئین نظر چند بی بیاں   اکبر زمین مین غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو مین نے آپکا پردہ وہ کیا ہوا   کہنے لگین کہ عقل پہ مردون کے پڑ گیا

بظاہر اس سوال کا جواب ہے کہ پردہ اس لئے نہین ہے کہ وہ مردون نے چھین لیا، لیکن اصل مقصود یہ ہے کہ مردون کی عقل پر پردہ پڑ گیا، اور اپنی عورتون کا پردہ انھون نے اٹھا دیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا مین نے اک مضمون لکھا   میرا مضمون رہ گیا ڈاسن کا جوتا چل گیا

جوتا چل گیا کے دو معنی ہین، ایک مقصود دوسرا غیر مقصود،

قدیم شعرا کے خیالات کو دوسرے پیرایہ مین ادا کرنا | میر صاحب بعض اوقات قدیم شعراء کے خیالات کو اس طرح الٹ پلٹ کر ادا کر دیتے ہین کہ قدیم و جدید مضامین مین ایسی دلآویز مناسبت پیدا ہو جاتی ہے جس سے بیساختہ ہنسی آجاتی ہے، سعدیؔ کا شعر ہے،

چہ بر تخت مردن چہ بر روے خاک

وہ اسکو یون پلٹتے ہین،

چو مسٹر نباشد ترا ایمان | چہ بر میز خوردن چہ برروی خوان

مولوی رومؔ کا شعر ہے،

چیست دنیا از خدا غافل شدن | نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

اس کو یون کیا،

نیچریت چیست از دین گم شدن | نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند | تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری (اکبر)

اس شعر کو یون کیا،

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ درکارند | تا تو پا سے بکف آری و کنی عہدہ پری

جدید محاورات | میر صاحب کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جدید محاورے جو انگریزی زبان کے اختلاط سے پیدا ہوگئے ہین، ہمارے مشرقی شاعر تو ان کا استعمال عار کلام سمجھینگے، لیکن میر صاحب ان ہی محاورات کو پیرایۂ اشعار مین اس طرح جلوہ دیتے ہین کہ ہزارون محتاط شاعریون کو ان پر قربان کر دینے کو جی چاہتا ہے،

بیٹھا رہا مین صبح سی اس در پہ شام تک | افسوس ہی ہوا نہ میسر سلام تک

ہر اک ریمارک آپکا عقرب کا نیش ہی | مجھکو بھی رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہی

حریفون نے رپٹ لکھوائی ہی جا جا کے تھانے مین | کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے مین

جدتِ تشبیہ و استعارات | کلام مین نئی تشبیہین پیدا کرنا شاعری کی جنت کا شجر ممنوعہ ہے، عرب مین تشبیہات بالکل مادی اور سادی ہوتی تھی، ایران آکر عربی شاعری باغ و بہار بنگئی فارسی شاعری جب ہندوستان آئی، تو گو شیراز کا بلبل ہات سے نہ چھوٹا لیکن قمری اور فاختہ کی کوکو بھی اب سنائی دینے لگی، اس نئے دور مخترعات مین سینکڑون چیزین نئی پیدا ہوگئی ہین لیکن ہماری قدیم شاعری کا ذخیرۂ تشبیہات اب تک وہی متروکات و اندوختۂ سلف چلا آتا ہے، میر صاحب کا احسان ہے کہ انھون نے بیسیون نئی تشبیہین کلام مین پیدا کردین اور اُن سے عجیب و غریب تمثیلی استدلالات پیدا کئے،

زندگی اور قیامت مین ریلیشن سمجھو
اس کو کالج، اور اُسے کانووکیشن سمجھو

آہ و فریاد سے قابو مین نہ آئیگا دل
طپش قلب کو بنگال اجیٹیشن سمجھو

بحر ہستی کا یہی دور چلا جاتا ہے
برف کی طرح جمے بہ گئے پانی کی طرح

میدان عمل لیگ کا محدود ہی بیشک
ہان رقبۂ مجلس کی کوئی تاپ نہین ہے

ہے کو ماہی کو ما، جو پڑھے دہر کا نامہ
جز موت کہین اسمین فل اسٹاپ نہین ہے

بعد مردن کچھ "نہین" یہ فلسفہ مردود ہے
قوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے

کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال مین
اب ہائے ہائے کر رہے ہین اسپتال مین

دنیا اُسے قرار دو اور آخرت ہے یہ
سن لو کہ سازِ معنیِ اکبر کی گت ہے یہ

(معارف جلد ا نمبر ۲)
اگست ۱۹۱۶ء

اُردو انسائیکلوپیڈیا

ہندوستان کی ترقی کا شور و غل اُس وقت تک صدائے بے اثر ہے، جبتک اس مین کوئی جامعیت پیدا نہین، ہندوستان مختلف نسلون، مختلف مذہبون، اور مختلف زبانون کا گھر ہے، ان مختلف نسلون، مختلف مذہبون اور مختلف زبانون کے افراد کو جماعت، اور مختلف جماعتون کو ایک قوم بنانا صرف اسی طریقہ سے ممکن ہے کہ ان مین نسلی، یا مذہبی، یا لسانی اتحاد پیدا کیا جائے، ہندوستان کی مختلف نسلی جنسیتون کو ایک کرنے کا خیال ایک بے سود اور ناقابلِ عمل تخیل ہے، تمام ہندوستان کو صرف ایک مذہب کا پیرو بنا دینا گو عقلاً ممکن ہے، اور دائرہ عمل کے اندر داخل ہے لیکن بیرونی مشکلات کی بنا پر ایک وسیع مدت تک یہ تقریباً محال ہے، اس لئے تمام ہندوستان کو اگر ہم ایک متحد قوم بنانا چاہتے ہین تو صرف زبان ہی کا اشتراک ایک ایسی چیز ہے، جو ان اختلافات کو مٹا کر تمام ہندوستانیون کو ایک مشترک و متحد ہندوستانی قوم بنا سکتی ہے،

اب سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی سیکڑون زبانون مین سے اس عمومیت و اشتراک کی صلاحیت کس کو حاصل ہے، اور اس صلاحیت و استحقاق کا معیار کیا ہے،

(۱) فطرۃً اسمین عمومیت اور تمام ملک مین چھا جانے کی صلاحیت موجود ہو،

(۲) کسی صوبہ کی خاص زبان نہ ہو بلکہ عموماً وہ ملک کے ہر گوشہ اور ہر حصہ مین بولی اور سمجھی جاتی ہو،

(۳) اس مین علوم و فنون کا سرمایہ اور ہر قسم کے بلند خیالات، کا ذخیرہ ایک حد تک موجود ہو، دو اول الذکر حیثیتون سے اردو زبان کے ترجیحی تفوق کے پہلو کو کوئی دبا نہین سکتا، اُردو سے زیادہ ہندوستان کی کسی اور زبان مین ایک عمومی اور ملکی زبان بننے کی قابلیت نہین، ملک کی دوسری زبانین صرف بھاشا اور سنسکرت کی پیداوار ہین لیکن اردو نہ صرف ہندوستان کی تمام زبانون کا مجموعہ ہے، بلکہ غیر ملکی الفاظ کا بھی اس مین میل ہے اس بنا پر ہندوستان کی مختلف الاجزا قومیت کے لئے اردو سے زیادہ اس قومیت کی ترجمان بننے کی کسی اور مین صلاحیت نہین ہو سکتی، بنگالی زبان، ہندوستان کے تمام دوسرے صوبون کے ہندو مسلمان اور ملک کے عام باشندون کے لئے بالکل بیگانہ ہے، یہی حال مرہٹی اور گجراتی کا ہے کہ اپنے اپنے صوبون کے حدود سے جب ان کا قدم باہر نکلیگا تو ہمیشہ ان کا خیر مقدم ملک کے باشندون کی طرف سے بیگانہ وار ہوگا، برخلاف اردو زبان کے کہ ملک کی آبادی کا تیسرا اسلامی حصہ، ہر صوبہ اور ہر گوشہ مین اس کو بطور مادری زبان کے بولتا اور سمجھتا ہے، ملک کی دوسری کثیر التعداد قوم یعنی ہندو بھائی ملک کے بڑے بڑے صوبون مین مثلاً پنجاب، دہلی، صوبہاے متحدہ، بہار اور اسلامی ریاستون مین مادری زبان کی طرح اسکو بولتے ہین، بنگال، مدراس، بمبئی، ممالک متوسط اور راجپوتانہ و کشمیر و بڑودہ کی ریاستون مین

اس کو وہ نہایت آسانی سے سمجھتے ہین، اور ضرورت کے وقت اسی مین اظہارِ مطلب کرتے ہین
وجوہِ بالا کی بنا پر اُردو زبان کو اب بھی ملک کی عمومی زبان ہونے کا دعویٰ ہے، اور
اس دعویٰ کی تردید عملاً ناممکن ہے، اور ہندوستان کی مختلف قومون کا میل جول جس حد تک
ترقی کرتا جائیگا، اردو زبان کی ہمہ گیری اور عالمگیری بھی اسی حد تک وسیع ہوتی جائیگی،
اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لیجائے، اور یہ فرض کرلیا جائے کہ ملک کے تمام صوبون
اور گوشون کے نائبون اور قوم کے نمایندون کی ایک عظیم الشان مجلسِ شوریٰ قائم ہے،
ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ ہم کو کس زبان
مین مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے لبریز ہے لیکن کیا پنجابی زبان اس کے
خیالات کی ترجمانی کرے گی، کیا بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف بولیون والے مجمع
کی گرہ کشائی کرسکے گی؟ وہ یقیناً صرف اُردو ہی زبان ہوگی جو اس عظیم الشان قومی مجمعِ
شوریٰ مین مبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن سکیگی،

اب ایک چیز رہ گئی یعنی یہ کہ ہماری آیندہ مشترک اور عمومی بننے والی زبان علوم و
فنون کے لحاظ سے دوسری تمام زبانون سے زیادہ دولتمند اور ذی ثروت ہو، اور ہر قسم
کے بلند اور عالی خیالات کی ادا اور تعبیر کا سامان اُس مین ہو، موجودہ حالت
مین اردو زبان، بنگالی و مرہٹی وغیرہ ملک کی دوسری زبانون سے علانیہ اس معرکہ مین
بازی نہین لے جاسکتی، اس لئے ہم کو اردو زبان کی ملکی اور عمومی زبان تسلیم کرانے کے لئے
اس کی بڑی ضرورت ہے کہ ہم علوم و فنون کا ایک بڑا ذخیرہ اپنی زبان مین فراہم کرین

جو علمی، ادبی، قومی، تجارتی، سیاسی، تمدنی، اخلاقی، ہر قسم کے علوم و خیالات کی ادا اور تعبیر کی کفالت کر سکے، ایسا مجموعہ جو ان گوناگون علوم و خیالات کا کفیل ہو، ایک دو کے دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کے سوا کچھ اور نہیں،

لیکن یہ اس قدر عظیم الشان، اہم اور مصارف طلب تجویز ہے کہ ہندو مسلمانون مین سے کوئی قوم بھی اُس کے لئے باسانی آمادہ نہین ہو سکتی، اس کی تالیف و طبع و اشاعت کی ضرورت کے لئے ایک شاہی خزانہ اور شہنشاہانہ عزم اور حوصلہ مندیون کی ضرورت ہی، دنیا مین اس قسم کے کام ہمیشہ امراء، اور سلاطین زمانہ کی زرپاشیون سے انجام پائے ہین، آج ہم مین گو بکرماجیت، سوائی سنگھ، مامون الرشید اور اکبر نہین لیکن،

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید ۔۔۔ دیگران نیز کنند انچہ مسیحا می کرد

ہم مین بہت سے ایسے ہمت والے موجود ہین، جو اپنی وسیع قومی حوصلہ مندیون، بے پایان علمی فیاضیون اور غیر محدود سیاسی انجام بینیون کے لحاظ سے ہمارے موجودہ دورِ تاریخ کے سب سے بڑے ہیرو ہین، ان مین کا ہر شخص جو صرف مسلمانون کے "جامعہ اسلامیہ" کے لئے ایک لاکھ دے سکتا ہے، وہ ہندو مسلمانون کے متحد "جامعہ لسانیہ" کے لئے دو لاکھ نہین دے سکتا؟ ہم کو کامل اطمینان ہے کہ ہماری قومی فیاضیون کا دست کرم اس تجویز کی اعانت سے کوتاہ نہین،

دوسری مشکل مؤلفین اور اربابِ قلم کی ایک کثیر جماعت کے حصول کی ہے لیکن سرمایہ کے امکان کے بعد ہم اس مشکل کو زیادہ اہمیت نہین دیتے، ایک دو چیف اڈیٹر

بیشک نہایت لائق درکار ہیں لیکن الحمد للہ کہ یہ دولت اس تجویز کو حاصل ہو چکی ہے، ان کے علاوہ ۲۸ متوسط لیاقت کے مترجم اور انگریزی دان انشا پرداز ہم کو چاہئیں جن کے لئے گریجوایٹ ہونا ضروری نہیں، صاحب لیاقت ہونا البتہ ضروری ہے انگریزی کے ساتھ کسی قدر عربی کے واقف کارون کو ترجیح دیجائے گی، کام بجائے ماہوار تنخواہ کے صفحات کے معاوضہ پر ہوگا کتابون کی غیر معمولی مقدار کی بھی ہم کو حاجت نہیں، انگریزی مین انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا چیمبرس انسائیکلو پیڈیا، پاپولر انسائیکلو پیڈیا، امریکن انسائیکلو پیڈیا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، عربی مین دائرۃ المعارف، فارسی مین کشاف، اصطلاحات الفنون جیسی جامع کتابین موجود ہین، اردو کے مشہور علمی رسائل مین اکثر مباحث پر نہایت قابلیت کے مضامین شائع ہو چکے ہین، ان کے علاوہ اور بہت سے ممکن الحصول مواد اور ماخذ اس تجویز کے پیش کرنے والون کے سامنے ہین، تحقیق و کاوش نہایت احتیاط کے ساتھ عمل مین آئے گی اور انشاء اللہ چیف اڈیٹرون کی قابلیت اور ان کا ذوق تحقیق اس کو پایۂ اعتبار و استناد سے گرنے نہ دے گا،

تالیف و ترجمہ کی درخواست بھیجنے والون کے لئے حسب ذیل امور تحریر ہین،

(۱) مؤلف و مترجم کے لئے مذہب و ملت کی تخصیص نہین،

(۲) انگریزی لیاقت مسلم ہو، اردو کا انشا پرداز ہو، فارسی بقدر ضرورت جانتا ہو، کوئی صاحب ان زبانون کے ساتھ عربی بھی جانتے ہون، یا علوم و فنون جدیدہ کی کسی شاخ سے واقف ہون تو ان کو ترجیح دی جائے گی،

(۳) ترجمہ کا نمونہ بھیجنا چاہیئے،

(۴) انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے صفحہ کو پیش نظر رکھکر اطلاع دینی چاہیئے کہ فی صفحہ کیا زر معاوضہ قبول فرمائین گے،

(معارف دسمبر ۱۹۱۶ء)

افسوس کہ یہ تجویز قبل از وقت مرگئی، ہمارے دوست مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب اس کے قلمی اور مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد اس کے مالی دست و بازو تھے، مہاراجہ صاحب مرحوم کا خیال تھا کہ عنقریب ہندوستان مین ایک آزاد حکومت قائم ہوگی، اور اس وقت وہی زبان سرکاری حیثیت حاصل کریگی، جسکا علمی و ادبی سرمایہ سب سے زیادہ ہو، اس لئے اردو کے علمی سرمایہ کی ترقی کے لئے اردو انسائیکلوپیڈیا ترتیب دیجائے، اخبارون مین اس تجویز کا اعلان ہوا، سب نے تائید کی، دفعۃً سیاسیات کا رخ ایسا پلٹا کہ مہاراجہ صاحب اس کام مین شریک نہ ہوسکے، اور تجویز کے دوسرے ارکان بھی تتر بتر ہوگئے، راجہ صاحب نے اس کے لئے ایک لاکھ روپیے کا وعدہ کیا تھا،

"س"

زبان اردو کی ترقی کا مسئلہ

ڈیمانڈ اور سپلائی کا اصول

بخدمت جناب اڈیٹر صاحب "معارف"

جناب من! مین نے اردو لٹریچر کے "نفسِ وِ اپسین" کے عنوان سے حال مین ایک مضمون لکھا تھا جس سے بعض حلقون مین یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ "پرستارانِ شبلی" کے مقابلہ مین دراصل اس سے انجمن اردو کی تنقیص مدنظر تھی لیکن واقعی بات یہ نہین ہے مین نے انجمن کو اس کی اہم ذمہ داریون کے لحاظ سے ٹوکا تھا یعنی توقعات زیادہ ہوتی ہین تو فروگذاشت کسی حیثیت سے ہو مایوس کن ہوتی ہے،

انجمن جو کچھ کر رہی ہے، مین اسے قوم کی عام بے اتفاقی کے لحاظ سے بہت قابل قدر سمجھتا ہون، اسی طرح مجھ کو دارالاشاعت لکھنؤ سے پوری ہمدردی ہے جو انجمن کے کارنامون کی مقدار کے ساتھ اس کی صفات کو بھی گران وزن کر رہا ہے، اور گو ایک غیر ذمہ دار ضبس لطیف نے نظر الملک سے ایک موقع پر کیفیت نہین بلکہ جواب طلب کیا تھا لیکن یہ بڑی ناشکری ہوگی اگر ترقی اردو کے آلۂ محرک (ریور) سے ایک منٹ

کے لئے قطع نظر کیجائے، تاہم مین نہین مانتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قدرتی طور پر ہماری ضروریات کے مطابق ہے،

ملک کی کسی تعلیم یافتہ جماعت نے کبھی اس پر غور نہین کیا کہ ہر چیز ایک نظام طبعی رکھتی ہے اور اردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہین ہے، کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اُردو، زبان کا مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیش نظر نہین رہا، یہانتک کہ ان لائق ادب افراد نے (جن کے دل و دماغ کے نتائج آج اردو کا بہترین سرمایۂ ادب ہین) منفرداً یا متفقاً کبھی یہ جاننے کی کوشش نہین کی کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون سے کام ہین جن پر ترتیباً سب سے پہلے توجہ ہونی چاہئے اور دراصل ترقی اردو کے نظام ترکیبی کا اقتضائے طبعی کیا ہے،

یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ ملک مین جہانتک مختلف اصناف سخن کا تعلق ہے لٹریچر کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے لیکن کیا یہ انتشار عمل کسی قاعدہ کلیہ کی تحت مین ہے، یا ہم اس سے کسی حقیقی فوائد کے متوقع ہو سکتے ہین ؟

مین نے اسی خیال سے پروفیسر براؤن آف کیمبرج کو جو آجکل کے مستشرقین یورپ مین ایک زبردست شخصیت رکھتے ہین، اور جنکو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے، لکھکر دریافت کیا، ممدوح کی رائے کے مطابق ہم کو ترقی زبان کے لئے سب سے پہلے تالیفات ذیل مرتب کرنی ہونگی۔

(۱) جامع اللغات اُردو،

(۲) محاورات ،

(۳) لغات الاصطلاحات ،

(۴) لغات فارسی ، جہانتک اُردو کی تکمیل کا تعلق ہی،

(۵) لغات عربی، بہ ترتیب جدید،

(۶) ادب الاساتذہ ، ۱۲ ضخیم جلدون مین،

(۷) جامع القواعد اردو،

(۸) عقلیات ، یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب

(۹) اردو انسائیکلوپیڈیا ، جو بظاہر علوم عنصریہ ہو گی،

کسی زبان کو سرمایہ دار اور با اصول کرنے کی یہ قدرتی ترتیب ہی جس سے برا اون کی رائے کے مطابق قطع نظر نہین ہو سکتی ہم کو محض بے غایتہ رسائل کی اشاعت سے خواہ وہ فی نفسہ مفید بھی ہون ، صرف مطبوعات کی تعداد بڑھانی نہین ہے، بلکہ ان وسائل کی تکمیل کے ساتھ جو زبان کی ترقی کے لئے لازم ہے ہین، یہ دیکھنا ہے کہ نا آشنایان سخن کو کس طرح زبان کا دلدادہ بنایا جائے،

اس کے لئے فاضل پروفیسر کی رائے ہے کہ کثرت سے "صالح لٹریچر" کی اشاعت کیجائے اسی طرح ضخیم لغات کی ترتیب کے بعد اردو، فارسی، اور عربی کی لاکھون جلدین "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کیجائین ، اور اس کثرت سے شائع کیجائین کہ بچہ بچہ کے ہاتھون مین ہون،

میرا خیال ہے کہ پروفیسر براؤن کی یہ اسکیم نسبتہً اس قدر ضروری ہے کہ اس کا ذکر اگر آپ کے
وقیع پرچہ مین نہ آئے تو لٹریچر کی حق تلفی ہوگی"۔

"ایم، مہدی حسن"

کشتیم نالہ خدا آسمان نگہدارد

پروفیسر براؤن نے انگلستان مین بیٹھکر ہندوستان کی ملکی زبان کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اصولاً اس کی تسلیم مین کس کو عذر ہو سکتا ہے، لیکن ذرا ان کو عملاً بھی ایک محکوم قوم کی زبان کے مشکلات سے واقفیت حاصل کرنی چاہیئے، اس زمانہ مین محکوم قوم کی زبان کی ترقی کا مسئلہ عملی حیثیت سے ایسا نہین ہے کہ صرف ایک دو آدمی یا ایک مجلس کے طے کر دینے سے طے ہو جائے، وہ زمانہ گذر چکا جب ایک رستم تنہا مازندران کے سارے دیوستان کو فتح کر سکتا تھا، اب اس کے لئے کامدار توپین، لاتعداد گولے، بیشمار تربیت یافتہ فوجین اور غیر محدود سامان چاہیئے، اور سب سے بڑھکر یہ ہے کہ آسمان و زمین کے خزانون کی کنجیان ہاتھ مین ہون،

ہم کو تصنیفات کی ضرورت ہے، تصنیفات کے لئے سامانِ طبع کی حاجت، اور سامانِ طبع کے لئے سرمایہ کی ضرورت، ہم کو مصنفین چاہئین لیکن مصنفین کو فراغ چاہیئے، اور فراغ روپیہ سے ہو سکتا ہے، الغرض سب سے اول اور سب سے پہلے مصنفین اور تصنیفات کا سوال نہین بلکہ سرمایہ اور روپیہ کا سوال ہے، سرمایہ اور روپیہ کیونکر ہاتھ آسکتا ہے؟ حکومت سے یا قوم سے

موجودہ نظامِ حکومت کا طرزِ عمل ایسی امداد کے لئے آمادہ نہین، اب صرف قومی خزانہ کی طرف ہمارا ہاتھ بڑھ سکتا ہے لیکن حالت یہ ہے کہ قوم اپنے خزانہ کا منہ اسی وقت کھول سکتی ہے جب اس کو روزانہ کاروبار اور اپنی عام زندگی کے لئے ہماری ضرورت محسوس ہو،

اردو کی ترقی اور تکمیل کے لئے متعدد تجویزین اب تک پیش ہو چکی ہین، لیکن ہمارے نزدیک یہ اس وقت تک ناقابلِ عمل ہین جب تک ملک مین اس کی مانگ اور اس کی قدردانی کا جذبہ نہ پیدا ہو، بہت سے دوستون نے نیک نیتی سے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تجویز کی مخالفت کی، اور سنجیدہ دلیلین پیش کین، چنانچہ سب سے پہلے روپیہ کا سوال پیش آیا، ہم نے کہا ایک دو صاحبانِ ہمت نے بھی ہمارا ساتھ دیا تو بس ہے، لکھنے والون کی نسبت سوال آیا تو ہم نے ملک کے اربابِ قلم کے نام گنا دیئے، جن مین سے عملاً اکثر کام کرنے کے لئے تیار تھے، لیکن جب یہ سوال آیا کہ اس کی کتنی جلدین چھپینگی اور کتنے لوگ اس کی خریداری کو آمادہ ہونگے، اس وقت ہم نے شائقین کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ مشکل سے سَو دو سَو نسخے فروخت ہو سکتے ہین، سیرۃ نبوی جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج اٹھا ہے، اور ہمارے احباب کا بیان ہے کہ ملک نہایت بےچینی سے اس کا منتظر ہے، اس وقت تک اس کے دفتر مین خریدارون کے صرف ۲۰۰ نام رجسٹرڈ ہوئے ہین، پھر اردو کے لئے کوئی کس برتے پر کسی بڑے کام کی ہمت کرے،

استاذ مرحوم نے شعر العجم جب لکھی تھی تو خیال تھا کہ ہندوستان کو شاعری سے ایک فطری لگاؤ ہے اور خصوصاً فارسی شاعری تو اب تک کانون مین زندہ ہے لیکن آپ کو معلوم ہے

کہ اس کے ۵۰۰ سو نسخے پورے پانچ برس مین بکے انجمن ترقی اردو اپنے مطبوعات کا پشتارہ باندھے تمام ملک کا چکر لگا رہی ہے تاہم اس کی سالانہ رو داد مین مطبوعات کی خریداری اور آمدنی کی قابلِ افسوس تعداد نظر آتی ہے، دار المصنفین کا بھی یہی حال ہے،

بیس تیس برس مین کیا سے کیا ہو گیا، المامون ۱۸۸۹ء مین پہلی دفعہ چھپی تھی، مولنا مرحوم فرماتے تھے کہ صرف تین مہینے مین پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا، سر سید کی تصنیفات جو تمامتر عربی سے ماخوذ، عربی عبارتون اور دقیق اور مشکل بحثون سے بھری ہوتی تھین، لوگ برابر پڑھتے تھے، بات یہ تھی کہ اس زمانہ تک ملک مین انگریزی کا پورا رواج نہ تھا، عربی اور فارسی زبانین زندہ تھین، جدید تعلیم نے دماغون کو صرف تفریحی مشاغل کا آشیانہ جس طرح آج بنا رکھا ہے اس وقت تک نہ تھا، اس لئے ایک حالت قائم تھی، انگریزی تعلیم جیسے جیسے پھیلتی گئی، اردو جس کا تانا بانا سارا عربی اور فارسی سے ہے ان کے لئے ناقابلِ فہم ہوتی گئی، آج ان کے ہاتھ مین اگر تفسیر احمدی یا النظر فی بعض مسائل الامام الغزالی دیدیجائے تو شاید اس کی چند سطرین بھی وہ صحیح نہ پڑھ سکین، حالانکہ سر سید کا طرز تحریر نہایت صاف شستہ اور سہل ہے،

جدید تعلیم نے ہماری زبان مین جو مایۂ ناز افراد پیدا کئے وہ وہی تھے جن کو کم و بیش اپنے مشرقی علوم پر اطلاع تھی، سید محمود، سید علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، یہ نام ہمارے ملک اور زبان کے لئے معیارِ فخر ہین لیکن یہ وہ لوگ ہین جو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اپنے مشرقی علوم مین متبحر ہین، ان سے نیچے اتر کر مولوی عزیز مرزا، خواجہ غلام الثقلین مرحوم و امثالہم کے

مغربی فضل و کمال کے چہرہ پر اصلی آب و رنگ مشرقی علوم و السنہ کی واقفیت کا تھا، اس وقت بھی جو لوگ موجود ہین اور جن کو ہم جدید تعلیم کا بہترین نمونہ سمجھتے ہین وہ مشرقیات سے بے بہرہ نہیں ہین،

یہ حالت کچھ مسلمانون کیساتھ مخصوص نہیں ہے ہندؤن کا بھی یہی حال ہے دکن کے ہندؤن مین جدید تعلیم کے جو نخم نے قابلِ عظمت اشخاص پیدا کئے ہین اُن مین کوئی ایسا نہیں ہے جو سنسکرت سے بے بہرہ ہو، جسٹس راناڈے، مسٹر گوکھلے، ڈاکٹر بھنڈارکر، مسٹر تلک، مشرق و مغرب کے پیوند نے ان کے نخلِ کمال کو بارآور کیا ہے، بنگالیون کا بھی یہی حال ہے، اور یہی اُن کی ملکی زبان کی ترقی کا راز ہے، البتہ ہمارے صوبہ مین ہندو نوجوانون کی حالت مسلمان نوجوانون سے ممتاز نہیں ہے،

ہمارے ہان بدقسمتی سے یہ حالت ہے کہ ہمارے انگریزی خوان دوست اردو اخبارات اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا جرم سمجھتے ہین، ترجمہ کے لئے انگریزی کی دو سطرین دیجئے تو یہ کہکر مغرورانہ انداز سے کاغذ میز پر رکھدینگے کہ "بڑی مشکل ہے کہ اس کے لئے اردو مین الفاظ نہیں" اردو مین الفاظ نہیں یا آپ کی نظر مین وسعت نہیں، اصل یہ ہے کہ کچھ تو اس تعلیم کا یہ اثر ہے کہ غور و فکر، دقت بینی اور نکتہ رسی کی قوت نوجوانون سے مفقود ہو جاتی ہے اور اس لئے علمی دلچسپی اور مذاق سلیم سے بے بہرہ رہتے ہین، اور زیادہ تر یہ ہے کہ ایک مدت تک اجنبی زبان اور بیگانہ خیالات پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے اپنی مادری زبان سے قدرۃً ان کو بُعد ہو جاتا ہے، اور چار جملے بھی غیر ضروری انگریزی الفاظ کی آمیزش کے بغیر نہیں لکھ سکتے، بلکہ اپنی مادری زبان سے ان کو ایک گونہ نفرت سی ہے، اور اس مین

لکھنا پڑھنا اپنے لئے عار سمجھتے ہین، جب تک یہ حالت قائم ہے، زبان کی ترقی کی کوشش بےسود ہے، لکھنؤ کے تاریخی افسانے اور دلّی کے مذہبی چٹکلے ممکن ہے کہ ہاتھون ہاتھ فروخت ہو جاتے ہون لیکن مستند متین اور صالح لٹریچر کی مانگ ملک مین مطلق نہین ہے، اس لئے وہ پیدا بھی نہین ہو سکتا، قدرت صرف اسی چیز کو پیدا کرتی ہے جس کی طلب اور تلاش ہو، اگر مصنوعی طریقہ سے ایسی چیزین پیدا بھی ہونگی تو زندہ نہ رہینگی، چنانچہ کلکتہ کے اردو کالج (سنہ ۱۸۰۰ء) سے جو کتابین نکلین، چند کہانیون کو چھوڑ کر جن کا نام شاید آپنے سنا ہو اسکی کسی علمی اور مفید تصنیف کا نام آپنے سنا ہے؟ حالانکہ اردو زبان کی سب سے پہلی قواعد کی کتاب صرف اردو یہین لکھی گئی، اردو سوسائٹی دلّی (سنہ ۱۸۴۰ء) کی تصنیفات آپ کی نظر سے گذری ہین؟ حالانکہ علم الاقتصاد (پولیٹکل اکانمی) کی پہلی کتاب اسی سوسائٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے، اردو سائنٹفک سوسائٹی علیگڈہ کا نام سرسید کے تعلق سے زبانون پر آتا ہو، لیکن اس کی چالیس مفید مطبوعاتِ علمی کے نام آپکو معلوم ہین، اور آپ کے کتبخانہ مین اس کا سلسلہ موجود ہے؟ حالانکہ زراعت اور علم البرق اور دیگر علوم طبعی و تاریخی کے جدید الضرب سکے پہلے اسی ٹکسال مین ڈھلے، انجمن پنجاب تو آپ کے ہوش مین قائم ہوئی ہوگی، سنہ ۱۸۸۵ء مین جدید علم النفس پر اردو مین سب سے پہلے وہین سے ایک مستقل تصنیف ترجمہ ہو کر شائع ہوئی، آپ جانتے ہین،

اس وقت ملک مین جو اخبار اور رسالے نکل رہے ہین، ان کے خریدارون کا جائزہ لیجئے، تو معلوم ہو جائے کہ ان مین انگریزی تعلیم یافتون کا کتنا کم عنصر شامل ہے، اور پھر ہمارا

مغرور صوبہ تو اس دوڑ مین سب سے پیچھے ہے تعجب ہوگا کہ تقریبًا ہندوستان کے ہر اردو اخبار اور رسالہ کی خریداری وہان زیادہ نہین ہے جہان وہ زبان بولی جاتی ہے، بلکہ وہان ہے جہان ابھی لوگ اس کو سمجھ رہے ہین، زیادہ تر خریدار کہان سے ہاتھ آئین گے متوسط مدراس، حیدرآباد، گجرات، سندھ اور رنگون وغیرہ سے، اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان ممالک کے مسلمانون مین اب تک انگریزی تعلیم عام نہین ہوئی ہے، اور ابھی تک علم واطلاع کا ذریعہ وہان اردو ہی ہے،

مصر مین ہندوستان سے عام تعلیم نسبتًہ کم ہے لیکن چونکہ تعلیم کی زبان عربی ہے، اس لئے وہان جدید عربی لٹریچر ہمارے ہان سے زیادہ وسیع اور بہتر پیدا ہوگیا، حیدرآباد مین اردو یونیورسٹی قائم ہورہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہان چند روز مین اردو زبان علمی تصنیفات سے مالامال ہوجائیگی، چنانچہ ابھی سے وہان ایسے صیغے قائم ہورہے ہین جو انگریزی خیالات اور مغربی علوم کو اپنی زبان مین منتقل کرسکین، اور اردو ذریعۂ تعلیم ہونے کے باعث یہ کتابین تمام ملک مین پھیل جائینگی، اس کا قیاس صرف ایک واقعہ سے کرسکتے ہین شعر العجم جس کی نسبت مین نے پہلے کہا ہے کہ اس کے ۵۰۰ نسخے پانچ ہی برس مین نکلے، دو برس سے اس کی کچھ جلدین لاہور کے مشرقی صیغہ نے اپنے نصاب مین داخل کرلی ہین، نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شعر العجم کا ایک ایک نسخہ اشرفی کے مول بک رہا ہے، اور اس کے طبع ثانی کا جگہ جگہ انتظام ہورہا ہے

آپ کہہ سکتے ہین کہ اردو زبان کی بیسیون تاریخی اور مذہبی کتابین گھر گھر پھیلی ہین، اور ہمیشہ لوگ ان کو خریدتے اور پڑھتے ہین، لیکن ہم عرض کرینگے کہ یہ علم پرستی کا نتیجہ نہین بلکہ ہماری شائقت پرستی

اور مذہب پرستی کا نتیجہ ہے،

نیست در دائرہ یک نقطہ خلاف از کم و بیش
کہ من این مسئلہ بے چون و چرا می بینم

پروفیسر براؤن نے ہماری زبان کی ترقی کے لئے جو خاکہ تیار کیا ہے اس مین لغات ومحاورات اردو کی جگہ سب سے پہلے ہے، اوّلاً اسی پر غور کیجئے ابتدائے جب اہل یورپ ہندوستان آئے تو ان کو اردو سیکھنے کی ضرورت پیش آئی، اس لئے اردو کے قواعد ومحاورات پر بہت سی کتابین لکھی گئین، گورنمنٹ نے ابتدائی درجون مین اردو کو داخل کیا، اس کی بدولت ہر سال قواعد اردو کے متعدد رسالے پیدا ہوتے رہتے ہین، چنانچہ ان کثیر التعداد رسالون کو چھوڑ کر جو اہل یورپ نے اپنی ضرورت سے مختلف زبانون مین لکھے نیز ان بیسیون کتابون سے قطع نظر کرکے جو اسکول کے بچون کے لئے لکھی گئین، قواعد کی حسب ذیل کتابین ہماری زبان مین موجود ہین،

(۱) صرف اردو، شیدا، سنہ ۱۸۰۱ء
(۲) دریائے لطافت، سید انشا، سنہ ۱۸۰۲ء
(۳) رسالہ صرف ونحو، مولوی احمد علی دہلوی سنہ ۱۸۴۵ء
(۴) " " مولوی صہبائی دہلوی سنہ ۱۸۴۹ء
(۵) رسالہ صرف ونحو، مولوی احمد حسن الہ آبادی، سنہ ۱۸۵۹ء
(۶) رسالہ صرف ونحو، سید احمد خان دہلوی سنہ ۱۸[illegible]ء
(۷) قواعد اردو مرزا نثار علی بیگ مدرس اول آگرہ کالج، سنہ ۱۸۶۱ء

اس کے بعد اردو زبان کی طرف سے انگریزون کو بے اعتنائی ہوئی اور دفعتہً اس کی ترقی رک گئی، پھر اس وقت تک اس کی طرف توجہ نہ ہوئی، جب تک انجمن ترقی اردو کا وجود نہ ہوا، انجمن کی کوشش سے قواعد اردو پر دو نہایت عمدہ کتابین تالیف پائین،

(۱) مصباح القواعد	منشی فتح محمد صاحب، جالندھری،	سنہ ۱۹۰۴ء
(۲) قواعد اردو	مولوی عبدالحق صاحب،	سنہ ۱۹۱۴ء

مصباح القواعد مین جزئیات کے استقصا کا خیال زیادہ کیا گیا ہے، اور قواعد اُردو مین اصولِ کلیہ بنانے اور تحقیق و تلاش کا پہلو زیادہ مدِ نظر ہے،

محاورات اور لغات کو لیجئے، ان کا بھی یہی حال ہے،

شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان،	مرزا خان تپش،	سنہ ۱۲۸۳ھ
دریاے لطافت،	سید انشار،	سنہ ۱۲۲۲ھ
کلیدِ سخن،	سید محمد حسین،	سنہ ۱۸۰۲ء
خزائن الامثال،	شمس الدین فیض،	سنہ ۱۲۸۲ھ
فرہنگِ آصفیہ،	مولوی سید احمد دہلوی،	سنہ ۱۸۸۱ء
دستور الشعرار،	خواجہ محمد اشرف لکھنوی،	سنہ ۱۸۸۹ء
مخزن الاسرار،	نیاز علی بیگ،	سنہ ۱۲۸۳ھ
رسالۂ زباندانی،	چرونجی لال،	سنہ ۱۸۸۴ء
مخزن المحاورات،	منشی رجولال،	سنہ ۱۸۹۸ء
محاوراتِ اردو،	مجھو بیگ عاشق لکھنوی،	سنہ ۱۸ء
گنجینۂ زبان اردو،	جلال لکھنوی،	سنہ ۱۲۹۷ھ
سرمایۂ زبان اُردو،	〃	سنہ ۱۳۰۴ھ

امیر اللغات، امیر لکھنوی، (ناقص) ۱۸۹۱ء

مصطلحات اُردو، خواجہ محمد اشرف لکھنوی، ۱۸۹۰ء

لغات ہندی، (قلمی موجودہ ندوہ) ۱۲۲۳ھ

لغات فیروزی، (طلبا سے مدارس کیلئے) فیروز الدین، ۱۹۰۴ء

فرہنگ اردو، (طلبا سے مکاتب کیلئے) حمایت اسلام لاہور،

دو پیکر، (تذکیر و تانیث) ظہیر الدین خان، ۱۹۰۲ء

رسالہ تذکیر و تانیث، مولوی شہید الدین صاحب بنارسی، ۱۹ء

تذکیر و تانیث، حافظ جلیل حسن صاحب، مانکپوری، ۱۳۲۶ھ

فرہنگ آصفیہ ہماری زبان کا سب سے بڑا لغت ہے، لیکن وہ ایک انگریز (فیلن صاحب) کی تحریک کا نتیجہ اور حیدرآباد کی علمی قدر دانی کا پرتو ہے، امیر اللغات اس سے بہتر لکھی جانے والی تھی، لیکن وہ نا قدر دان رئیسون کے ہاتھون مین پھنسی ہی،

اگر ترتیب جدید کا سوال چھوڑ دیجئے تو عربی و فارسی کے لغات بھی اردو مین موجود ہین، کئی زبانون کے مشترک ضخیم لغت بھی لکھے گئے ہین، مڈیکل اور قانونی ڈکشنری بھی اردو مین موجود ہے، جدید علوم و فنون پر اردو مین اس کی بیچارگی اور کس مپرسی پر نظر رکھکر کم کتابین نہین لکھی گئی ہین، تقریبًا ہر فن پر دو ایک کتابین اردو مین موجود ہین، لیکن وہ گمنامی کے پردہ مین چھپ کر رہ گئی ہین، ہم نے ان مین سے کچھ کتابون کی فہرست اسلامی ہندوستان کے عہد آخر مین دی تھی، بقیہ کتابین جو غدر کے بعد لکھی گئی ہین، ان کی فہرست بھی زیر نظر

وتلاش ہے،

اس تمام یاوہ گوئی اور درازنفسی سے مقصود یہ ہے کہ اردو زبان کی حقیقی ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک حکومت اپنے نظامِ تعلیمی مین تغیر نہ کرے، یا ہم اپنی مادری زبان کی پرستش کی وہ مثال نہ پیش کرین جو سرزمین بنگالہ کے جادوگر اور مہاراشٹر کے سورما اپنی اپنی زبانون کے متعلق پیش کر رہے ہین،

اگر یہ دونون صورتین ممکن نہین تو پروفیسر براؤن کے اس حکم کی ہم کیونکر تعمیل کر سکتے ہین کہ اردو فارسی، اور عربی کی لاکھون جلدین "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کیجائین اور اس کثرت سے شائع کیجائین کہ بچہ بچہ کے ہاتھون مین ہون،

(معارف ستمبر ۱۹۱۷ء)

ہوم رُول سے پہلے!

ہُوم لینگویج (ملکی زبان)

ہندوستان مین آجکل سیاسی خیالات مین جو مد وجزر نمودار ہو رہا ہے اس سے توقعات کے کشت زار مین نئی امنگین پیدا ہو گئی ہین، گو مسلمانون کو ایک عرصۂ دراز تک برادرانِ وطن کے سیاسی خیالات سے ہمدردی نہین رہی لیکن اب واقعات کی رَو بالکل بدل گئی ہے، اب یہ خیال ہے کہ سیاسیات کی سطح مین جنبش تو پیدا ہو رہی ہے، جب دریا اپنی اصلی رو پر آئیگا تو اپنی رو کا رُخ ہر طرف پھیرے گا،

ان ہی مباحث مین سب سے اوّل زبان کا مسئلہ ہے، اور ہمارے خیال مین یہ مسئلہ ہوم رول سے بہت پہلے حل ہونے کے لائق ہے، افسوس ہوتا ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ یہ سیاسی خیالات بیگانہ زبان کی محض ترجمانی ہے، یہ خلاقِ عالم کی مخلوق زبان کی آواز نہین ہے، بلکہ امریکن اڈیسن کی مصنوعی زبان کی آواز ہے، دسمبر ۱۹۱۶ء کے معارف مین اردو انسائیکلوپیڈیا کی تقریب سے جو مضمون ہم نے لکھا تھا، اس کی تمہید مین عرض کیا تھا،

"اگر ہندوستان سے انگریزی زبان چھین لیجائے اور یہ فرض کر لیا جائے کہ ملک کے

تمام صوبوں اور گوشوں سے نائبانِ ملک اور نمایندگانِ اقوام کی ایک عظیم الشان مجلس شوریٰ قائم ہے، ہمارا قومی اسپیکر اب ہمارے متحدہ پلیٹ فارم پر آتا ہے، سوال یہہ کہ ہم کو کس زبان مین مخاطب کرے گا، وہ جوش اور جذبات سے لبریز ہے، لیکن کیا پنجابی زبان اس کے خیالات کی ترجمانی کرے گی؟ کیا بنگالی اور مرہٹی زبان اس مختلف اللسان مجمع کی گرہ کشائی کریگی"

اس لئے ہوم رول کے تخیل سے پہلے ورنہ کم از کم ساتھ ساتھ ہوم لنگویج کا فیصلہ کر لینا چاہئے، ہمارے برادرانِ وطن اس خیال سے غافل نہین ہین، اور اس مشکل پر ان کی نظر ہم سے پہلے پہنچ چکی ہے، جولائی سنہ ۱۹۱۷ء کے اخبارون مین مسٹر گاندھی کا وہ عاقلانہ مضمون شائع ہوچکا ہے، جس مین انھون نے ہندی نام ایک عنقا صفت زبان کو ہندوستان کی عمومی زبان کا درجہ دینے کی تحریک کی ہے، اواخر دسمبر سنہ ۱۶ء مین لکھنؤ مین اس مجلس کا اجلاس ہوچکا ہے جسکا مقصد ساری ہندوستان مین ایک زبان اور ایک خط جاری کرنا ہے، اور اس سے ان کی مراد ہندی ہے،

۱۰- اگست سنہ ۱۹۱۷ء کی یوپی اسپشل کانگریس کے پلیٹ فارم پر رفاہ عام کلب کے وسیع ہال مین الہ آباد کے مشہور لیڈر سے جب انگریزی مین تقریر کرنے کی فرمائش کی گئی تو اس نے کہا،

"آپ لوگ ہوم رول چاہتے ہین اور مجھ سے کہتے ہین کہ انگریزی مین بولو، کیا ہوم رول ملنے پر کوئی انگریزی مین بولا کرے گا، اگر ہوم رول کے بعد بھی آپ انگریزی مین بولا کرینگے، تو ہوم رول کچھ فائدہ کی چیز نہ ہوگی، اگر آپکے پاس ایسی زبان نہین جس مین

اپنی ضرورت کی باتون کو کہہ سکین تو ہوم رول کی آپ کو کچھ ضرورت نہین ہے۔"

اس روح کا سب سے بڑا مظہر مسٹر گاندھی کی اس تجویز مین ہے کہ امسال آل انڈیا کانگرس کے صدر مجلس کی تقریر اردو ہندی یا ہندوستانی مین ہو، اگر اس تجویز پر عمل ہوا تو مسلم لیگ کے لئے بلکہ سب سے زیادہ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے ایک تازیانہ ہوگا، جہان صدر مجلس کیلئے اردو بولنا انتہائی تحقیر ہے، ہمارے نوجوان انگریزی خوان معترض ہین کہ جمعہ اور عیدین کا خطبہ عربی مین ہونا بالکل بے فائدہ ہے کہ خطبہ سے مقصود نصیحت ہے، اور وہ اس زبان مین ہونا چاہیے جس کو حاضرین مسجد سمجھتے ہون، شاید ہماری قومی مجلسین جو جامع مسجدون کا اگر حکم نہین رکھتین تو عیدگاہون کا حکم ان پر ضرور عائد کرنا چاہیے کہ زرق برق کپڑون کی سالانہ نمائشگاہ وہ بھی ہے، ان قومی عیدگاہون مین انگریزی تقریرین مساجد کے عربی خطبون سے کہین زیادہ بے سود اور کہین زیادہ بے فائدہ ہین،

اصل یہ ہے کہ ہندوستان جس مرض کا بیمار ہے اس کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ "ملکی زبان مین تعلیم" ہے، جب تک اس نسخہ کی آزمائش نہ ہوگی ہماری مشکلات کا خاتمہ نہ ہوگا ہماری تعلیمی ترقی کا سب سے صحیح رستہ وہی تھا جو سائنٹفک سوسائٹی کی روشنی مین سر سید کو ۱۸۶۳ء مین نظر آیا تھا، اور جس پر ایک مدت تک وہ قدم زن بھی رہے، اس سوسائٹی کا مقصد یہ تھا کہ ملکی زبان کے ذریعہ سے قوم مین تعلیم کی اشاعت کیجائے، چنانچہ اس سوسائٹی کے ذریعہ سے چالیس کتابین اردو زبان مین لکھی اور چھاپی گئین، ۳۰، ہزار کی لاگت سے علیگڈھ مین اس کے لئے عمارت بنی، اور چند ہی دنون مین اس نے ملک اور حکومت دونون

مین اقتدار پیدا کر لیا، وزیر ہند نے اس کی سرپرستی قبول کر لی،

اسی سوسائٹی سے ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو برٹش انڈین ایسوسی ایشن پیدا ہوئی جس نے یکم اگست ۱۸۶۷ء کو ویسراے کی خدمت مین حسب ذیل عرضداشت پیش کی،

(۱) اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس مین بڑے بڑے علوم وفنون کی تعلیم دیسی زبان مین ہوا کرے،

(۲) دیسی زبانون مین ان ہی مضمونون کا سالانہ امتحان ہوا کرے جن مین کہ اب طلبہ کلکتہ یونیورسٹی مین انگریزی مین امتحان دیتے ہین،

(۳) جو سندین انگریزی خوان طلبہ کو اب علم کی مختلف شاخون مین معاوضہ تحصیل لیاقت عطا ہوتی ہین، وہی سندین ان طلبہ کو عطا ہوا کرین جو ان ہی مضمونون کا دیسی زبان مین امتحان دے کر کامیاب ہون،

(۴) یا تو ایک اردو فیکلٹی کلکتہ یونیورسٹی مین قائم کیجائے یا شمالی مغربی اضلاع مین ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو،

یہ اصلی نظام کار تھا جس پر اہل ملک کو کام کرنا چاہئے تھا، ایسوسی ایشن کی اس تجویز کو گورنمنٹ نے بھی نظر قبول سے دیکھا، لیکن پھر خدا جانے وہ کونسا جادو تھا جس نے سید کے خیال کو مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دیا، اور ۱۸۶۲ء مین جب دیسی زبان کی تعلیم کا مسئلہ پیش ہوا تو انھون نے نہایت دلیری سے اس کے خلاف گواہی دی، اور وہ مدرستہ العلوم مسلمانان "جسکا مقصد ایک مشرقی یونیورسٹی کا قیام تھا، ایک خاص انگریزی کے کالج سے

مبتدل ہوگیا، اب گو مسلم یونیورسٹی کا تخیل سامنے ہے، تاہم سفر کا رخ چشمۂ حیوان کی طرف نہین بلکہ ظلمات کی سمت ہے۔

پچاس برس کے بعد مردہ ہڈیون مین پھر جان آئی یعنی گورنمنٹ کے سامنے دیسی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی تجویز پیش کی گئی، اگست سنہ ۱۵ء کی بیچ کی تاریخون مین بمقام شملہ اس غرض سے جو مجلس منعقد ہوئی تھی، ہز اکسلنسی وائسراے نے اس مین اپنے خیالات ان الفاظ مین ظاہر فرمائے،

آپ کو زیر بحث مسائل پر صرف تعلیمی نقطۂ نظر سے بحث کرنی چاہیے یعنی انگریزی تعلیم کی ترقی کیونکر ہو سکتی ہے؟ تعلیم کا ذریعہ انگریزی ہو یا دیسی زبانین ہون، اور انگریزی لازمی زبان ثانوی کے طور پر سکھائی جائے، یہ امر اب خارج از بحث ہے کہ ہم اپنے طریقۂ تعلیم کے مسلمہ طرز کو بالکل بدل ڈالین،

تعلیم یافتہ جماعتون کے فوائد انگریزی تعلیم کی سطح پر قائم ہین جو اب تمام ہندوستان کی قومی زبان ہوگئی ہے، اگرچہ مجھے ان اصحاب کیساتھ دلی ہمدردی ہے، جو دیسی زبانون سے بے پروائی کئے جانے کے شاکی ہین، لیکن اب انگریزی کا درجہ دیسی زبانون کو دیا جانا عملی پالیٹکس سے باہر ہے، اس مسئلہ مین سب سے بڑی دقت مختلف دیسی زبانون کا وجود ہے، جس کا کوئی قابل اطمینان علاج اب تک پیش نہین کیا گیا،

ہز اکسلنسی ہم کو اپنے جائز حق سے محروم نہین کرتے بلکہ مختلف دیسی زبانون کے تصادم کا علاج پوچھتے ہین، ہمارے نزدیک تو صرف اس کا علاج **اردو زبان** ہی ہے جسکی عملاً ہمہ گیری اور

عمومیت سے کوئی انکار نہین کرسکتا، اور اگر دیگر ملکی فرقون کو اس فیصلہ سے اتفاق نہین تو کانگریس و مسلم لیگ کے بیسیون مختلف العقائد مذاہب سیاسیہ کا حل ایک مخصوص مشترک جلسہ سے کیا جا چکا ہے، زبان کی اہمیت کا مسئلہ اسقدر پست نہین ہی کہ اسکی خاطر کوئی مشترک فیصلہ کن اجلاس انعقاد نہ پاسکے،

اردو اور ہندی کا جو لوگ سوال اٹھاتے ہین وہ درحقیقت زبان کے فلسفہ سے بیگانہ ہین، زبان کے خط کے لحاظ سے تو یہ سوال ہوسکتا ہی کہ ہندوستان کی زبان کس خط مین لکھی جائے لیکن اس سوال کو صوبون کے رواج پر چھوڑ دینا چاہئے، رفتہ رفتہ یہ اختلافات خود مٹ جائینگے، ہم کو اصل زبان کے ذخیرۂ الفاظ پر غور کرنا چاہئے،

زبان مین تین چیزین ہوتی ہین، اسم فعل اور حرف، زبان کی اصل ماہیت فعل اور حرف ہین، اسم دوسری زبانون سے آتے رہتے ہین اور مٹتے جاتے ہین، اور بدلتے جاتے ہین، عربی زبان مین سیکڑون لفظ دوسری زبانون سے آئے ہین، فارسی مین ہزارون عربی الفاظ مستعمل ہین، انگریزی مین لاتعداد یونانی اور لیٹن لفظ ہین، تاہم ان کو عربی اور فارسی اور انگریزی ہی کہین گے، اسی طریقہ سے اگر ہماری اردو مین آدھے فارسی اور عربی اسماء مل گئے ہین تو اس سے وہ ہندی ہونے سے خارج نہین ہوسکتی، جبکہ اس کے سارے افعال سارے حروف اور آدھے اسماء بھاشا اور ہندی ہین، یہ سچ ہی کہ ہندو اور مسلمانون کی قومی اور مذہبی ضرورتون کے لحاظ سے جو کبھی مٹ نہین سکتین ان کا خزانہ عاریت قومیت اور قومیت کی ضروریات کے اختلاف سے عربی و فارسی و سنسکرت ہی رہیگا، اور اس مین کچھ حرج نہین، مصر کے مسلمانون اور عیسائیون کی زبان عربی ہے لیکن عیسائیون کی تمام مخصوص قومی اور مذہبی اصطلاحات قبطی ہین، اور مسلمانون کی عربی، پھر بھی وہ ایک ہی زبان بولتے ہین،

انڈیا آفس لائبریری

مین

اُردو کا خزانہ

اس وقت مین معارف کے ناظرین سے سات ہزار میل دور ہون، بار بار جی چاہا کہ اس عجائبستانِ عالم سے ان کے لائق کوئی تحفہ بھیجون، مگر واقعہ یہ ہے کہ ۲۶؍ فروری سے (یعنی جس دن سے ہمارا وفد انگلستان کے ساحل پر اترا) آج ۲۷؍ اپریل تک شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا جو آمد و رفت اور ملاقات سے خالی ہو، لندن چھوڑ کر کبھی پیرس اور کبھی اور کہین جانا پڑتا ہے، اور اب انگلستان کے دوسرے شہرون کا دورہ شروع ہوتا ہے، کل رات کو اڈنبرا، وہان سے مینچسٹر، ۳؍ مئی کو کیمبرج اور واپسی کے بعد ۵؍ کو پیرس، غرض

ایک چکر ہے مری پانون مین زنجیر نہین

گو میری مصروفیت وفد کے دوسرے ارکان، محترم محمد علی و سید حسین صاحب سے بہت کم ہے، پھر بھی اتنی کہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا، جس کی معافی چاہتا ہون، اس دوران مین اُس ایوانِ حکومت مین جس کا نام انڈیا آفس ہے، تین چار دفعہ جانے کا اتفاق ہوا،

اس عمارت مین جہان سیکڑون حقیقی و مجازی زیارت گاہین ہین، ایک نے یادگار کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری اسی عمارت کے ایک گوشہ مین واقع ہے، اور ہندوستان کی علمی تاریخ کا مرقع ہے، ایک گول ریڈنگ روم (مطالعہ کا کمرہ) ہے، اس کے ایک پہلو مین کتب خانہ ہے، دوسرے پہلو مین کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہین، جو کتبخانہ کے مہتممون کے دفتر ہین، مسٹر اسٹوری جو پہلے علی گڈہ کالج مین عربی پروفیسر تھے، وہ یہان اسسٹنٹ لائبریرین ہین، ڈاکٹر آرنلڈ جو کسی زمانہ مین علی گڈہ کے گذشتہ علمی دور کے ایک ممبر تھے وہ گو لائبریری سے تعلق نہین رکھتے لیکن انڈیا آفس سے متعلق ہین، مین ان دونون بزرگون کا ممنون ہون کہ انھون نے لائبریری کے دیکھنے مین ہر طرح مدد دی،

اس لائبریری مین عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، ہندی کتابون کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، عربی اور فارسی کی بعض نادر قلمی کتابین نظر سے گذرین، قطعات کا ایک نادر مجموعہ یہان دیکھا جو کبھی ممتاز محل بیگم کی ملک تھا، یہ وہی ممتاز محل ہین جو شاہجہان کی چہیتی بیوی تھین اور جن کے غیر فانی نام کو تاج محل ہمیشہ زندہ رکھیگا،

تصویرون کا ایک مرقع مجھے دکھایا گیا جو دارا شکوہ کی ملکیت مین تھا، اس مین شہزادہ کے مختلف عہد کی، بچپن، تعلیم، جوانی کی تصویرین ہین، کوفی خط مین لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا جو نہایت عتیق نسخہ تھا، یہ نسخہ قدیم عربی خط کے مطابق زیر و زبر اور نقطون سے خالی ہے، مجھے ہندوستان مین تاریخ شیر شاہی کی تلاش تھی، یہان اس کے متعدد نسخے دیکھے مگر افسوس کہ کتاب کی نوعیت کی نسبت جو ذہن مین خیال تھا وہ صحیح نہین نکلا،

اس وقت سرسری طور سے مین کتبخانہ کی اردو کتابون کے ذخیرہ[1] کا ذکر کرنا چاہتا ہون
انڈیا آفس لائبریری تقریبًا اسی وقت سے قائم ہے جب سے اردو نے اپنی ترقی کا آغاز کیا ہی،
اور اگلے انگریزون کو چونکہ اپنی نئی حکومت کی تازہ ترین زبان سے غیر معمولی دلچسپی تھی،
اس لئے اس لائبریری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اُردو کی قدیم ترین کتابین جو ہندوستان
مین ناپید ہین، وہ یہان موجود ہین، اردو کی مطبوعہ کتابون کی فہرست ایک جلد مین
جو ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے چھپی ہی، اس فہرست کو بلوم ہارٹ صاحب (J. F. Blumhardt)
نے مرتب کیا ہے، یہ اردو کے فاضل ہین اور کسی زمانہ مین ہندوستان بھی رہ چکے
ہین، قلمی کتابون کی فہرست بھی اُن کے زیر تحریر ہے، مسٹر اسٹوری نے اس کا مسودہ خاص
طور سے منگوا کر دکھایا، مگر چونکہ بلوم ہارٹ صاحب خود موجود نہ تھے، اس لئے ان کے
بلا اجازت اس مسودہ سے فائدہ نہ اٹھا سکا،

بہرحال مطبوعہ اردو کتابون کی اہمیت بھی یہان میری نگاہ مین کچھ کم نظر نہ آئی
اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ الحمد للہ ہماری زبان بھی اتنی ترقی پا چکی ہی،
کہ تین سو صفحون مین اس کی فہرست تمام ہوئی ہے، یہ فہرست سنہ ۱۹۰۰ء مین چھپی ہے،
اس لئے موجودہ بیسوین صدی کی کتابین اس مین شامل نہین ہین، اس فہرست کو دیکھکر یہ تعجب
ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن رہی تھی، دوسری بات یہ
نظر آئی کہ اس زبان کو علمی زبان بنانے مین مسلمان اور ہندو دونون اہل قلم کا برابر کا

[1] انگلستان مین اردو کتابون کے ذخیرہ کے متعلق یہ پہلی اطلاع ہندوستان مین شائع ہوئی، "س"

ساجھا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دُنیا میں موجود تھا،

بہرحال اردو کتابوں کی یہ فہرست، جو صرف مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، چھ عنوانوں پر بٹی ہے علوم و فنون[۱]، تاریخ و جغرافیہ[۲]، ادبیات[۳]، کتب تعلیمی[۴]، الہیات[۵]، متفرقات[۶]،

ہر ایک عنوان کے تحت میں حسب ذیل تقسیمات ہیں،

۱۔ علوم و فنون

۱	زراعت و نباتات،	۱۰	قانون
۲	صنعت و حرفت،	۱۱	انگریزی قانون،
۳	ہیئت و نجوم،	۱۲	ہندو قانون،
۴	علم الطبخ،	۱۳	اسلامی قانون،
۵	نیرنگ و طلسمات،	۱۴	منطق و فلسفہ،
۶	علم المنزل و قواعد صحت،	۱۵	طب و تشریح،
۷	نقشہ کشی،	۱۶	علم الحرب،
۸	اخلاق،	۱۷	موسیقی،
۹	ورزش و سپہگری،	۱۸	لغت،

۱۹	علم السند،	۲۲	علم المعانی والبیان،
۲۰	طبعیات،	۲۳	اجتماعیات،
۲۱	معاشیات،	۲۴	طب حیوانات (بیطاری)

۲- تاریخ و جغرافیہ

۱	عام سوانحعمریاں،	۶	جغرافیہ و تقویم البلدان (ٹاپوگرافی)
۲	سوانح محمد صلعم،	۷	عام تاریخ،
۳	سوانح ائمہ کرام،	۸	مقامی تاریخ،
۴	حالات قبائل وفرق	۹	سفرنامہ،
۵	علم الانساب،		

۳- ادبیات

۱	دواوین،	۶	عام شاعری،
۲	ڈراما،	۷	تذکرۂ شعراء،
۳	خطوط و مکاتیب،	۸	مذہبی شاعری،
۴	انتقادات ادبیہ،	۹	مذہبی ہندو شاعری،
۵	شاعری،	۱۰	مذہبی اسلامی شاعری،

۱۱	محاورات وامثال،	۱۳	قصص منظومہ،
۱۲	قصص وافسانہ،	۱۴	قصص منثورہ

۴- تعلیمی کتابیں

۱	قواعد،	۱۱	علم جبرومقابلہ،
۲	قواعد عربی،	۱۲	علم الحساب،
۳	قواعد برگسنا (پشتو)	۱۳	علم حساب الکلیات والجزئیات،
۴	قواعد انگریزی،	۱۴	اقلیدس،
۵	قواعد ہندی،	۱۵	علم المساحۃ،
۶	قواعد ہندوستانی (اردو)	۱۶	علم وزن وپیمایش،
۷	قواعد کشمیری،	۱۷	علم المخروطات والاشکال،
۸	قواعد فارسی،	۱۸	علم المثلثات،
۹	علم الخط،	۱۹	ابتدائی تعلیمی کتابیں، (ریڈرس)
۱۰	ریاضیات،	۲۰	انتخابات،

۵- الٰہیات

۱	برہمنی اور لامذہبی،	۳	عیسائی
۲	بودھی،	۴	بائبل،

۵	بائبل لٹریچر،	۱۲	جینی مذہب،
۶	تاریخِ کلیسیا،	۱۳	اسلام،
۷	تعلیمات،	۱۴	عبادات،
۸	ادعیہ و مزامیر،	۱۵	عقائد،
۹	قصص،	۱۶	قرانیات،
۱۰	مناظرہ و موازنۂ ادیان،	۱۷	حدیث،
۱۱	ہندو مذہب،	۱۸	سکھ مذہب،

۶۔ متفرقات

۱	تعلیمات،	۴	مجموعہ ہاے تقریر و مضامین،
۲	تعلیم النسوان،	۵	رسائل موقت الشیوع،
۳	تعلیم الصبیان،	۶	رودادِ مجالس،

ذیل مین ان چھ عنوانون مین سے چند کتابون کے نام، مصنف کے نام اور تاریخ طبع اور مقامِ طبع لکھے جاتے ہین، اس انتخاب مین قصداً صرف وہی کتابین لی ہین جو غدر سے پہلے یا اس کے بعد کسی قریب زمانہ مین لکھی گئی ہین، قصص و منظومات کو ہاتھ نہین لگایا ہے، کہ ہر شخص جانتا ہے، کہ اردو مین ان کا بڑا ذخیرہ ہے، صرف علمی کتابین لی ہین، ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علومِ جدیدہ کی مختلف شاخون مین کس تیزی سے اردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی، جب تک وہ سارے

ملک کی متحدزبان تھی، اور نفاق قومی سے ناآشنا تھی،

فن زراعت

۱ چاے لگانے کی کتاب، ۷۱ صفحہ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۸۵۴ء،

۲ گنگا کی نہر، مترجمہ سدا سکھ لال از انگریزی صفحہ ۲۴، سنہ ۱۸۵۴ء، مطبوعہ آگرہ،

۳ کھیت کرم، مصنفہ کالی راے، تین حصے، دہلی سنہ ۱۸۴۶ء و سنہ ۱۸۴۹ء و سنہ ۱۸۵۰ء،

۴ پندنامہ کاشتکاری، مصنفہ موتی لال، آگرہ سنہ ۱۸۵۲ء،

۵ علم الفلاحۃ، رابرٹ اسکاٹ برن صفحہ ۲۵۲، علی گڈہ سنہ ۱۸۶۵ء،

۶ علم الفلاحۃ، میجر کاربرٹ، الہ آباد سنہ ۱۸۶۹ء،

۷ ریشم کا کیڑا، موتی لال، لاہور، سنہ ۱۸۵۳ء،

۸ تجربۂ ملخ، غلام نبی، میرٹھ، سنہ ۱۸۶۵ء،

۹ توصیفِ زراعت، کلب حسین خان، آگرہ، سنہ ۱۸۴۸ء

سائنٹفک کتابیں

۱ بحر الحکمت، (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن، سنہ ۱۸۴۷ء، لکھنو،

۲ بخار کی کل، ″ ایشوری لال، سنہ ۱۸۵۵ء، بنارس،

۳ نور النواظر، احمد علی، کانپور سنہ ۱۸۵۴ء،

٤	علم تعمیر، کالی پرشاد اور سید علی، ١٨٧٣ء پٹنہ،
٥	قانونِ انطباع، (چھاپہ) سیتل سنگھ دہلی ١٨٤٤ء،

نجوم و ہیئت کی کتابیں

١	خلاصہ نظام آسمانی، پنڈت داسی دہیرا، آگرہ، ١٨٥٢ء،
٢	مفتاح الافلاک، عبدالسلام، کلکتہ ١٨٣٣ء صفحہ ٢٧٢،
٣	نظامِ آسمانی (انگریزی مع ترجمہ ہندوستانی) کلکتہ ١٨٣٦ء،
٤	مختصر احوالِ نظام آسمانی، ١٨٤٠ء، آگرہ،
٥	مختصر دقائق النجوم، بڑے صاحب گھاٹے، مدراس ١٨٤٨ء،
٦	اصول علم ہیئت، رام چندر، دہلی ١٨٤٨ء، صفحہ ٣٢٥،
٧	علم ہیئت، مترجمہ لفٹنٹ میلس، لکھنؤ ١٨٣٢ء۔

جغرافیہ

١	ترجمہ مراصد الاطلاع، (عربی) در اردو، عبدالمومن ١٨٦١-٦٢ء رپورٹ بلیر، جلد ٣
٢	فتح گڈھ نامہ، (احوال ضلع فتح گڈھ) کالی رائے، دہلی ١٨٤٩ء صفحہ ٢٠٤،
٣	علم جغرافیہ، مترجمہ میر غلام علی، کلکتہ ١٨٥١ء صفحہ ٢٢٠،
٤	جغرافیۂ عالم، دہلی ١٨٥٣ء صفحہ ١٠٩،

۵ خلاصۂ علم الارض، (مع انگریزی) کلکتہ ۱۸۲۴ء،

۶ خلاصۃ الجغرافیہ، آگرہ، ۱۸۵۴ء،

۷ مرآۃ الاقالیم، کلکتہ، ۱۸۳۶ء صفحہ ۱۸۰،

۸ مختصر بیان جغرافیۂ ہند، پنڈت چنتامنی کانپور ۱۸۶۷ء،

۹ جغرافیہ کا پہلا رسالہ، مترجم از انگریزی، میر غلام علی، مدراس ۱۸۵۳ء،

۱۰ جغرافیۂ ہند از انگریزی، پنڈت سواروپ نرائن و سیواروپ نرائن دہلی ۱۸۴۸ء صفحہ ۱۲۳

طبعیات

۱ عجائب روزگار، رام چندر، دہلی ۱۸۴۷ء،

۲ بجلی کی ڈاک، جے، ڈبلو، بیل، آگرہ، ۱۸۵۴ء،

۳ ہوا کا بیان، بدری لال، بنارس ۱۸۵۴ء،

۴ علم حکمت، (میکنکس) چارلیس فنک، کلکتہ، ۱۸۴۳ء صفحہ ۳۰۱،

۵ معدنیات، جواہر لال، آگرہ، ۱۸۵۵ء،

۶ خلاصۃ الصنائع، (ترجمہ از انگریزی) بھولا ناتھ، آگرہ ۱۸۵۴ء صفحہ ۱۱۲،

۷ مرآۃ العلوم، ہری ورمن لال، بنارس، ۱۸۴۹ء،

۸ رسالۂ مقناطیس، ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین، دہلی ۱۸۵۰ء صفحہ ۱۲۷،

۹ تحصیل فی جر الثقیل، سید احمد خان، آگرہ، ۱۸۴۴ء،

۱۰- اصول علم طبعی، ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد و سیوا پرشاد، دہلی ۱۸۴۷ء صفحہ ۱۶۹

۱۱- اصول جراثقیل، محمد احسن، بنارس ۱۸۵۴ء،

۱۲- اصول قواعد مائیات، ترجمہ انگریزی، اجودھیا پرشاد، دہلی ۱۸۵۰ء صفحہ ۲۶۴

۱۳- مقاصد العلوم، ترجمہ انگریزی، سید محمد میر ۱۸۴۱ء کلکتہ،

۱۴- دائرہ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کرم بخش، لکھنؤ ۱۸۶۶ء،

معاشیات (پولیٹکل اکانومی)

۱- ترجمہ معاشیات مل، وزیر علی، دہلی ۱۸۴۴ء صفحہ ۴۱۸۰،

۲- اصول علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، دھرم نراین، دہلی ۱۸۴۶ء،

۳- اصول سیاست مدن، دھرم سہا، علی گڈھ، ۱۸۶۹ء،

۴- علم انتظام مدن، ترجمہ انگریزی، ناسو ولیم سینیر، علی گڈھ ۱۸۶۴ء،

علم معاشرت

۱- اقبال فرنگ، بیان عادات و آداب و احوال فرنگ، نواب اقبال الدولہ بہادر، کلکتہ ۱۸۳۴ء،

۲- دستور عمل اموات شادی و غمی، چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۸ء،

۳- اشتہار کمیٹی، درباب تخفیف مصارف شادی، آگرہ ۱۸۶۸ء،

۴۔ ترمیم ضوابط شادی، آگرہ سنہ ۱۸۶۸ء،

۵۔ ضوابط شادی آرہ، سنہ ۱۸۶۸ء، ایضاً پٹنہ، سنہ ۱۸۷۲ء،

منطق

۱۔ ترجمہ شمسیہ، مولوی سید محمد، دہلی سنہ ۱۸۴۴ء،

۲۔ میزان العلوم، سید عبد العلی، پٹنہ، سنہ ۱۸۶۹ء،

۳۔ خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد بدایونی سنہ ۱۸۶۹ء،

لائبریری کے بند ہونے کا وقت آگیا، اس لئے مجبوراً یہ فہرست تمام ہوتی ہے، ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اس تمام ذخیرہ کا ایک سرسری جائزہ ناظرینِ معارف کے پیشکش کرسکتا،

(معارف ماہ جون سنہ ۱۹۲۰ء)

۲۷ر اپریل سنہ ۱۹۲۰ء

البرٹ ہال مینشن، لندن،

انجمن اردوئے معلّٰی کے چند سوالون کے جواب

"دسمبر ۱۹۲۵ء مین علی گڈھ یونیورسٹی کی جوبلی منائی گئی تھی، اس تقریب سے ہمارے دوست پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی نے اردو سے دلچسپی رکھنے والے چند صاحبون کے پاس اردو کی ترقی کے متعلق کچھ سوال لکھ کر بھیجے تھے، اور ان کا جواب مانگا تھا مین نے ان کا جو جواب لکھی وہ موصوف نے جنوری ۱۹۲۶ء کے سہیل مین چھاپا تھا، اس وقت اس جواب مین جو تجویزین پیش کی گئی تھین وہ اس وقت انوکھی معلوم ہوتی تھین، مگر اب چودہ برس کے بعد دیکھئے کہ ان مین سے کتنی تجویزون پر زمانہ نے عمل کرا دیا، اور اب کتنی باقی ہین،

یہ جوابی مضمون شروع کی تمہیدی سطرون، اور آخر کے غیر اہم سوالون کو چھوڑ کر درجِ ذیل ہے، سوالات یہ تھے،

۱- اردو مین ہندوستان کی مقبول اور مشترک زبان بننے کی کہانتک صلاحیت ہے؟ اور یہ مقصد کس طور پر حاصل ہو سکتا ہے؟

۲- اردو کو دنیا کی سنجیدہ اور علمی زبانون کی سطح پر لانے کیلئے آپ کیا تجاویز پیش کرتے ہین

۳۔ ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار یا ناخوشگوار رکھنے یا بنانے مین اردو کا کہان تک دخل ہے، کیا آپ کوئی ایسی تجویز پیش کرینگے جو اس کشاکش کا بطریق احسن ازالہ یا انسداد کر سکے،

۴۔ کیا ایسی مرکزی انجمن یا اکاڈیمی کی ضرورت ہے اور اس کا قیام ممکن ہے جو عام طور سے اردو کے لئے مفید ہو، اور اسکی رہنمائی کر سکتی ہو، اگر اس کا جواب اثبات مین ہے تو اسکو قائم اور کامیاب بنانے کے لئے آپ کی تفصیلی تجاویز کیا ہونگی،

عبارت مین کہین کہین لفظی اصلاحین کی گئی ہین،

ہندوستان کا عموماً یہ حال رہا ہے کہ جس صوبہ مین جو راج بنا، اور جہانتک وہ پھیلا وہین کی بولی اس ملک کی زبان بنی اور پورے راج مین پھیل گئی، جب اس صوبہ کی سلطنت مٹ کر دوسرے صوبہ کی سلطنت قائم ہوتی تو پھر اس دوسرے صوبہ کی زبان کو عمومی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی، اس طرح ہندوستان مین جس طرح صوبون کی سلطنت کا نشیب و فراز بدلتا رہا اسی طرح زبانون کا بھی اتار چڑھاؤ ہوا کیا، اس طرح ہندوستان کے مختلف زمانون مین مختلف زبانون کو ہندوستان کی عام زبان بننے کا فخر حاصل ہوا، مسلمان آئے تو یہ درجہ فارسی کو حاصل ہوا، اسی کے ساتھ پنجاب، دلی، اودھ، بہار، اور ڈھاکہ و مرشدآباد وغیرہ مین جہانتک ان کی ادبی سلطنت پھیلی، وہان کے نئے اور پرانے باشندون نے مل کر عام بول چال، خرید و فروخت، وعظ و نصیحت، سمجھانے بجھانے کے لئے ایک ملفوبہ زبان اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، جس کا ابتدائی نام ہندی تھا، بعد کو اردو پڑا،

مسلمانون کے بعد انگریزون کی سلطنت آئی تو ان کو بھی پورے ملک کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھون نے ہندوستانی کے نام سے اس کو اور فروغ دیا،

(الف) الغرض اوپر کی سطرون سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستان کا ملک ہمیشہ ایک مشترک اور عام زبان کا محتاج رہا ہے، اور اس کی وہ زبان سیاسی انقلابون کے ساتھ بدلتی رہی ہی،

(ب) ہندوستان کی حیثیت ایسی مختلف قومون کے وطن کی ہے جن مین سے ہر ایک کی زبان دوسری سے مختلف ہے، اس لئے ایسے ملک کی کوئی دائمی مستقل اور مشترک زبان اگر بن سکتی ہے، تو وہی جو ہندوستان کی مختلف بولیون کا مجموعہ اور سب قومون کے باہمی میل جول کا نتیجہ ہو،

(ج) تصنیفات کی کثرت، مطبعون کے رواج، اخبارات کی اشاعت، ریلون کی وسعت اور سفر کی آسانیون نے پہلے سے بہت زیادہ اس ملک مین ایک مشترک زبان کی ضرورت ظاہر کردی ہے،

(د) چونکہ مختلف قومون کا باہمی میل جول ہی اس زبان کی پیدائش کا سبب ہے، اس لئے خود بخود جہانتک ریلون کی لائینین بچھتی جاتی ہین، یہ مشترک زبان کسی نہ کسی شکل مین موجود ہے،

اس وقت ہندی نام کوئی بول چال کی زبان کسی صوبہ کی نہین ہے، موجودہ

اردو اور ہندی مین جو فرق ہے وہ افعال اور حروف کا نہین ہے، بلکہ صرف اسمار کا ہے، یہ اسمار، ہر قوم اور صوبہ کے حسب حال کچھ نہ کچھ بدلتے ہی رہین گے، مگر بہرحال وہ اردو ہی رہے گی، اور وہی ہندوستان کی مشترک زبان بن سکتی ہے، ثبوت کیلئے نظری اور منطقی دلیلون کی ضرورت نہین، بلکہ خود عملی واقعہ اس کی دلیل ہے، پیشاور سے لے کر تم بمبئی تک سفر کرو، پھر کراچی سے لیکر ہمالیہ تک آؤ، ہر اسٹیشن پر ہر قلی، ہر خوانچہ فروش سے، ہر دوکاندار سے، ہر ساتھی سے، ہر گاڑی والے سے اگر تم اس صوبہ کی خاص زبان نہین جانتے، تو یہی ہندوستانی زبان تمھاری رفیق ہے، اور وہی ہر جگہ تمھاری زبان سے نکلتی ہے اور نکلے گی، اس لئے معمولی کاروبار اور بول چال کی حیثیت سے تو وہ اس وقت بھی ہندوستان کی مشترک زبان ہے، جو کچھ بحث ہے وہ یہ ہے کہ اس کو ہندوستان کی ساری قومین اپنی علمی اور تعلیمی مشترک زبان مان لین،

اس وقت اردو کی حالت یہ ہے کہ جہان تک عام اور مشترک ضرورت کا لگاؤ ہے، وہ ہندوستان کی مختلف بولیون والی قومون کے درمیان جان پہچان اور بول چال کا رشتہ بنی ہوئی ہے، ہندوستان کی تمام بڑی بڑی قومین ہندو، مسلمان سکھ، عیسائی اگر وہ انگریزی نہ جانتی ہون تو یہی سب کے کام آتی ہے، مختلف صوبون کے مختلف بولیون کے بولنے والے سفر مین جب اکٹھے ہوتے ہین، تو یہی زبان ان کے درمیان کی کڑی ہوتی ہے، ہندوستان کے مسلمان جس صوبہ مین رہتے ہین گو ان کی مادری زبان ان کے صوبہ کی وہی بولی ہے پھر بھی

ان کی دوسری عمومی زبان یہی اردو ہے، اور وہی ان کے جلسون اور مجمعون کی زبان ہے، اس لئے مسلمانون کی آبادی کا جہانتک تعلق ہے، وہ ہندوستان کی عام زبان ہے، جن مقامات مین وہ نہین بولی جاتی وہان وہ سمجھی ضرور جاتی ہے، مدراس، بمبئی اور بنگال سے جہان کی وہ مادری زبان نہین، اردو اخبار اور رسالے برابر نکل رہے ہین، ہندوستان سے باہر ان تمام مقامات مین وہ پائی جاتی ہے، جہان کسی ہندوستانی کا قدم پہنچا ہے، ہندوستان سے نکلا ہوا کوئی جہاز جس جس بندرگاہ سے عام طور سے گذرا کرتا ہے ہر جگہ اردو کا قدم مضبوط گڑ گیا ہے، جہان جہان ہندوستانی نوآبادی قائم ہے یہ زبان ان کے دم کے ساتھ ہے، افریقہ کے مختلف حصون اور عرب کے مختلف بندرگاہون مین وہ بولی جاتی ہے یہانتک کہ سوئیز تک اس کی نہر جاری ہے، سنگاپور، مالدیپ، رنگون، جاوا، چین، افغانستان تک اس کا تھوڑا تھوڑا نشان ملتا ہے، ان واقعات سے یہ ثابت ہوگا کہ گو زبان سے کتنا ہی انکار کیا جائے مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہی ہندوستان کی مشترک اور عام زبان کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی ایک زبان ہے جو آیندہ ہندوستان کی علمی اور تعلیمی زبان آسانی سے بنائی جا سکتی ہے،

اس وقت کوئی ایسا عقلمند ہندوستان مین نہین جو اس ملک کے لئے ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت سے انکار کرے، اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے، تو مقامی زبانون کے سوا ایک نہ ایک عام زبان اس کو بنانی پڑیگی،

اور جب یہ زبان اس حد تک پھیل چکی ہے اور مانی جا چکی ہے، تو اس کے سوا کسی اور دیہاتی زبان کو اسی حد تک پھیلانے اور بڑھانے مین کوئی دوسری قوم کیون اپنا وقت اپنا روپیہ اور اپنی محنت صرف کر رہی ہے، حالانکہ تجربہ ہے کہ جس چیز کو وہ پھیلا رہی ہے وہ اسی زبان کی ایک کم ترقی پائی ہوئی شکل ہی،

شہرون اور دیہاتون کی زبانین بےشبہہ مختلف ہین لیکن یہ اختلاف ادنیٰ اور اعلیٰ کا ہے جہانتک شہرون کا تعلق ہے، اردو ہی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اسی کے فعل و حرف اور اسم بولے جاتے ہین، دیہاتون کا جہانتک لگاؤ ہے وہان ان صوبون مین بھی جہان کی علمی وادبی بلکہ مادری زبان اردو ہے، مختلف فعلون اور اسمون کی کم درجہ اردو بولی جاتی ہے، اور وہ ہر جگہ کی علحدہ ہے، اودھ کی دیہاتی زبان، گورکھپور کمشنری کی دیہاتی زبان، آرہ کی دیہاتی زبان، چمپارن کی دیہاتی زبان، سارن کی دیہاتی زبان، خاص بہار کی دیہاتی زبان، اسی طرح اطراف دلی کی دیہاتی زبان اطراف سہارنپور کی دیہاتی زبان، علی گڑہ کی دیہاتی زبان ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہے، حالانکہ ان تمام مقامون کی علمی تعلیمی مجلسی بلکہ مادری زبان صرف اردو ہے، تو اگر ان ہی دیہاتی زبانون کو ہندی کہکر ملک کی عام زبان بنانے کی کوشش ہے تو سوال ہوگا کہ کس مقام کی دیہاتی زبان اس کام کے لئے چنی جائے گی،

ہندوستان کے باہر بھی دنیا کے ہر ملک مین ایسی دیہاتی زبانین موجود ہین مگر وہ ملک عام علمی تعلیمی ادبی اور مجلسی زبان نہین قرار پاتین،

الغرض اردو کے عام اور مشترک زبان بنائے جانے پر دلیلین یہ ہین،

۱۔ ہندوستان جیسے مختلف ذاتون، قومون اور بولیون کے ملک مین اردو ہی جیسی ملی جلی بولی، عام اور مشترک زبان بن سکتی ہے،

۲۔ یہ زبان ہندؤن اور مسلمانون کے میل جول سے بنی، اوران کی دوستی ومحبت کی دائمی یادگار ہے، اس یادگار کو مٹانا سیاسی حیثیت سے حد درجہ خطرناک ہے،

۳۔ اس کو پشاور سے لے کر بنگال کی سرحد، سی پی کے قلب اور دکن کے گوشون تک سب ہندو مسلمان بولتے ہین، اس لئے آسانی سے وہ پورے ملک کی مادری نہین تو کم سے کم علمی اور تعلیمی زبان بن سکتی ہے،

۴۔ سات کرور مسلمانون کا جہانتک تعلق ہے وہ اس وقت بھی ہر صوبہ مین ان کی عام اور مشترک زبان ہے، ہر صوبہ مین ان کے اخبارات، پریس، کتابین اور رسالے اسی زبان مین ہین اور وہی ان کی تعلیم اور تقریر کی زبان ہے،

۵۔ جن صوبون کی یہ مادری زبان نہین وہان بھی وہ عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کو وہان اور ترقی دینا کچھ زیادہ مشکل نہین،

۶۔ ایک زبان جس نے ملک مین عام اور مشترک حیثیت یہانتک حاصل کرلی ہو، اس کو اب مٹا کر دوسری زبان کو رواج دینے کی کوشش اگلے بزرگون کی صدیون کی محنت پر پانی پھیر دینا ہے،

۷۔ جہانتک بیرون ہند کا تعلق ہے، یہی زبان ہندوستان کی عام زبان سمجھی

جاتی ہے، اس لئے اس کو مٹا دینے یا بدل دینے کی کوشش دنیا کو پھر نئے سرے سے ایک نئی زبان سے آشنا کرنے کے لئے محنت کرنا ہی،

۸- یہ ایک ایسی زبان ہے جو نہ صرف ہندوستان، بلکہ اس پاس کے دوسرے ایشیائی اور مشرقی ملکون کی زبانون سے بھی متعلق ہے، افغانستان، ایران، ترکستان عرب، عراق، شام، مصر وغیرہ ملکون کے لوگ نہایت آسانی سے اس کو سیکھ سکتے ہین اور سیکھتے ہین، اس لئے اگر یہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان مان لیجائے تو اس کا نہایت امکان ہے کہ آیندہ وہ تمام ایشیا بلکہ سارے مشرق مین وہ سمجھی جانے والی زبان بنجائے اور یہ امر ہندوستان کی دائمی اور نہ مٹنے والی عزت کا سبب ہوگا،

اب سوال کے دوسرے ٹکڑے کا جواب دینا ہے، کہ اس کو مشترک اور عام زبان بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ اور یہ مقصد کس طور سے حاصل ہو سکتا ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ اردو ہماری کوششون کے بغیر یہانتک پہنچی ہے، یعنی کسی نے کوئی خاص کوشش اس کے لئے نہین کی ہے، تاہم وہ پھیل رہی ہے اور پھیلتی جاتی ہے اور یہ اس لئے کہ وہ فطرت کی طلب اور تقاضے کے مطابق ہے، ملک کو ایک عام اور مشترک زبان کی ضرورت ہے، اور وہ اس ضرورت کی پیاس کو بجھاتی ہے اب اس خودرو ترقی کے علاوہ حسبِ ذیل دوسرے ذریعون کو بھی اس کے لئے اختیار کیا جائے تو مناسب ہی،

۱- اردو کے ہمدردون اور ہندی کے حامیون کا مشورہ کا ایک مشترک جلسہ ہو

اس مین اُردو اور ہندی کی بحثون کے متعلق ہمدردی اور نیک نیتی کے ساتھ گفتگو اور سمجھوتہ ہو اور معلوم کیا جائے کہ وہ ہندی سے کیا مراد لیتے ہین؟ اور ہم اُردو کو کیا سمجھتے ہین؟ کیونکر دونون قومین ایک زبان کے پلیٹ فارم پر جمع ہوسکتی ہین اور دونون کے پاس اپنے اپنے دعوے کی کیا دلیلین ہین؟

۲۔ مختلف صوبون کے اسکولون، کالجون اور مدرسون مین اردو ریڈنگ روم اور اردو کلب قائم کئے جائین جنمین داخلہ کی شرط یہ ہو کہ ان کو اردو بولنی پڑے گی،

۳۔ چند جوان ہمت اصحاب ایسے کھڑے ہون جو کسی مرکزی انجمن کی طرف سے ہندوستان کے ان صوبون کا دورہ کرین جہان اردو بولی نہین جاتی، وہان جاکر اردو کی ضرورت لوگون کو سمجھائین۔ وہان کے مدرسون مین اس کی تعلیم کی طرف توجہ دلائین، اور اردو قرأت خانے اور کلب قائم کرین اور اردو رسالون، اخبارون اور کتابون کا شوق دلائین،

۴۔ سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور ادبی کتابین اور قصہ کہانی کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھوا کر چھپوائین، اور ان کو نصاب مین داخل کرائین، اور لوگون کو مطالعہ کے لئے پیش کرین۔ ان کتابون اور رسالون کی تصنیف مین ان باتون کا خیال رکھا جائے

(الف) زبان صاف، شستہ اور سادہ ہو، جس مین موٹے موٹے عربی اور سنسکرت لفظون سے پرہیز کیا جائے، جہانتک ممکن ہو، فارسی اور عربی ترکیبون اور فارسی اضافت اور صفت موصوف اور عطف سے بچا جائے۔ اور عربی و فارسی جمعون کی جگہ اردو

قاعدہ کے مطابق جمع بولیں، مثلاً تجاویز کے بدلے تجویزیں، تدابیر کی جگہ تدبیریں، کتب کے بجائے کتابیں وغیرہ، اسی طرح سنسکرت کے حرف عطف وغیرہ سے بھی پرہیز کیا جائے

(ب) فارسی، عربی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ کٹ چھٹ کر اور خراد پہ چڑھ کر اردو لفظ بنگئے ہیں، لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کو غلط ٹھہرا کر صحیح طور پر عربی فارسی سنسکرت لفظ بولے جائیں، اسکی سختی سے مخالفت کیجائے،

(ج) اردو گرامر اور اردو سکھانے والی بول چال کی کتابیں بنگالی، تامل، تلنگو، ملیالم، سندھی، گجراتی اور مرہٹی میں ان میں سے ہر زبان کے بولنے والوں کے لئے الگ الگ لکھی جائیں اور ہر ایک میں اردو ڈکشنری بنائی جائے،

(د) ایک دو ایسے اخبار اور رسالے خاص اسی ضرورت سے آسان، سہل اور بالکل سادہ زبان میں نکالے جائیں، جو مبتدیوں کے کام آئیں اور وہ ان کو پڑھیں،

(ہ) کوشش کیجائے اور نمونے پیش کئے جائیں کہ آیندہ ہماری تحریروں کے عام فہم نمونے یہ ہوں،

(و) اردو کی اس خوبی نے کہ اس میں ہر زبان کے لفظ آسانی سے چلن میں آسکتے ہیں، اس بات کا موقع دیدیا ہے کہ لوگ اس کی اس خوبی کو عیب بنا دیں، یعنی گویا ہر فریق کو یہ عام اجازت دے دی گئی ہے کہ جس قدر لفظ فارسی یا عربی یا سنسکرت یا انگریزی کے وہ بڑھاتے جائیں وہ اردو ہی باقی رہے گی، اس طرح اردو کی مٹی پلید ہو رہی ہے، اس کی روک تھام ضروری ہے،

(ز) اس کے لئے ہمارے خیال مین یہ کیا جائے کہ چند مسلمان اور ہندو اہلِ قلم مل کر اردو کا ایک ایسا لغت لکھین جسمین اردو کے قابل تمام کھرے لفظ چن لین، اور ان ہی کو دوسرے لفظون کے پرکھنے کا معیار بنائین،

(ح) اردو ہی کے چھپے ہوئے منی آرڈر، فارم اور کچہری کے کاغذات اور دوسرے سرکاری کاغذات استعمال کئے جائین، اور اردو ہی مین خطون پہ پتے لکھے جائین، سٹرکون پر بورڈ لگائے جائین، اسٹیشنون پر نام لکھے جائین،

(ط) ایسے معنون کے لئے جن کے لئے پہلے سے خالص اردو لفظ مل سکتا ہے، غیر زبان کا لفظ استعمال نہ کیا جائے، نیز یہ کہ اگر کسی غیر زبان کا کوئی لفظ اردو مین چل گیا ہے تو اس کو چھوڑ کر دوسرا نیا لفظ نہ بولا جائے، مثلاً کونسل کی مجلس کی جگہ "مجلس زعماء"، "ڈاک خانہ" کی جگہ "پوسٹ آفس" یا "بوسطہ"، اسٹیشن کی جگہ "محطّہ" پروگرام کی جگہ "بروغرام" وغیرہ؛

اردو کو سنجیدہ علمی زبانون کی سطح پر لانے کی تجویزین یہ ہین:-

(الف) اردو کی چھوٹی بڑی لغت کی کتابین لکھی جائین،

(ب) اردو مین انسائیکلوپیڈیا، بُک آف نالج، اور جیوگرافیکل اور ہسٹاریکل ڈکشنری کے طریقے پر عام معلومات کو بڑھانے والی کتابین لکھی جائین،

(د) نئی علمی اصطلاحون کے بنانے کے لئے اب کسی نئی کوشش کے بجائے ہندو مسلمان اہل علم کی ایک ایسی انجمن بنائی جائے جو اردو کی موزونی کے لحاظ

سے ان اصطلاحون پر نظر ثانی کرے جو دارالترجمہ حیدرآباد دکن یا ہندی سبھا بنارس والٰہ آباد نے بنائی ہین، اوران دونون مین سے ان اصطلاحون کو چن لے جو ہندوستان کی عام تعلیمی زبان کے مناسب ہو اوران ہی کو رواج دیا جائے،

(ھ) غیر زبانون کی اہم کتابون کے ترجمے کئے جائین،

(و) مختلف مضمونون پر خود اردو مین کتابین لکھوائی جائین،

(ز) ایسے سرمایہ والے اشاعت گھر ہون جن کے پاس اچھا مشورہ دینے والا اسٹاف ہو اور وہ اردو مصنفون سے حق تصنیف خریدنے اور اس کے صحیح چھاپنے کا کام کرین یا جو کسی سلسلۂ تصنیف کو کسی خاص علم اور فن کے متعلق ترتیب دلائین،

(ح) ایسے اشاعت گھر ہون جو پچھلی چھپی ہوئی نہ ملنے والی کتابون کو برابر چھاپ چھاپ کر بازارون مین لائین، آج اردو مین بیس پچیس برس پہلے جو اچھی کتابین لکھی گئی تھین وہ مشکل سے ملتی ہین،

(ط) سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ کوشش کیجائے کہ ملک کی عام مجلسون، مثلاً اسلامی تعلیمی کانفرنس، کانگرس، لیگ اور تمام سرکاری کونسلون اور عدالتون کی زبانین اُردو ہون،

(ی) اس سے بڑھکر یہ ہے کہ کوشش کیجائے کہ وہی تمام ملک مین تعلیم کی زبان قرار دی جائے کم از کم قومی یونیورسٹیون مین وہی تعلیم کی زبان ہو جائے، جامعہ عثمانیہ نے اس راہ کو بہت کچھ آسان کر دیا ہے،

(لف) یونیورسٹیون کے اعلیٰ مطالعہ و امتحان مین اردو کو بھی جگہ دی جائے اور بحیثیت ایک مستقل زبان کے اس کے لئے بھی سند رکھی جائے،

(۳)

تیسرے سوال کا طریقہ سوال صحیح نہین ہے، اس سوال کے لفظون سے یہ نکلتا ہے کہ اردو کی بنا پر ہندو اور مسلمانون کے تعلقات مین خوشگواری یا ناخوشگواری پیدا ہوئی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تعلقات کی ناخوشگواری کی بنا پر زبان کا مسئلہ معرض بحث مین آیا، اور ہندؤن نے غلط فہمی سے اردو کو اکیلے مسلمانون کی قومی زبان قرار دیدیا، اس لئے ہندی اور اردو مین کشاکش ہے، اس کا حل یہ ہے کہ ہم اس سے مایوس نہین ہین کہ ہندی کے ہمدردون سے اردو کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہین ہوسکتا، اسی کی کوشش کرنی چاہیے، بحث لفظی ہے، کیونکہ روزمرہ کی بات چیت کے لحاظ سے اردو اور ہندی مین کوئی بڑا فرق نظر نہین آتا، آج سے چند سال پہلے کے ہندی اور اُردو پریس سے جو تحریرین نکلتی تھین ان مین بھی کوئی نمایان فرق نہین تھا اب جیسے جیسے بعض مسلمان اہلِ قلم ایک نئی اُردو عربی و فارسی کی بے جا آمیزش سے بنا رہے ہین، ہندو بھی سنسکرت سے ملا کر ایک نئی زبان بنانا چاہتے ہین،

ان دونون قومون کے تعلقات کی ناخوشگواری کے بعد ہندی تحریرون مین بالقصد سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کئے جانے لگے ہین، اور ہندؤن کی عام تقریرون مین سنسکرت کے اسی قسم کے الفاظ زیادہ سنے جاتے ہین، لیکن ہمارا خیال

ہے کہ زبان کے مسئلہ مین یہ کشاکش موجودہ ناخوشگوار فضا کا نتیجہ ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ حالات سدھر جائین گے، تو ہندوؤن مین سنسکرت الفاظ کے استعمال مین وہ غلو باقی نہ رہے گا، جو اس وقت ہے، اس لئے زبان کی حیثیت سے اردو اور ہندی مین کوئی نمایان اور بہت زیادہ واضح امتیاز آئندہ قائم نہ رہیگا،

(۴)

ابھی مرکزیت کے سوال سے گریز کیجئے، اس کا فیصلہ طبائع اور رجحان پر موقوف ہے جس اکاڈیمی یا بزم علمی کے خدمات زبان اردو کے لئے زیادہ مفید ثابت ہون گے وہ خود بخود اپنی مرکزیت حاصل کرے گی، ہان آپ مرکزیت کے تصور سے خالی الذہن ہو کر (ورنہ آپس مین منازعات کے چھڑ جانے کا امکان ہے) ایک ایسی علمی انجمن بنا سکتے ہین، جو جوابات مندرجہ سوالات نمبر۱ و نمبر۲ کو بہتر سے بہتر طریقہ سے عملی جامہ پہنا سکے، اس انجمن کے کام یہ ہون،

الف، ہندوستان کے اعلیٰ پایہ مصنفون کے خدمات حاصل کرکے ان کی تصنیفات کو شائع کرنا،

ب. مختلف کالجون اور اسکولون کے طالب علمون کے ذوقِ سلیم کا اندازہ لگا کر ان مین سے کچھ کو تصنیف و تالیف، اخبار، رسالون اور اخبارون کی اڈیٹری کا کام کرنے اور دوسری ادبی خدمتون کے لئے چننا، اس کے لئے ان سے معاہدہ لکھا کر ان کو وظیفہ دینا،

ح - جن صوبون مین اُردو مروج نہین، وہان اس کو رواج دینے کے لئے ایسے اشخاص پیدا کرنا جو تکلیفین اٹھا کر وہان جائین، اور تحریرون، تقریرون، اور عام گفتگوؤن کے ذریعہ سے لوگون کو ایک عام مشترک زبان کی ضرورت جتائین ان کو اردو سکھائین، وہان سے ایسے اشخاص ان صوبون مین لائین، جو یہان اردو سیکھین اور اپنے ہان جا کر اس کو پھیلائین، اردو سکھانے کے رات کے مدرسے اور گشتی کتب خانے اور قرأت خانے جگہ جگہ قائم کرین جنمین ہفتہ یا مہینہ مین ایک دفعہ عام فہم اُردو مین تقریرین کیجائین یا تحریرین پڑھی جائین،

(سہیل علی گڈہ، جنوری ۱۹۲۶ء)

ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی

"یہ مضمون ہندوستانی ایکاڈیمی الٰہ آباد کی دوسری ادبی کانفرنس مین جو اپریل ۱۹۳۱ء مین الٰہ آباد مین ہوئی تھی، پڑھا گیا تھا۔"

اردو کی جاے پیدائش بننے کا فخر خواہ ہندستان کے کسی گوشہ کو حاصل ہو، مگر اس مین کسی شبہہ کی گنجایش نہین کہ دکن ہی وہ سرزمین ہے جہان اردو شاعری کا بیج پہلے بویا گیا، اور اس نے پودا بنکر نشو و نما حاصل کی، شمالی ہند کے رہنے والون نے جب اس پودے کے پھل پھول اور بوباس کو دیکھا، تو بے اختیار اس کی آبیاری کو آمادہ ہوئے اور چند روز کے بعد اس کی قلم اپنی سرزمین مین لگا کر اس کو سدابہار بنا دیا، قائم کے زمانہ تک اردو کو دکنی کا طعنہ سننا پڑتا تھا:

قائم! مین غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

تاریخِ اردو کی نئی تحقیقات نے یہ ثابت کیا ہے، کہ اردو نظم نے دلی کے تخت طاؤسی کے بجاے دکن کے چتر و مسند کے زیر سایہ نشو و نما پائی، سلطان قلی قطب شاہ نے ۹۱۸ھ مین جب قطب شاہی حکومت کی بنیاد ڈالی تو بیجاپور، احمد نگر اور گولکنڈہ

تینون مین شیعیت اور تفضیلیت کی اشاعت ہوئی، ساتھ ہی عزا اور میلاد کی مجلسین قائم ہونے لگین جنمین محتشم کاشی وغیرہ کے فارسی بندون کے ساتھ ملک کی دیسی زبان مین بھی مرثیہ پڑھنے کا رواج ہوا،

یہ بات اردو زبان کی تاریخی شہادتون سے ثابت ہے کہ اردو مین عشق و محبت کی داستان سرائیون سے پہلے مذہبی نظمون کی ترانہ سنجی پیدا ہوئی، چنانچہ سلطان قلی اور اس کے بھتیجے محمد علی قطب شاہ، اور دوسرے شعرا شجاع الدین نوری اور نصرتی وغیرہ نے مرثیے لکھے لیکن غالباً مرثیون کی صنف مین سب سے زیادہ جو شخصیت نمایان ہو وہ ہاشم علی برہان پوری کی ہے،

ہاشم علی برہان پوری کے مجموعۂ مراثی کا نام دیوان حسینی ہے، شاہ اودھ کے کتبخانہ مین اس کا ایک نسخہ تھا جس کا ذکر اسپرنگر کے کیٹلاگ مین ہی انگلینڈ مین اڈنبرا یونیورسٹی کے کتب خانہ مین اس کا ایک نسخہ ملتا ہے جس کا ذکر آجکل کی بعض[1] تحریرون مین کیا گیا ہے لیکن خوش قسمتی سے مارچ ۱۹۳۱ئ کے سفر پونہ[2] مین محبّی پروفیسر شیخ عبد القادر (دکن کالج پونہ) کے کتب خانہ مین اس کا ایک مکمل نسخہ میری نظر سے گذرا جس سے ہاشم علی اور اس کے اس دیوان مراثی کے متعلق بعض نئی باتین معلوم ہوئین،

ہاشم علی برہانپوری | نام کے سوا اس شاعر کا حال کسی تذکرہ مین نہین ملا، جو کچھ معلوم ہوتا ہو وہ

---

[1] راقم نے پنجاب کے ایک اخبار میں اسکا ایک اقتباس پڑھا تھا، بعد کو معلوم ہوا کہ اس نسخہ پر ایک لائق صاحب قلم کا مفصل مضمون ہی، [2] یہ مضمون پونہ مین سفر کی حالت مین لکھا گیا تھا،

خود اسی مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس دیوان کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس کے آخر مین خوش قسمتی سے کاتب نے جو شاعر کا معاصر تھا، چند سطرین حوالۂ قلم کی ہین، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصلی نام علی محمد خان ہے اور ہاشم علی اس کا عجیب وغریب مرکب تخلص ہے، چنانچہ اس دیوان کے آخر مین ہے:۔

"تمام شد دیوان حسینی گفتۂ علی محمد خان دام ظلہ تخلص ہاشم علی"۔

اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی مین مرتب ہوا ہے، اس کی ولادت اور وفات کا سال نہین معلوم، مگر اس کے اس دیوان مین اس کے ایک مرثیہ کی تمہید مین ایک فارسی عبارت ہے، جس مین مذکور ہے کہ ۲۰ رمضان سنہ ۱۱۴۸ھ کو اس کے ہم مشرب وہم عقیدہ دوست حافظ فضل الدین نے خواب دیکھا کہ ضریح سے صدائے غیب آئی اور ہاشم علی کو اپنے مرثیہ سنانے کی فرمایش سنائی دی، عبارت یہ ہے:

"از جملہ تفضلات امام شہید کہ برین عاصی شدہ آنست کہ برادر ایمانی حافظ کلام ربانی فضل الدین در عالم رویا بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان سنہ ۱۱۴۸ھ مشاہدہ نمود (الخ)"

اس کے بعد اس دیوان مین ایک مسمط مرثیہ ہے، جس کا نام شاعر نے دردنامہ رکھا ہے، اس کے آخر مین یہ دو شعر ہین:۔

جب منجم نے کیا اس دردنامہ کا حساب	غین و قاف و سین و طا آیا رقم اندر کتاب
سن کے یہ تاریخ کون سینہ مین دل ہو تا کباب	ختم کر ہاشم علی قاسم کی شادی کا بچن (۱۱۶۸ھ)

اس حساب سے یہ ولی دکنی کا معاصر ہے جس کی وفات کا سال سنہ ۱۱۵۵ھ ہے، عام طور

سے ہاشم علی اس کا نام سمجھا جاتا ہے، مگر اوپر کے اقتباس سے جو اس کی زندگی مین لکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ اس کا نام علی محمد خان تھا اور "ہاشم علی" پورا اس کا تخلص ہے، گو تخلص کا یہ اسلوب شعرا کی طرز و روش کے خلاف ہے، مگر واقعہ یہی ہے کہ یہ اس کا تخلص ہے، نام نہین چنانچہ اس کے دیوان کے ہر قصیدہ، اور نظم کے آخر مین یہی تخلص آیا ہے، مثلاً

چو طرف ہاشم علی ہے سر بسر　　　انقلاب و فتنۂ و آشوب و شر

بول تون بلبل صفت ہاشم علی　　　صبحدم مین مدح اولادِ علیؑ

زندگی دنیا کی ہی ہاشم علی خواب و خیال　　　جو رہا سویا وہ چوکا، جاگنا ہیگا محال

تجے ہاشم علی محشر مین دریائے گنہ سیتین　　　بھروسا ہے وہ شہ اوپر وہان سین پار اُتارےگا

عام طور سے اس کو برہانپوری کہتے ہین، شاید یہ اس کی جائے پیدایش ہو، مگر اس کے دیوان مین ایک شعر یہ ہے:-

گجرات مین پڑی جب یہ مرثیہ کون یاران　　　سنکر چلے ہین رونے دکھنی دکھن کو اپنے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا قیام گجرات مین تھا،

دیوان حسینی | چونکہ ہاشم علی کا یہ دیوان سراسر مرثیون کا مجموعہ ہے اس لئے شاعر نے اُسکا نام "دیوان حسینی" رکھا ہے، چنانچہ وہ خود کہتا ہے:-

تو نے لکھا ہے کربلا کا یوں بیان ہاشم علی | ہے یہ "دیوان حسینی" نام اس دیوان کا

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر سال ماہ محرم مین نیا مرثیہ تصنیف کرتا تھا، کہتا ہے،

تجھکو ہاشم علی حسین سرور | ہر برس مرثیہ لکھاتے ہین

اپنی شاعری کی برتری کا بھی اس کو خیال تھا:

شاعرون نے شعر یوں گرچہ رنگین دلکشا | اے عزیزان یو سخن ہے اس دل بریان کا

عربی سے بھی واقفیت تھی، بعض مصرعے پورے عربی مین ہین:-

یہ بشارت بہشت کے در پہ | ادخلوا خالدین سلام علیک

ربنا اغفر لنا خطایانا | یا النبی الامین سلام علیک

فارسی مین بھی بعض مرثیے کہے ہین، جن کی زبان اچھی خاصی ہے، حافظ کی فارسی غزل ع "دل میرود ز دستم صاحبدلان خدارا" پر مصرعے لگاے ہین،

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرثیون کے علاوہ وہ غزلین وغیرہ نہین کہتے تھے، چنانچہ ایک جگہ مقطع مین یہ اقرار ہے:-

بجز مدح نہین شعر ہاشم علی | کہو راستی کے سخن پر سلام

دوسری جگہ ہے،

شاعری مین یون مقرر ہے تجھے ہاشم علی | جز ثنا و مرثیہ شعر دگر کہنا غلط

ایک اور مرثیہ کا مقطع ہے:-

شعر ہاشم علی کے تئین یاران | مدح مولا منی دکھیو خالص

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خوان شاہ کا   جز مدح و منقبت سخن اس نے لکھا نہیں

موجودہ نسخہ | دیوان حسینی کا یہ پیش نظر نسخہ میرے خیال مین نہایت ہی پرانا ہے، اور خود مصنف کی زندگی مین لکھا گیا ہے، جیسا کہ دام ظلہ سے ظاہر ہے، یہ نسخہ ۲۸×۲۴ کی تقطیع پر پرانے کشمیری کاغذ پر خوشخط نستعلیق مین لکھا ہوا ہے، جدول اور بیچ کی لکیرین سرخ ہین اصل دیوان اسی خط اور جدول مین ہے۔ دیوان حروف ابجد کی ترتیب پر الف سے یا تک مرتب ہے، اگر شروع مین، اور بیچ مین بعض بعض حروف کی ردیفون کے بند اور آخر مین بعض نئی نظمین جدولون کے بغیر دوسرے خط مین بڑھائی گئی ہین جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان کی ترتیب کے بعد شاعر نے جو مرثیے کہے ہین، وہ اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے حروف مین بڑھائے گئے ہین، چنانچہ نسخہ مذکور کے آخر مین یہ تصریح بھی ملتی ہے،

"این چند تا مرثیہ ہندی نو کہ در دیوان مرزا صاحب مشفق مہربان انیس خفی وجلی محمد علی سلمہ ربہ نبود، احقر عباد محمد علی غفر اللہ تعالیٰ ذنبہ برائے یاد و بود نوشت، امید کہ ہر کہ بخواند بدعائے خیر فقیر حقیر را یاد نماید"

نوشتہ بماند سیہ بر سفید   نویسندہ را نیست فردا امید

تمت تمام شد دیوان حسینی گفتہ علی محمد خاں دام ظلہ تخلص ہاشم علی"

اس نسخہ مین ۲۰۴ صفحے ہین، اور ہر صفحہ مین تقریباً سترہ شعر ہین، اور یہ کل کے کل ہر تک مرثیے، سلام اور مصائب کربلا کے بیان مین ہین، اس سے اندازہ ہوگا کہ آج سے دو سو برس پہلے اردو کے ایسے شاعر موجود تھے جنھون نے صرف مرثیون کا ایسا ضخیم مجموعہ

یادگار چھوڑا، اور اس حیثیت سے یہ مجموعہ غالباً ہندوستان مین اپنی طرز کا تنہا اور یکتا ہے۔

زبان | زبان کی خصوصیتین وہی ہین جو ولی کے کلام مین ہین، مثلاً

ستین اور سین	بجاے	سے	انجھو	بجاے	آنسو
یو	"	یہ	تمن	"	تم
کوں	"	کو	ہمن	"	ہم
سوں	"	سے	ہیگا	"	ہوگا
منی	"	میں	کسوں	"	کسی
میانی	"	میں	سونے	"	سنے
کتین	"	کے تئین، کیلئے	ایتا	"	اتنا
مجے		مجھے			

جمع الف نون کے ساتھ، یہانتک کہ ہندی لفظون کی بھی، جیسے انکھیان، پلکان، انجھوان، (اور آج تک دکھنی اردو مین اسی طرح سے جمعین بنائی جاتی ہین) مت (کلمہ نفی) کو "متہ" (ہاے کے ساتھ) چنانچہ ایک مرثیہ کو جس مین ردیف متہ ہے، ت کے بجاے ہ کی ردیف مین جگہ دی ہے،

ہندی لفظون کا بکثرت استعمال، جیسے بچن بات کے معنی مین، مکھ منھ کے معنی مین:۔

روروسکینہ غم سوں کہی پھر نہین سونے   باباکے مکھ سون میٹھی بچن کربلا منی

سیس سر کے معنی مین "نمانا" جھکانا "من" دل کے معنی مین، "دولن" بجاے دلہن:۔

بیٹھی گھنگھتہ مین سیس نا در دسیس خموش — روتی ہے آج من مین دولن کربلا منی

سجن بمعنی محبوب ؎

ع جب سین چلے ہین میرے سجن کربلا منی

دیسے بمعنی دیکھے ع چہرہ خورشید سا دیسے تیرا

باج بمعنی بن ؍؍ آج تجھ باج سیہ پوش ہوا کعبہ زغم

جگت بمعنی دنیا ؍؍ ہاشم علی ہو جگت مین سبھی ملال

اندھکار بمعنی اندھیرا ؍؍ آج تجھ باج جگت بیچ ہے اندھکار حسین

اوجاری بمعنی اجالا ؍؍ دو جگ کے اوجاری پر اتیا ستم

چندر بمعنی چاند ہ

پھر محرم کا چندر آیا نہ ہوتا کاشکے — قتل سرور کی خبر لایا نہ ہوتا کاشکے

کرن بمعنی کان ع دونو کانون اوپر زنفان پڑی چھوتی کرن ہی پر

نین بمعنی آنکھ ؍؍ کیا نور نینن ہے ہے،

چرن بمعنی قدم ؍؍ افسوس ہے نہ لائی گھر مین چرن تو اپنی

اکاس بمعنی فضا ؍؍ غم کے داغان سے بھرا سارا اکاس

داس بمعنی غلام ہ

اے شہ دین کمترین ہاشم علی — ہے تمہارا بندہ و مملوک و داس

ذرا اوپر کے دوسرے مصرع کی فارسی و ہندی ترکیب کی آمیزش ملاحظہ ہو،

نگر بمعنی شہر،

سن نگر مین شورِ محشر ھر گلی ہے شبِ قتلِ شہیدان اج رات

اس نگر سے کوئی خاص شہر غالباً مراد نہین، کیونکہ دوسری جگہ وہ کہتا ہے،

اس درد سوں ہاشم علی لاگے لان مین تلملے نگروں نگر، گلیون گلی کہتے ہین یاران وا حسین

صاف شعر | اس قدامت کے باوجود مرثیہ مین بہت سے شعر صاف بھی ہین:-

ظلم کیا برملا ہاے فلک کیا کیا فاطمہ کا دل جلا ہاے فلک کیا کیا
جسکے گلے مصطفیٰ بوسہ لیا بارہا شمر کا خنجر رکھا ہاے فلک کیا کیا
عابدین بیمار تھا شاہ گرفتار تھا تجھکوں سزاوار تھا ہاے فلک کیا کیا
شکوہ دوران لکھوں غم کی تو یا تان لکھون کاں (کہاں) تلک بزم کہوں ہاے فلک کیا کیا

جس وقت شاہ رن سوں پیاسا جگر سدھارا بیتاب کھول سر کوں زینب نے یون پکارا
دیکھو رسول احمد، فرزند کون تم اپنے افسوس کربلا مین بے سر پڑا ہے مارا
یہ کوفیانِ بیدین احسان بولائے ہم کو بن جور بن جفا سوں کرتے نہین مدارا

ہوا پھر کر محرم کا مہینا نبی کے آل کا ٹوٹا سفینا
سدھارا تشنہ لب فردوس کوں وہ جہاں میں کوئی نہ تھا جس کا قرینا
سلیمان تخت کو چھوڑا ہے روتا گرا خاتم نبی کا جب نگینا
کہا شہ نے حرم سوں نہیں ہے چارا مجھے شربت شہادت کا ہے پینا
نہ یہ تبدیل پاوے آج تقدیر ہوے حق کے قضا اوپر رضینا

سکینہ نے کہا وہ دن نہ آوے — جہاں میں بے پدر ہو مجھ کو جینا
یہ دشت کربلا ہے ہائے بابا — کہاں مکہ کہاں جد کا مدینا

کلام کا نمونہ ان مرثیوں میں سرتاپا پر درد مضمون، ماتم، بین، یتیمی، اور بیکسی کے حسرت انگیز واقعے بیان کئے گئے ہیں، قدرت کے منظر، لڑائی کا نقشہ، گھوڑے کی تعریف، تلوار کے تشبیہی مضمون اور مبالغہ کی رنگ آمیزی مطلق نہیں، بلکہ درد و غم کے صرف فطری مضمون ان مرثیوں میں پائے جاتے ہیں، ایک مرثیہ کی سرخی ہے:۔

"در توجہ نمودن شہربانو بعد از شہادت امام زادہ علی اصغر و بیان کردن حالات و مکالمہ نمودن با او"

دیکھئے کہ ایک معصوم ننھے بچہ کی موت کا کتنا پر اثر فطری بیان ہے،

کہتیں بانو آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
ہائے اصغر آج میں کس کا جھولاؤں پالنا
ای جان مادر کہاں ہی تو پھر کر میں تجھکو کہاں ملوں
بیٹھی اکیلی کیا کروں کس کا جھولاؤں پالنا
برہیں سولاؤں میں کسے دو دیلاؤں میں کسے
جا ماں بناؤں میں کسے کس کا جھولاؤں پالنا
سویا ہے گردن ڈال کیوں الجھی زلف کے بال کیوں
رنگیں لو ہوسیں گال کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

تو کھول انکھیاں میں دیکھوں، تو بول بتیاں میں سنوں

روتا نہیں تو کیا کروں کس کا جھولاؤن پالنا

تو چھوڑ مجھ کو کہاں گیا، توں دود کسکا کیوں پیا

بسرا ہے میری کیوں میا کس کا جھولاؤن پالنا

بھیگا لہو میں ہر گلا لیتی ہوں تیری میں بلا

توں پاس اپنے مجھ بولا کسکا جھولاؤن پالنا

جاؤں کدھر میں کیا کروں، یہ گود خالی لے پھروں

اصغر اصغر میں کہوں کس کا جھولاؤن پالنا

یہ دیکھ میرا حال توں، توڑیوں سر کے بال کوں

میں دل کی حالت کیا کہوں کسکا جھولاؤن پالنا

تھے کھیلنے کے دن ترے، کیا عمر تھی کیا سن ترے

نہیں چین مجھ کو بن ترے کس کا جھولاؤن پالنا

نہیں بھولی مجھ کو توں کبھوں تجھ یاد کرنے میں رہوں

رو رو کے تجھ بن دن بھروں کسکا جھولاؤن پالنا

یہ بہن تیری غمگسار، بیٹھی ہے روتی زار زار

تو اٹھ سکینا کر پکار کس کا جھولاؤن پالنا

توں روٹھ ہٹ کر کہاں گیا، میں تجھکوں لاؤں پھر منا

متہ ہوے مجھ سوں تو جدا کس کا جھولاؤں پالنا

تیری صورت پر میں فدا پھرتا نظر میں توں رہا

جب کہ لحد میں توں گیا کس کا جھولاؤں پالنا

جاتا نظر سیں نور کیوں، توں مجھ سوں ہوتا دور کیوں

ارتا ہے غم کا پور کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں سیں چل تھی گھات میں، آ گئی بیکی تجھکو بات میں

بالا کیا جی بات میں کس کا جھولاؤں پالنا

اے میرے پیارے لاڈلے پھر آکے لگ توں مجھ گلے

انجھوں نین سیں یہ چلے، کس کا جھولاؤں پالنا

کہاں کھیلتا ہے اج تو، خالی یہ گھر تجھ باج یوں

جاتا ہے میرا راج کیوں کس کا جھولاؤں پالنا

ہاشم علی کوں نہیں تواں، بانو کا لکھنا سب بیاں

کہتی تھی ہر دم با فغاں کس کا جھولاؤں پالنا

حضرت قاسم کی شادی اور شہادت کا پُر اثر سماں ان لفظوں میں کھینچا ہے جس سے

آج سو دو سو برس پہلے کے رسم و رواج بھی ظاہر ہوتے ہیں،

محبان غم شہیدان کا دلوں سیتیں بھولاو متہ

جگر میں شہ کی فرقت کی اگن جلتی بوجھاو متہ

حسنؑ کی جب وصیت پر لگے قاسم کے تئیں بھیانے
کہا رخصت کرو رن کوں، یہ جنگل میں بیاہ و متہ

نہیں سامان شادی کا مصیبت سب بہیا ہے
یہ سر کاٹیں سگے رن میانے اسے سہرا بندھاؤ متہ

پلاویں گی مجھے شربت شہادت کا حوراں ساسی
نہیں پانی پیاسوں کوں سو شربت کر پلاو و متہ

براتی ساتھ نہیں میرے چلے ہیں سب شہید ہو کر
میرے سر پر قضا پھرتی دگر چھتّر پھراو و متہ

طبق دیکھے ملائک کوں سے اتنے نور کے رن میں
کہا قاسم نے اے اماں بری میری سے جاؤ متہ

لہو میں لال ہو وینگے امرے دو ہاتھ کنگن کے
نہیں حاجت مجھے مہندی الجھو سیتیں گندھاؤ متہ

سینہ کے دف رہیں بجتے میری شادی کے تا محشر
سو غم کی آج تم نوبت میرے بھیا کے بجاؤ متہ

لوہو اور خاک رن میانے لگیگی میرے تن اوپر
او تبنا تیل متہ لاؤ، مجھے روتی چڑاو و متہ

زمیں کے سیج پر سونا مجھے ہے گا لحد میانے

رہے گی سیج سب خالی نہیں فرصت بچھاوو متہ

جدائی آج ہے قسمت نہیں یہ روز اجل ہے گا
سو دولہن ساتھ تم میرا یہ عقد غم پڑھاوو متہ

مقرر جھر مثل ہے گی شہادت رن میں پانے کوں
سو جلوہ میں ادا کرنا یہ نقد جاں دلاوو متہ

اجل سیں تلخ اب ہوتا میرا شیریں دہن دیکھو
جگر اس غم سیں ہٹو کرے نباتاں کو چوناوو متہ

کہاں دولہن ستیں روتا سو تخت جلوہ سیں اوٹھ کر
میری دوری کی آتش سوں دل اپنا تم جلاوو متہ

عروسی کل قیامت کوں ہماری ہیگی جنت میں
رکھو نتھ تاک میں اپنی سہاگ اپنا لٹاوو متہ

شہادت سن میری ہرگز سنگار ابرن نتورو تم
سو کاجل کو نین ستیں بہا انجھو مٹاوو متہ

روا ہے آج دولہن کوں سراپا لال جلوہ کا
مرے لہو میں رنگو انچل دگر رنگ تم رنگاوو متہ

اس نسخہ مین ایک بات خاص لحاظ کے قابل یہ ہے، کہ اس مین اکثر ثقیل ہندی حروف کو خفیف لکھا گیا ہے، مثلاً بیٹھے کی جگہ بتیھے، توڑو کی جگہ تورو، لوٹاؤ کی جگہ لوتاؤ، اوٹپنا

کی جگہ اوبتنا، وغیرہ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک فارسی کی عادی زبانین ہندی حروف کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر نہین ہوئی تھیں، الف ممدودہ کو الف پر مد دے کر لکھنے کے بجائے دو الف سے لکھا ہے، یعنی "آج" کو "اآج" وزن مین بعض حروف کے گرنے کی پروا اس نے نہین کی ہے، ہین کی جگہ ہیئن نہین کی جگہ نئین، اسی طرح عربی لفظ عروس کو عارس باندھا ہے۔

غزل گو میرؔ و مرزاؔ سے پہلے کے پرانے اردو شاعرون کے غزلیات کے بہت سے دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہین جن سے ہماری زبان کی تدریجی ترقی ظاہر ہوتی ہے منا ہے کہ اسی طرح مرثیہ گو میرؔ و مرزاؔ سے پہلے کے اس مجموعۂ مراثی کو بھی شائع کیا جائے، تاکہ پتہ چلے کہ وہ کیا زمین تھی جس کو میر و مرزا نے اپنی بلند خیالیون سے آسمان بنا دیا، اور معلوم ہو کہ ان مرحومون نے جس گلستانِ سخن کو سدا بہار بنا دیا، اس کی بہار کا آغاز کیونکر ہوا؟

اس نسخہ کے اصل دیوان کا پہلا شعر یہ ہے، جو حمد مین ہے :-

ابتدا ہر نامۂ و ہر کام کا　　　لازم آیا ذکر تیرے نام کا

اور آخری شعر یہ ہے :-

یہی ہے آرزو دل میں تجھی ہا شم علی دائم　　　کہ مولا کے کرم سیتیں نجف اور کربلا دیکھے

مگر دیوان کی ترتیب کے بعد جو نئے مرثیے بڑھائے گئے ہین، اس کے لحاظ سے الف کی ردیف مین پہلا شعر یہ ہے :-

افسوس ہے ہزار کہ نوشہ گذر گیا　　　روتی دولھن کوں چھوڑ گھونگھٹ میں گذر گیا

اور آخری شعر یہ ہے جو اردو مسدس کا فارسی بند ہے :-

داشت ہاشم علی چو روسے ارادت بہ نیاز

کرد منظوم چنیں واقعہ در سوز و گداز

مجموعہ کے شروع مین غالبًا اسی زمانہ کے ایک اور مرثیہ گو شاعر کے دو مرثیے ہین جنکی زبان بھی اسی قسم کی ہے، اور ان مین شاعر کا تخلص تقی آیا ہے، یہ حسب معمول چو مصرعے ہین، تین مصرعے ایک قافیہ کے اور چوتھا پورے مرثیہ مین ایک قافیہ اور ردیف کا، سودا تک نے اسی رنگ مین مرثیے لکھے ہین،

نامہ اعمال کا اس کے ہی گناہوں سین سیاہ | تجھ سیں امید شفاعت ہی تقی کو ادشاہ
تجھ سوا کوئی کی دو جگ مین نہیں رکھتا پناہ | از ازل تیرے چرن سیتیں لگا ہی ہائے

(ہندوستانی جولائی ۱۹۳۱ء)

لہ قدم

اُردو کیونکر پیدا ہوئی

(ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی پچیس۲۵ سالہ یادگار مجموعہ مین جولائی ۱۹۲۳ء میں چھپا)

ہندوستان کی ادبی تاریخ کا حال جیسے ہم کو معلوم ہے یہ نظر آتا ہے کہ اس ملک مین کبھی ایک بولی نہین بولی گئی، درحقیقت یہ ملک ایک برّاعظم ہے، جس مین ہر زمانہ مین مختلف قومین اور مختلف نسلین جو مختلف بولیان بولتی تھین، آباد تھین، آباد ہین، اور آباد رہین گی، دنیا کی زبانون کی تین مشہور اصلین آریائی، تورانی اور سامی تینون یہان دوش بدوش ملی جلی ملتی ہین، ڈریوڈی زبانون کی اصلیت تورانی بتائی جاتی ہے، صوبون کی دوسری زبانین آریائی ہین اور عربی کی شمولیت سامی اثر کا نتیجہ ہے،

چند مشہور راجاؤن کے زمانون کو چھوڑ کر جو ملک کے اکثر حصّون پر حکمران رہے، ہندوستان کا اکثر یہی حال رہا کہ اس کے مختلف صوبے، مختلف مستقل ریاستون کی صورت مین رہے، ان صوبون کی وسعت راجہ کی قوت، اور فتوحات کے دائرہ کی کمی بیشی کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی، ہر ریاست کی زبان اس کے صوبہ کی مقامی زبان تھی اور وہی گویا سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی، اب جس قدر اس ریاست کا دائرہ ہوتا، اسی حد تک اس زبان کا جغرافی دائرہ کبھی گھٹ اور کبھی بڑھ جاتا،

مثلاً دیکھئے کہ اودھ کی بولی، برج کی بھاشا، مگدھ کی زبان، اطرافِ دہلی کی ہریانی یہ چارون ہمسایہ ہین، مگر ان کی حدین اپنی سلطنتون کی حدون سے وابستہ نظر آتی ہین، مگدھ (بہار) کی بودھ سلطنت جس کا دارالسلطنت پاٹلی پتر (پٹنہ) تھا جب ہندوستان پر چھاگئی، تو اس کی زبان بھی ہندوستان کی عام سرکاری زبان بنگئی اور آج اسی مگدھ کی پالی زبان کے کتبے پشاور سے لے کر مہاراشٹر کے کنارون تک ملتے ہین،

"ہندوستان مین سندھ سے لے کر گجرات تک کا علاقہ ہمیشہ ایرانیون اور عربون کے جہازون کا گذرگاہ رہا اور اسی کا اثر تھا کہ جہازون کے ساتھ ساتھ ان کی زبانون کے اثرات بھی خاموشی کے ساتھ پھیلتے رہتے تھے، خصوصاً سندھ وہ صوبہ تھا جو اکثر ایران کی سلطنت کا جز بنتا اور خلیج فارس کے تمدن سے متاثر ہوتا رہا، سندھ کے آثار قدیمہ کی موجودہ تحقیقات اس نظریہ کی صداقت کو روز بروز آشکارا کرتی جارہی ہے،"

بہرحال آریائی زبان کی دوسری شاخ ایرانی یا فارسی کا اثر سندھ سے لے کر گجرات تک وسیع تھا، اس کے بعد پہلی صدی ہجری کے خاتمہ کے قریب ساتوین صدی عیسوی مین فارس کی فتح کے بعد عربون نے بھی ایرانی سلطنت کے جانشین کی حیثیت سے سندھ پر قبضہ کیا اور ان کے جہازات خلیج فارس کے اُبلہ، سیراف اور بصرہ نامی بندرگاہون سے نکل کر سندھ، گجرات اور ملیبار ہوکر چین تک جانے لگے، ان جہازون کے چلانے والے، فارسی اور عربی بولتے تھے، اس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندوستان کے جن بندرگاہون سے یہ گذرتے ہون وہان ان کی زبانون کے

کچھ الفاظ مستعمل ہو جائین اور وہان کی مقامی زبانون کے کچھ لفظ ان جہازیون کی زبانون پر چڑھ جائین، چنانچہ اس کی مثالین عرب سیاحون اور ملاحون کی زبانون مین ملتی ہین، چنانچہ آج بھی ہندوستانی جہازون کے ذریعے ہندوستانی زبان، افریقہ، عرب، عراق اور مصر کے بندرگاہون تک پہنچ گئی ہے، اور خود مجھے عدن، جدّہ، پورٹ سعید، مصوّع اور پورٹ سوڈان مین ہندوستانی بولنے والے ملاح اور دوکاندار ملے،

اس موقع پر ہمارے سامنے سب سے پہلا بیان ایک ملے جلے ایرانی عرب جہازران بزرگ بن شہریار کا ہے، وہ کہتا ہے کہ مجھ سے ایک عرب جہازران ابو محمد حسن نے بیان کیا

"مین ۲۸۸ھ مین منصورہ (بھکر) مین تھا، وہان مجھ سے مستند بزرگوں نے یہ بیان کیا کہ الرا (الور) کے راجہ نے جو ہندوستان کا بڑا راجہ تھا اور جس کی حکومت کشمیر بالا اور کشمیر زیرین کے بیچ مین تھی، اور جس کا نام مہروگ بن رائق (؟) تھا، ۲۷۰ھ مین منصورہ کے بادشاہ عبداللہ کو لکھا کہ وہ اسلام کی شریعت کا کچھ حال اس کو بتائے تو عبداللہ نے منصورہ مین ایک عراقی کو پایا جو بہت تیز طبع اور خوش فہم تھا اور شاعر تھا اور جس نے ہندوستانیون مین نشو و نما پائی تھی اور جو اہل ہند کی مختلف زبانون سے واقف تھا، اس نے ایک قصیدہ لکھ کر راجہ کو بھیجا، راجہ نے اس کو بلا بھیجا اور اس کے حکم سے اس نے قرآن کا ہندی زبان مین ترجمہ کیا"[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستان کے سواحل مین بھی بہت سی مختلف زبانین

---

[1] عجائب الہند، بزرگ بن شہریار صفحہ ۲ و ۳، پیرس،

تھیں اور وہ لوگ جن کی اصل زبان فارسی اور عربی تھی وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھتے اور بولتے تھے اور ان میں یہ لیاقت رکھتے تھے، کہ وہ ان میں شاعری کرسکتے تھے، اور قرآن پاک جیسی کتاب کا ترجمہ کرسکتے تھے

یہ ہندوستانی اور اسلامی زبانوں کے باہمی اختلاط اور میل جول کے امکان کا پہلا واقعہ ہے جو سفرناموں اور تاریخوں میں مذکور ہے، اس واقعہ کا زمانہ سنہ ۲۷۰ھ یعنی ۸۸۳ء ہے اور آج سے قریباً ایک ہزار اسی سال پہلے کی بات ہے،

اس کے ۳۳ برس کے بعد سنہ ۳۰۳ھ میں مسعودی ہندوستان آتا ہے، وہ ہندوستان کا ابتدائی حال اس طرح لکھتا ہے:-

''اس کے بعد ہند کے لوگوں کے خیالات مختلف ہوگئے اور مختلف گروہ پیدا ہوگئے اور ہر رئیس نے اپنی ریاست الگ کر لی، تو سندھ پر ایک راجہ بنا، اور قنوج پر دوسرا راجہ ہوا، اور کشمیر میں تیسرا راجہ تھا اور مانگیر (مانکھیٹر) پر جو بڑا علاقہ ہے (گجرات و کاٹھیاواڑ) بلہرا (ولبھ راجہ) کی حکومت ہوئی اور اب تک یعنی ہمارے زمانہ تک جو سنہ ۳۳۲ھ ہے، یہ راجہ اسی لقب سے ملقب ہے اور ہند کی زمین بہت وسیع ہے خشکی، پہاڑ اور دریا میں پھیلی ہے۔ ان کا ملک ایک طرف زابج (جاوا؟) سے ملتا ہے، جو جزیروں کے بادشاہ ''مہراج'' کا دارالمملکت ہے اور یہ ملک ہندوستان اور چین کے درمیان حد فاصل ہے، لیکن ہندوستان کی طرف منسوب ہے، اور دوسری طرف کوہستان سے متصل خراسان اور سندھ اور تبت تک ہے، اور ان (ہندوستانی) ریاستوں میں باہم اختلاف اور لڑائیاں

ہیں، اوران کی زبانین الگ الگ ہیں اوران کے مذہبی خیالات مختلف ہیں، زیادہ تر لوگ تناسخ اور آواگون کے قائل ہین جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے[1]"

اس کے بعد یہی سیاح سندھ کے حال مین کہتا ہے:

"اور سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے . . . . . اور مانگیر (مانکھیر) کی زبان جو بلہرا (ولبھ راے) کا دارالسلطنت ہے گیری ہے اور اسکے ساحلی شہرون جیسے چیمور، سوپارہ اور تھانہ (موجودہ بمبئی کے پاس) کی زبان[2] لاری ہے"

یہ سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ اور کوکن کی زبانون کی نسبت قدیم عربی شہادت ہے،

اس کے بعد بغدادی سیاح اصطخری کا زمانہ ہے جو ۳۴۰ھ مین آیا تھا وہ کہتا ہے،

"منصورہ (موجودہ بھکر واقع سندھ) اور ملتان اوران کے اطراف کی زبان عربی اور سندھی ہے اور مکران والون کی زبان فارسی اور مکرانی ہے[3]"

بعینہ یہی الفاظ ابن حوقل کے سفرنامہ مین ملتے ہین، اس کا زمانہ ۳۳۱ھ سے ۳۵۸ھ تک ہے وہ کہتا ہے :-

"منصورہ (بھکر) اور ملتان اوراس کے اطراف مین عربی اور سندھی بولی جاتی ہے[4]"

۳۷۵ھ ۹۸۵ء مین بشاری مقدسی ہندوستان آتا ہے، وہ ملتان کے حال مین لکھتا ہے "اور فارسی زبان سمجھی جاتی ہے[5]"

---

[1] مروج الذہب مسعودی ج اول ص ۱۶۲ پیرس [2] ایضاً ص ۳۸۱ [3] سفرنامہ اصطخری ص ۱۷۷ لائیڈن [4] سفرنامہ ابن حوقل ص ۲۳۲ لائیڈن [5] سفرنامہ بشاری معروف بہ احسن التقاسیم ص ۴۸۰ لائیڈن،

پھر دیبل یعنی ٹھٹھہ کی بندرگاہ کے حال میں لکھتا ہے:۔

"دیبل (ٹھٹھہ) سمندر کے ساحل پر ہے، اس کے چاروں طرف سو گاؤں کے قریب ہیں اکثر غیر مسلم ہندو (کفار) ہیں، سمندر کا پانی شہر کی دیواروں سے آکر لگتا ہے، سب سوداگر ہیں، ان کی زبان سندھی اور عربی ہے[۱]"

ابن ندیم بغدادی جس نے اپنی الفہرست ۳۷۷ھ میں ترتیب دی ہے، سندھ کی زبانوں کی نسبت جس کی وسعت میں اس کے نزدیک ہندوستان بھی داخل ہے، یہ لکھتا ہے:

"یہ لوگ مختلف زبانوں، اور مختلف مذہب والے ہیں اور ان کے لکھنے کے کئی خط ہیں، مجھ سے ایک ایسے شخص نے جو ان کے ملک میں گھوما پھرا تھا، کہا تھا کہ ان کے ہاں دو سو خط کے قریب مستعمل ہیں، میں نے (بغداد کے) قصر حکومت میں ایک بت دیکھا تھا جس کی نسبت مجھ سے کہا گیا کہ یہ بودھ کی مورت ہے،.....

....اس کے نیچے اس طرح لکھا ہوا تھا[۲]"

اب وہ زمانہ آیا جب سلطان محمود کا باپ سبکتگین اپنی نئی سلطنت کا پتلا بنا کر کھڑا کر رہا تھا اب ہندوستان کی بولیوں میں عربی و فارسی کے بعد ترکی کے میل کا وقت آیا، اس وقت پشاور اور پنجاب اور غزنین میں صلح اور لڑائی کے تعلقات قائم تھے، آمد و رفت، لڑائی بھڑائی، اور صلح و پیام کے لئے دونوں قوموں کی زبانوں میں اختلاط کا موقع آگیا تھا، اس وقت لڑائیوں کے ہزاروں ہندو قیدی[۳] اور نوکری پیشہ ہندو سپاہی

۱؎ سفرنامہ بشاری ص۴۷۹، ۲؎ کتاب الفہرست مطبوعہ مصر ص۲۴، ۳؎ قابوس نامہ ص۱۲۵، باب در رسم بندہ خریدن،

افغانستان وترکستان مین گھر گھر پھیلے تھے، امیر سبکتگین کی فوج مین دوسری قومون کے ساتھ ہندو بھی داخل تھے،

"و لشکر خواستن گرفت، و بسیار مردم جمع شد، از ہندو خلج و از ہر دستی"[1]

سلطان محمود کے دربار مین ہندی کا مترجم تلک نام ایک ہندو تھا جو بچپن مین شیراز پہنچ گیا تھا، اور فارسی سیکھ لی تھی، اور ہندؤن کے ساتھ نامہ و پیام اور مراسلت کی خدمت اس کے سپرد تھی،

"خطے نیکو بہ ہندوی فارسی و مدتے دراز بکشمیر رفتہ بود و شاگردی کردہ۔۔۔۔۔

و او را دبیری و مترجمی کردے با ہندوان"[2]

ابو الفضل بیہقی اپنی تاریخ آل سبکتگین مین اپنے زمانہ یعنی سلطان مسعود (سنہ ۴۲۱ھ تا سنہ ۴۳۳ھ) کے عہد مین اسی قسم کے ایک اور ہندو مترجم بیربل کا ذکر کرتا ہے جس کا تعلق ان کے دفتر انشا سے تھا،

"ہم چناں بیربل بدیوان ما"[3]

سلطان محمود کے دربار مین جہان عرب و عجم کے اہل علم تھے، وہان ہندوستان کے اہل علم بھی شریک بزم رہتے تھے، کالنجر کے راجہ نندا نے سنہ ۴۱۳ھ مین جب سلطان کی شان مین ہندی شعر لکھ کر بھیجا، اس موقع پر فرشتہ مین ہے:-

"و نندا بزبان ہندی در مدح سلطان شعرے گفتہ نزد او فرستاد، سلطان آں را

---

[1] تاریخ بیہقی صفحہ ۲۴۲ و صفحہ ۲۰۵ کلکتہ [2] ایضاً صفحہ ۵۰۲ [3] تاریخ بیہقی صفحہ ۵۰۳، [4] مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳۱ جلد ۱

بفضلاے ہند و عرب و عجم کہ در ملازمت او بودند نمودہ ہمگی تحسین و آفریں کردند[1]

یہ وہ زمانہ ہے جب لاہور بھی فتح نہیں ہوا تھا، اس زمانہ مین بھی سلطان کے دربار مین عرب و عجم اور ہند کے فضلا، پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے، اور سب اتنا درخور رکھتے تھے کہ ہندی شعر کو سمجھین اور مزہ لین،

غزنوی بادشاہون کے زمانہ مین جب پنجاب غزنین کا صوبہ تھا ہزارون لاکھون مسلمان جن کی زبان فارسی تھی، پنجاب مین بس گئے تھے، ظاہر ہے کہ ان مین اور عام اہلِ ہند مین بول چال اس طرح ہوگی کہ وہ ہندی ملی ہوئی فارسی اور یہ فارسی ملی ہوئی ہندی بولتے ہون، اور چند روز مین یہ کیفیت ہوگئی کہ مسلمان ہندی مین یا فارسی آمیز ہندی مین شاعری کرنے لگے، چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان المتوفی ۵۱۵ھ نے جو لاہور مین پیدا ہوا تھا اور لاہور ہی مین رہتا تھا، ایک دیوان عربی کا، ایک فارسی کا اور ایک ہندی کا یادگار چھوڑا،

"یکے بہ تازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندی" (لباب الالباب عوفی جلد ۲ ص ۲۴۶ گب)

یہ شوق روز بروز ترقی کرتا گیا، یہانتک کہ ایک ترک خاندان جو دہلی مین پڑا تھا، اس مین امیر خسرو (المتوفی ۷۲۵ھ) جیسا ہمہ دان شاعر پیدا ہوا، جس نے عربی فارسی ہندی مین علحدہ علحدہ بھی اور تینون زبانون کے مصرعون یا لفظون کو ملا کر بھی شاعری کی، چنانچہ انھون نے خود اپنے دیوان غرۃ الکمال کے خاتمہ مین اس پر فخر کیا ہے،

[1] مطبوعۂ نولکشور ص ۳۱ جلد ۱،

امیر خسرو نے اپنی مثنوی نہ سپہر مین ہندوستان کے مختلف صوبون کی حسب ذیل بولیون کے نام لیے ہین، سندھی[1]، لاہوری[2]، کشمیری[3]، بنگالی[4]، گوڑی[5] (گوڑ بنگالہ کا ایک حصے) گجراتی[6]، تلنگی[7]، معبری[8] (کرناٹکی جس کو کنڑی کہتے ہین) دھور سمندری[9] (دھور سمندر کا رو منڈل کا پایہ تخت تھا جو اس زمانہ مین نیا فتح ہوا تھا) اودھی[10] اور دہلوی[11]،

یہی زبانین تھوڑے سے فرق سے اب بھی موجود ہین، امیر خسرو کے تین سو برس کے بعد اکبر کے زمانہ مین بھی ہندوستان کے مختلف صوبون مین یہی بولیان رائج تھین، ابوالفضل ہندوستان کی مستقل زبانون کا ذکر اس طرح کرتا ہے[1]،

"دہلوی[1]، بنگالی[2]، ملتانی[3]، مارواڑی[4]، گجراتی[5]، تلنگی[6]، مرہٹی[7]، کرناٹکی[8]، سندھی[9]، افغانی[10]، شالی[11]، (جو سندھ، کابل اور قندھار کے بیچ مین ہے) بلوچستانی[12] اور کشمیری[13]،

اوپر کے اقتباسات سے دو باتین ثابت ہوتی ہین، ایک یہ کہ اس ملک مین ہر زمانہ مین صوبہ وار بولیان بولی جاتی تھین اور اس مین کوئی ایک عام اور مشترکہ بولی نہ تھی، اور دوسری یہ کہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے قدرتی طور سے ایک زبان تیار ہو رہی تھی،

ہندوستان مین اسلامی حکومتون کے چھ سو برس قیام کے بعد بھی، ملک مین زبانون کے اختلاف کا یہی حال رہا کہ ایک صوبہ کا رہنے والا، دوسرے صوبہ کے رہنے والے سے بات چیت اور کاروبار کرنے سے عاجز تھا،

---

[1] آئین اکبری جلد سوم "زبانہا" ص ۵۵ نولکشور،

خیال کیا جاسکتا ہے کہ ایسا ملک جس مین کم از کم تیرہ مستقل زبانین بولی جاتی ہون،
اس کو ایک مملکت، ایک حکومت اور ایک ملک کیونکر قرار دیا جاسکتا تھا، اور ایسی مختلف
بولیون اور زبانون والے ملک کے انتظام اور کاروبار کے لئے ایک متحدہ ومشترکہ زبان کی
کتنی سخت ضرورت تھی، یہی بات تھی جس نے اس ملک مین ایک نئی بھاشا کو پیدا کیا،
اور اس کو ترقی دی،

اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ
گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ وار زبانون سے مل کر ہر صوبہ مین
الگ الگ پیدا ہوئی، جن مین خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل سندھی، گجراتی، دکھنی
اور دہلوی ہین، جن صوبون کی بولیون کو الگ وجود نہین بخشا گیا ان مین بھی یہ اب تک
ماننا پڑتا ہے کہ ان کی دو قسمین ہین، ایک مسلمانی اور ایک خالص دیسی، چنانچہ بنگالی، مرہٹی
کنٹری، تلنگی، ملیالم ہر ایک مین مسلمانی بولی خالص بولی سے الگ ہے، مسلمانی بنگالی، مسلمانی
مرہٹی، مسلمانی تلنگی، خالص بنگالی، خالص مرہٹی اور خالص تلنگی سے الگ اور ممتاز ہے، یہ
امتیاز بھی ہے کہ مسلمان ان صوبہ وار بولیون مین عربی وفارسی لفظون کو ملا کر بولتے ہین،
اوران صوبون کے اصل باشندے اُن کو خالص، اور بے میل بولتے ہین،

اب صورت یہ ہوئی کہ ہر صوبہ کی مقامی بولیون مین مسلمانون کی زبان کے الفاظ
کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی، مسلمانون اور ہندوؤن کا یہ میل جول جیسا کہ پہلے
کہا گیا، سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ مین اور پھر یہان سے گجرات اور

کاٹھیاوار تک ہوا ہوگا، اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے، سنہ مذکور میں سلطان ٹھٹھہ پر ناکام حملہ کرکے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھہ والوں نے اس کو اپنے شیخ کی کرامت سمجھ کر کہا۔

"برکت شیخ پٹھیا اک موا، اک تہا"

یعنی یہ شیخ کی برکت تھی کہ ایک حملہ آور (سلطان محمد شاہ تغلق جس نے ۷۵۲ھ میں حملہ کیا تھا) مرگیا، اور دوسرا (سلطان فیروز شاہ تغلق) ناکام رہا،

عبارت سے یہ آئینہ ہے کہ اس زمانہ (۷۶۲ھ) میں عربی، فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج آپ اردو کہتے ہیں پیدا ہوچکا تھا، ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قوموں کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا تھا، اس زبان کی پیدائش کی اور پیدائش کی نہ سہی تو اس کے قیام بقا اور ترقی کی وجہ اس سے بھی بڑھ کر ناگزیر ایک اور ہے، مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمران ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جس کا تعلق پورے ملک سے ہو، اس ملک میں کوئی ایک بھی متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی، لکھے پڑھے تو خیر آج کی انگریزی کی طرح کل کی فارسی سے کام چلا لیتے تھے، مگر ان پڑھ ناخواندہ اور عوام کے لئے ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال، آمد و رفت اور کاروبار میں کارآمد ہو، اور بعینہ یہی ضرورت آج بھی موجود ہے،

اردو نام | زبانِ اردو کی تاریخ کے متعلق میرامن اور سرسید اور دوسرے پرانے بزرگون نے جو بیان سنایا تھا، وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے، اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابین لکھی گئی ہین جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گذار راستہ بہت کچھ صاف ہوگیا ہے اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دور تک۔ لگایا جاچکا ہے اور آج سے پانچسو برس پہلے کے فقرے جمع کئے گئے ہین، اور تیموری بادشاہون سے بہت پہلے کی نظم ونثر کی کتابین مہیا کی گئی ہین، اور اب چہار درویش کے مصنف میرامن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگون کی کہانی سمجھتے ہین،

"حقیقت اردو زبان کی بزرگون کی زبان سے یون سنی ہے کہ دلّی شہر ہندوون کے نزدیک چوجگی ہے، ان ہی کے راجہ پرجا قدیم سے وہان رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے، ہزار برس سے مسلمانون کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری اور لودی بادشاہ ہوئے، اس آمد ورفت کے باعث کچھ زبانون نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے مین اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا، ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر مین داخل ہوا، اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ . . . . .

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چارون طرف کے ملکون سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سُن کر حضور مین آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی، اکھٹے ہونے سے آپس مین لین دین،

سودا سلف، سوال جواب کرتے ایک زبان مقرر ہوئی،

جب حضرت شاہجہاں صاحبقران نے قلعۂ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کروایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلی جدی ہے اور وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اردوے معلی خطاب دیا۔"

ان چند سطروں میں اردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ زمانہ اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سرتاپا حقیقت ہے (یعنی یہ کہ موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے) آجکل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اردو" اور بعض اہلِ دکن نے "دکن میں اردو" اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اردو" کا نعرہ بلند کیا ہے لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبہ کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد ورفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے، ان سب کا نام "اردو" رکھ دیا گیا ہے حالانکہ ان کا نام پنجابی، دکھنی یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہیئے، جیسا کہ اس عہد کے لوگوں نے کہا ہے، یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دلی میں تو اور زیادہ ہوتے،

" امیر خسرو اور ابوالفضل دونوں نے "دہلوی زبان" کا الگ نام لیا ہے، عہد شاہجہانی میں جب یہاں اُردوے معلی بنا، تو اس "زبانِ دہلی" کا نام "زبانِ اردوے معلی" پڑ گیا، چنانچہ لفظ اردو زبان کے معنی میں دلی کے علاوہ کسی صوبہ کی زبان پر اطلاق نہیں پایا، میر تقی میر کی تحریری سند میں جب اس کا نام پہلی دفعہ آیا ہے، تو اصطلاح کے طور پر نہیں بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے، یعنی میر نے "اردو زبان" نہیں کہا، بلکہ "اردو کی زبان" کہا ہے،

"ریختہ کہ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبان اردوے معلّٰی بادشاہ ہندوستان" (ذکر میر)[۱۳]

یادشاہ ہندوستان کے کیمپ یا پایہ تخت کی زبان"

اس کے بعد عام استعمال مین زبانِ اردو کے بجائے خود زبان کا نام اردو پڑ گیا" اور پھر یہ اردوے معلّی سے نکل کر ملک مین ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی جس اصول پر ہندوستان مین ہمیشہ راجدھانی کی بھاکا تمام حدودِ سلطنت مین پھیلتی رہی ہے،

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطرون مین اس کو بار بار "نئی زبان" کہا ہے مگر کیا حقیقت مین اس کو نئی زبان کہنا چاہیے؟ ہم جس کو آج زبان اردوے معلّی کہتے ہین حقیقت مین وہ دہلی اور اطراف دہلی کی وہ پرانی بولی ہے، جو وہان پہلے سے بولی جا رہی تھی اور جس مین زمانہ کے قاعدے کے مطابق انقلاب، اتار چڑھاؤ اور خراد ہو کر لفظون کی مناسب صورت بنگئی،

ہر زبان تین قسم کے لفظون سے بنتی ہے، اسم فعل اور حرف، اس بولی مین جس کو اب اردو کہنے لگے ہین فعل جتنے ہین وہ دہلوی ہندی کے ہین، حرف جتنے ہین ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہین، البتہ اسم مین آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ ہین اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہین، جن کے مسمّٰی ان باہر کے ملکون سے ہین، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی) پادری، الماری وغیرہ،

اس لئے اردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) مین صرف دو فرق ہین، دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہ گئی لیکن اسی ہندی مین اس وقت کے نئے ضروریات کے سبب سے بہت

عربی، فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ آکر ملے، جن کے معنی اور مسمّی ان ملکون سے آئے تھے، دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط مین اور یہ اردو فارسی خط مین لکھی جانے لگی رفتہ رفتہ ایک اور فرق بھی پیدا ہوا کہ پرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے زمانہ اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان مین ہلکا پن، خوبصورتی اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظون مین بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیان پیدا کین، اردو نے ہندی کے لفظون مین اس قسم کا جو تغیر کیا ہے اس کی چند مثالین یہ ہین:-

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گنٹھ	گُن	جیو	جی
براہمنٹر	برہمن	شکتی	سکت
راونڑ	راون	رکھشا	رکھ
ووا	بیاہ	پونچا	پہنچا
جیشٹھ	جیٹھ	کنتو	کیوں کہ
ورش	برس (سال)	مائی	ماں
پرنتو	پر (مگر)	سمے	سماں
اوچت	اچھا	دیش	دیس
سمبندھی	سمدھی	لکھشن	لچھن

ہندی	اردو	ہندی	اردو
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناس (خراب)
ویچار	بچار	اگنی	آگ
کھشتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلا مانس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا سانچ	سچ
ورشا رُت	برسات	کٹمب	کنبہ (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا
ہستی	ہاتھی	پانین	پانی
بادر	بادل	دوہے	دہی
دُگدھ	دودھ یا دودھ	گھرت	گھی
نا	نہ	بھن بھن	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس لئے اس دہلوی ہندی مین سیکڑون لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبون کی بولیون سے آکر رفتہ رفتہ رَل مل گئے، خصوصًا پنجابی اور دکھنی لفظون کی آمیزش زیادہ ہوئی، کہین یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونون کے ہم معنی لفظون کو ایک جگہ کرکے بولنا شروع کیا، تا کہ دونون زبانون کے الگ الگ جاننے والے، ایک لفظ سے

دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لین، جیسے دھن دولت، رنگ روپ، رنگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق ہنسی خوشی، بھائی برادر، رشتہ ناتا، داغ دھبا، دکھ درد، صاف ستھرا، ریت رسم، کبھی فارسی لفظین ذرا ہندی پن پیدا کر دیتے ہین، جیسے جن، مجور، یا مزدور، یعنی مزدور، لونڈی باندی (بندی، بندہ بمعنی غلام)

ان دونون کو دو زبانون کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لئے یہ چاہئے کہ ان دونون کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنا لین جنکو دونون نباہ سکین

(معارف جولائی ۱۹۳۲ء)

بہار کے نوجوان

اور

ادب کی خدمت

اگر کوئی پوچھے کہ صوبہ بہار کی مادری زبان کیا ہے؟ تو جواب ہر طرف سے یہی ملیگا کہ "ہندوستانی" جس کو عام طور سے اردو کہا جاتا ہے، اس زبان کے عروج کا جو زمانہ دلّی اور لکھنؤ مین تھا بعینہ وہی صوبہ بہار مین تھا، اور یہ بات اہلِ ادب مین بے تامل مانی جاتی ہے کہ دلی اور لکھنؤ کے بعد اس زبان کا تیسرا مرکز عظیم آباد (پٹنہ) تھا، جو صاحبِ کمال بھی اپنے گھر سے بے گھر ہوا، اور اجڑی دلی کو چھوڑ کر نکلا، اس نے پہلے لکھنؤ مین قسمت آزمائی کی، اگر بخت نے یہان یاوری نہ کی تو پورب کی سمت اور بڑھا، اور عظیم آباد پہنچ کر دم لیا، اگر یہان کی آب وہوا بھی اس کو راست نہ آئی، تو بنگال مین مرشد آباد کی طرف نکل گیا،

اس رسالہ کے کسی پہلے سالانہ نمبر مین مین نے حضرت مخدوم شرف الدین رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سے وہ چند فقرے لکھے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے صوبون کے قدیم بزرگون کے دہنِ مبارک سے اس بولی کے متعدد فقرے نکلے ہین اس صوبہ کے بزرگ بھی اس کو بولتے اور سمجھتے تھے، اس کے بعد جیون جیون یہ بولی ترقی کرکے زبان بنتی گئی، اس کی اس ترقی مین یہ قطعۂ ہند بھی اپنی بساط بھر حصہ لیتا رہا، اور یہ حالت

اس وقت تک قائم رہی جب تک نئی حکومت نے اس صوبہ کو بنگال مین ملا کر اس کی مستقل حیثیت کو مٹا دیا، اور بہار کے تمام دفترون اور صیغون مین بنگالیون کا تقرر عمل مین نہ آیا، جو ہندوستانی کے ایک حرف سے آشنا نہ تھے، صوبہ مین ہندوستانی کے ساتھ بنگالی اور اوڑیا دو اور زبانین شریک تھین،

اس درخت پر دوسری کلہاڑی اس صوبہ کے ایک مشہور گورنر نے ماری، جب ملک کی متحدہ زبان کے رسم خط کو اردو اور ہندی کے دو حصون مین بانٹ کر ملکی اتحاد کی رگ کے آخری قطرہ کو بھی بہا دیا، ۱۸۶۷ء مین بہار و بنگال کی گورنمنٹ نے ہندی کو دفترون کا خط قرار دیا اور اسی اثنا مین یہان بنگال کی ہمسایگی کے اثر سے انگریزی تعلیم کو روز افزون ترقی ہوتی گئی، تو اس زبان پر اس صوبہ مین مردنی چھا گئی، عدالتون اور دفترون کی ضرورت سے کون آزاد ہے، ہندی رسم خط نے عوام مین ہندوستانی رسم خط کی جگہ لینی شروع کی، اور خواص مین جو دن پر دن انگریزی تعلیم پڑھتے جاتے تھے، دیسی زبان کی وقعت گھٹتی چلی گئی، یہانتک کہ دوستون مین خط و کتابت، گھرون مین بات چیت، مجلسون مین تقریر و تحریر سب انگریزی مین کی جانے لگی، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ دیسی زبان مین بولنا ان دنون ذلت اور بے توقیری کا مرادف تھا،

یہ کیفیت قریب پچاس ساٹھ برس رہی، اس طویل عرصہ مین بزرگون کی ادبی دولت برباد ہو گئی، اپنی زبان کی خدمت کا ولولہ جاتا رہا، صحیح زبان بولنے اور لکھنے کی دھن نہ رہی، انگریزی اسکولون مین جو مدرس اور ماسٹر پڑھاتے تھے، ان مین بڑا حصہ بنگالیون

کا تھا، وہ جیسی ہندوستانی بولتے تھے، اسی کے قریب قریب ان کے شاگرد بھی بولنے لگے،
اگر اس عہد مین قاضی رضا حسین صاحب رئیس عظیم آباد اور ان کے ہم نشین اہل علم وادب کا
مختصر سا گروہ پٹنہ مین نہ ہوتا تو یہ رہی سہی یادگار بھی ملیا میٹ ہو جاتی،

قاضی صاحب کی ادب آفرین، اور علم آموز صحبتون مین جو نوجوان آآکر شریک ہوئے
اس پورے پچاس برس کے زمانہ مین وہی اسلاف کی اس یادگار کو اپنے سینے سے لگائے
رہے، اس گروہ مین شہر عظیم آباد کے علاوہ اس کے قصبات کے نوجوان شرفا بھی برابر کے
شریک تھے، ظہیر احسن شوق نیموی، عبد الغفور شہباز، عبد الغنی وارثی، سید رحیم الدین، حافظ
فضل حق آزاد، حافظ محب الحق وغیرہ دیہات اور قصبون کی پیداوار تھے، اور شہر کے
باشندون مین سے دو نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہین، قاآنی ہند حکیم عبد الحمید صاحب مرحوم
اور حضرت شاد، ایک اور نام ذکر کے قابل ہے وہ مولوی اعظم صاحب کا ہے جو اپنے
وقت کے انشا پرداز تھے، اپنے چھوٹے چچا مرحوم مولوی ابو یوسف صاحب کے ساتھ انکی سرراہ زیارت
پٹنہ مین ہوئی، لمبا قد، گداز بدن، چہرہ پر بھری داڑھی، میرے چچا نے مجھ سے فرمایا کہ صوبۂ پنجاب
معروف یہ ولایتی بیگم کے مشہور افسانہ کے اصلی مصنف یہی ہین، چچا مرحوم بھی اسی آغوش صحبت
کے پروردہ اور اسی گروہ کے ہمنشین تھے، اسی لئے اس بارہ مین ان کا بیان وثوق کے
قابل ہوگا،

دوسرا نام منشی مصاحب حسین کا ہے، یہ بھی دیہات کے باشندہ اور اسی خوشۂ پروین
کے ایک دانہ تھے، اپنے زمانہ مین خوب پھلے پھولے اور کلکتہ جا کر وہان کے مشہور اخبار

اردو گائڈ وغیرہ کے مدتوں ایڈیٹر رہے، چچا مرحوم میں اور ان میں برادرانہ محبت تھی، ان ہی کے ساتھ ایک دو دفعہ ان سے ملاقاتیں ہوئیں، دبلے پتلے سے تھے، لمبا قد تھا، سیاہ ایرانی ٹوپی پہنتے تھے،

یہ چند نام برسبیل تذکرہ اس لئے آگئے، کہ شاید آجکل کے ہمارے نوجوان ادیبوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے نام پڑجائیں اور صوبہ کی ادبی ترقیوں کے سلسلہ میں ان کے کارناموں کو فراموش نہ کریں،

یہ تغافل کا زمانہ رفتہ رفتہ رخصت ہوا، اور اب چند سال سے نظر آرہا ہے کہ خود آذر کے گھرانے میں ابراہیم پیدا ہو رہے ہیں یعنی انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں جن کے ہاتھوں سے ہندوستانی ادب کا قتل عام ہوا تھا، اب ایسے مسیحا دم پیدا ہو رہے ہیں، جن کی کوششوں سے اس کے تنِ مردہ میں نئی جان پڑنے کی امید بندھ رہی ہے، نئی تعلیم کے تیز و تند جھونکوں نے ہماری محفلِ ادب کی جن شمعوں کو گل کیا تھا، اب ان کی جگہ برقی قندیلوں نے لے لی ہے، جن کو اب زمانہ کا طوفانِ حوادث گل کرنے کے بجائے خدا نے چاہا تو اور زیادہ تیز کرتا جائیگا،

یہ پورا انقلاب میری آنکھوں کے سامنے گذرا ہے، حالات کی تبدیلی میں سب سے بڑا ہاتھ ملک کے پچھلے سیاسی انقلاب کا ہے، بنگال کی شورش کے اثر سے ۱۹۱۱ئہ میں بہار کو بنگال سے علیحدہ کیا گیا، اس علیحدگی سے بنگال کا اثر اس صوبہ سے آہستہ آہستہ کم ہونے لگا، اور خود صوبہ کو اپنی ادبی خودمختاری کا فرمان ملا، سرعلی امام مرحوم کا یہ احسان وطن کی گردن

پر ہمیشہ رہیگا، یہ خود مختاری ان ہی کی کوششون کا نتیجہ تھی، اس کے بعد ہی دنیا کے سیاسی انقلابات اور اسلامی دنیا کے تیز تیز تغیرات نے یورپ کی طرف سے نفرت اور قومیت اور وطن کی محبت پیدا کی، اس نے ہندوستانیون کے دلون سے انگریزیت کا رعب اٹھا دیا اور بتا دیا کہ لومڑی، شیر کی کھال اوڑھ کر شیر نہین بن سکتی، نہ انگریزون کی نقالی ہندوستانیون کو انگریز بنا سکتی ہے، اس تحریک کی آندھی نے بدیسی چیزون کے ساتھ بدیسی زبان و ادب کے بڑاپن کا بھی خاتمہ کر دیا، اور دیسی زبان کی ترقی کا خیال روز بروز بڑھنے لگا، ملک کی بڑی بڑی سیاسی مجلسون مین جہان انگریزی کے سوا ہر زبان ناقابلِ فہم تھی، انگریزی اس طرح شہر بدر کی گئی کہ انگریزی بتون کے بڑے بڑے پرستارون کو بھی ہندی اور ہندوستانی مین بولنے سے چارہ نہ رہا،

کانگریس، خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکون مین ہر صوبہ کے نمایندون کو ہفتہ ہفتہ اور مہینہ مہینہ سمٹ کر ہندوستان کے مختلف گوشون مین جمع ہونا پڑتا اور دوسرون کی تقریرین سننی اور اپنی سنانی پڑتین، ہر صوبہ مین کانگریس و خلافت کی شاخون مین کارکنون کے اجتماع اور جلسون مین مجبوری یا شوق سے ایک ایک کو تقریرین کرنی پڑین، جن مین غلطیون پر ہنسی اڑائی جاتی تھی، اس لئے مقررون کو اپنی بول چال اور تقریرون مین احتیاط کی پوری کوشش کرنی پڑتی تھی، اسی تحریک کے اثر سے یہان اخبارات نے جنم لیا، اور اسی کے پیٹ سے رسالون کی ولادت بھی عمل مین آئی،

اس طوفان کا دائرہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا، اور ان تک بھی پہنچ گیا جو اس بادِ سموم سے

پوری حفاظت کے ساتھ بچا کر رکھے گئے تھے یعنی انگریزی اسکول اور کالج اب انگریزی خط و کتابت، اور تقریر و تحریر کا امتیاز کا نشان اور غرور کا سامان نہین رہی اور لوگ اپنی دیسی زبان سے محبت کرنا سیکھنے لگے، مادری زبان کی تعلیم کا مطالبہ روز افزون ہوا، اور یونیورسٹیون کو بھی اس سخت مطالبہ کے آگے جھکنا پڑا، بلکہ خود صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی بعض کمشنریون مین ہندوستانی رسم خط کو اس کی جگہ دینی پڑی، یہ معمولی سی مثال اس اصولِ فطرت کی ہے کہ "ڈھونڈو تو پاؤگے اور کھٹکھٹاؤ تو کھولا جائے گا" ضرورت ہے کہ ہم اس اصول کو بار بار آزمائین اور اس وقت تک دم نہ لین جب تک ہندوستانی زبان اس ملک کی عام زبان اصولاً اور عملاً تسلیم نہ کر لی جائے، اب یہ صوبہ اور بھی خالص ہو رہا ہے اور اڑ نٹ کی گردن سے بلی کھولی جا رہی ہے یعنی اڑیسہ بہار سے الگ ہو رہا ہے، اور اب اس صوبہ مین صرف ایک زبان جس کا نام "ہندوستانی" ہے باقی رہگئی ہے،

اب توقع ہے کہ اس صوبہ کے باشندے یہ مطالبہ کرین کہ چونکہ اب اس صوبہ کی زبان خالص "ہندوستانی" ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ حکومت اب اس کی تعلیم و اشاعت پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرے،

اس سلسلہ مین ہم کو غور کرنا ہے کہ اس کو صوبہ کی عام اور مقبول زبان بنانے کے لئے کیا کیا تدبیرین عمل مین لائی جائین، سردست حسب ذیل صورتین ذہن مین آتی ہین،

۱- میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے مکتبون اور پاٹ شالون مین اس کو مناسب جگہ دیجائے، اور اسلامی مکتب گانون گانون کھولے جائین، اور اس کے لئے دیہاتی

رقبون کے مسلمان خاص کوشش کرین،

۲۔ اسکولون مین اس کی تعلیم باقاعدہ ہو اور اس کے لئے اچھے معلم بہم پہنچائے جائین یعنی جو صحیح لکھ سکین اور بول سکین،

کیا یہ سنکر آپ کو افسوس نہ ہوگا کہ پورے صوبہ مین انٹرنس کے امتحان مین ہندوستانی کی ۵۰۰ جوابی کاپیان بھی مشکل سے ہون گی،

۳۔ یونیورسٹی نے اردو کا اعلیٰ امتحان کھولا ہے، مگر اب تک اس کا معیار اور تعلیم بلند نہین، یونیورسٹی کو مجبور کرنا چاہئے کہ اس کے لئے لائق پروفیسر مقرر کئے جائین،

۴۔ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کو مجبور کرنا چاہئے کہ اس زبان کی بہترین کتابون پر سالانہ انعام دے،

۵۔ وکیلون اور مقدمہ بازون کو چاہئے کہ ہندوستانی کے فارمون کو استعمال کرین اور اسی زبان و خط مین تحریرین داخل کرین،

۶۔ صوبہ کے مشہور شہرون اور قصبون مین اس زبان کے کتبخانے اور قرأت خانے (ریڈنگ روم) بکثرت قائم کئے جائین،

۷۔ ہر جگہ اخبارون اور رسالون کے پڑھنے کے لئے چندہ سے دار المطالعہ کھولے جائین

۸۔ مدرسون، اسکولون، اور کالجون مین ہندوستانی زبان کی علمی و ادبی مجلسین بنائی جائین جنمین طالب علم ہندوستانی مین تحریرین لکھ کر سنائین یا تقریرین کرین،

۹۔ ہر سال صوبہ کے طالب علمون کا ایک مقابلہ کا جلسہ ہو جس مین اس زبان کے

سب سے اچھے بولنے والے کو انعام دیا جائے،

۱۰۔صوبہ کی عام زبان مین جن غلطیون کا علانیہ ارتکاب کیا جاتا ہے، ان کی تصحیح کیجائے، اور اس پر رسالے لکھے جائین، جو عام طالب علمون مین تقسیم کئے جائین،

۱۱۔صوبہ مین اعلیٰ تصنیف و تالیف کے لئے خواہ دار المصنفین کے طور پر یا ہندوستانی ایکاڈیمی کے اصول پر ایک ادبی ادارہ قائم کیا جائے،

۱۲۔ڈاک خانہ کے ہندوستانی فارم خصوصیت سے استعمال کئے جائین، اسی طرح کچہریون کے وہی فارم لئے جائین جو ہندوستانی مین ہون،

اس اظہار مین ہم کو خوشی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس برس کے عرصہ مین ہندوستانی نے اس صوبہ مین گو کمیت کے لحاظ سے نہین مگر کیفیت کے لحاظ سے خوش آیند ترقی کی ہے، غلطیان کم ہو رہی ہین، لہجہ بدل رہا ہے، نوجوانون مین مضمون نگاری، شعر و سخن، اور تقریر و خطابت کا چرچا ہے، قافلہ جب رخت سفر باندھ کر صبح کو روانہ ہو تو وہی وقت ہے کہ وہ اچھی طرح دیکھ لے کہ جس راہ پر وہ قدم رکھ رہا ہے وہ منزل مقصود تک سیدھی جاتی ہے، یا نہین اس وقت ہمارے کاروان ادب کے لئے وہی وقت ہے،

زبان کی صحت سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ ہر قدم پر زبان کی صحت پر نظر رہے، اس کے لئے خاص کاوش کیجائے، اور تذکیر و تانیث اور صحیح روزمرہ کا دھیان رہے اور بعض دوسرے صوبون کی طرح اپنی غلطیون پر ہٹ دھرمی نہ کیجائے، اس مین شک نہین کہ بہار مین قدما کے بہت سے پرانے لفظ بولے جاتے ہین، جو اب متروک ہین اور ان مین لکھنؤ اور دہلی

کی تقلید چنداں ضروری نہین لیکن ہمارے ہاں اصلی غلطی یہ ہے جو زیادہ تر دیہاتون مین ہے کہ کسی ایک لفظ کی تذکیر و تانیث یکسان نہین رہنے پاتی، ایک ہی فقرہ مین ایک لفظ ابھی مذکر استعمال ہوا، تو ابھی مؤنث ہو گیا، اگر پابندی کے ساتھ ایک لفظ کو مذکر یا مؤنث ہمیشہ یکسان بولا جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ اس دیار کی زبان مین یہ لفظ مذکر یا مؤنث ہے جیسا کہ دلی اور لکھنؤ مین بہت سے لفظون کی تذکیر و تانیث مین اختلافات ہین، اور یہ زبان کا عیب نہین،

شعر و سخن | شعر و سخن کا عصر جدید ہمارے صوبہ مین بھی پیدا ہو گیا ہے، اور بعض اچھے اچھے شاعر اس میدان مین کمال کا جوہر دکھا رہے ہین، ہمارا بوڑھا لیکن ہمہ دان شاعر فضل حق آزاد ہمارے صوبہ مین اس عہد جدید کا بانی ہے، معاصرین مین تمنا پھلواروی، فنونِ سخنوری مین کامل ہین، ڈاکٹر عظیم الدین کا تخیل بڑی رفعت رکھتا ہے، نجم گیلانی اگر توجہ کرتے تو شاعری کے آسمان مین ستارہ ہو کر چمکتے، رسا ہمدانی نے بھی طبع رسا پائی ہے، خود ہمارے دوست و رفیقِ درس انجم صاحب کسی سے کم نہین، مگر کاروباری طبیعت نے ان کی شاعری کو بھی کاروباری بنا دیا ہے، یعنی مجبور ہون گے تو کہین گے ورنہ نہین نوجوانون مین رضی عظیم آبادی، صبا رشیدی، نجم ندوی وغیرہ ابھر رہے ہین، مقصود نامون کا گنانا نہین، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ طبیعتین آمادۂ ترقی ہین، رضی صاحب کو اگر خدا نے موقع دیا تو وہ شاعرِ فطرت ہون گے،

ضرورت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء ان بے راہیون سے بچین جنہین اس عہد

کے دوسرے صوبوں کے نوجوان شعراء مبتلا ہیں، ایک یہ کہ کلام کی اشاعت میں جلدبازی اور عجلت سے پرہیز کریں اور بار بار کی نظر سے جب تک صحتِ لفظی و معنوی کا یقین نہ ہو جانے اس کو منظرِ عام میں پیش نہ کریں، ہو سکے تو پرانے عہد کے ممتاز شعراء سے اصولِ فن کے نکتے سیکھیں، فن سے جہالت نوجوانوں کی عادت بن رہی ہے، سطحی اور عریاں جذبات کے اظہار میں شرافت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے،

فارسی ترکیبوں کا استعمال اعتدال کی حد سے زیادہ نہ ہو، پھر یہ لحاظ رہے کہ جو نئی ترکیبیں پیدا کیجائیں وہ فارسی کے محاوروں کے مطابق صحیح بھی ہوں، آجکل کے نوجوان شعراء جو لفظی شان و شکوہ کے طالب ہیں، فارسی کا صحیح علم نہ رکھنے کے سبب سے ایسی ترکیبیں ایجاد کرتے ہیں جنکو سنکر علم و دانش کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے،

خوشی ہے کہ صوبہ میں مضمون نگاروں کی تعداد کم نہیں، مگر یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ ان کی تعداد اسی وبائے عام میں مبتلا ہے، جس میں دوسرے صوبوں کے نوجوان اہلِ قلم مبتلا ہیں، سطحی باتیں، پست خیالات، تفریحی مشاغل، بیہودہ مباحث، نصب العین سے دور، ادب لطیف سے میرا اور ادبِ عالی سے معرا، سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہمارے کچھ بنیادی اور اصولی خیالات ہوں جنکو عمدہ اور دلچسپ پیرایوں میں معلومات سے مدلل اور واقعات سے مبرہن کر کے پیش کیا کریں، ہر تحریر سبق آموز، اور ہر بیان دماغ افروز ہو، جس کے پڑھنے سے ناظرین کے علم میں اضافہ، دانش میں ترقی اور خیال میں وسعت پیدا ہو، صوبہ میں اس حیثیت سے پروفیسر محفوظ الحق، پروفیسر نجیب اشرف، ڈپٹی ولی الرحمٰن

وغیرہ ہر حیثیت سے مغتنم ہستیاں ہین اور ان سے مستقبل کو بڑے بڑے توقعات ہین عبدالملک صاحب آروی بھی اس فہرست مین ہین، بشرطیکہ ان کو ان کے حوصلہ کے مطابق مناسب فضا مل سکے، نوجوان علماء مین سید محمد طٰہٰ اشرف (امتھواگیا) مسعود عالم ندوی اور محمد ناظم ندوی اور دوسرے ندوی وغیرہ مستقبل مین چمکینگے،

لیکن نظر آتا ہے کہ ہمارے نوجوانون مین دوسرے صوبون کے ان شاعرون اور نثارون کی تقلید کا عیب پیدا ہو رہا ہے، جن کو عوام کے طبقہ سے واہ واہ کی دادین ملتی ہین، ہمارے شاعران گویئے شاعرون کی تقلید مین ہین جو جگہ جگہ گا گا کر اپنے نام و نمود کی بھیک مانگتے پھرتے ہین، اور چاہتے ہین کہ موسیقی کے جادو سے اپنے کلام کا عیب دوسرون پر ظاہر نہ ہونے دین، ہمارے نثاران بے مقصد نثر نویسون کی نقالی مین لگے ہین جن کی تحریرین نوجوانون کی محفل مین شور تحسین برپا کرتی ہین، زندگی اور زندگی کے مشکلات واقعہ ہین، ان واقعات کی تلخی کو لفظی شراب اور معنوی شراب کے نشہ سے فراموش نہین کیا جاسکتا ہے، بہادر وہ ہین جو واقعہ کو واقعہ سمجھکر اسکا مقابلہ کرتے ہین، اور کامیاب ہوتے ہین؛ وہ نہین جو ان کو بھلا کر غم غلط کرنا چاہتے ہین،

اوپر کی سطرون مین جو کچھ کہا گیا ہے ممکن ہے کہ ہمارے نوجوان ادیب و صاحب قلم و شاعر اس کو سنکر برا مانین لیکن چونکہ جو کچھ لکھا گیا ہے خلوص سے لکھا گیا ہے اس لئے امید ہے کہ "جوانان سعادت مند" حافظ کی طرح راقم کو بھی معاف فرماکر "پند پیرانہ" پر توجہ فرمائینگے،

(ندیم گیا سنہ ۱۹۳۵ء)

سفر گجرات کی چند یادگارین

جولائی ۱۹۳۳ء مین بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ مین مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبون کے مقابلہ مین چند خصوصیتین حاصل ہین، اول یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عرب سے جو علما دریا کے راستہ سے ہندوستان مین وارد ہوتے تھے وہ پہلے یہین اترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہین سے لوٹ جاتے تھے، ہندوستان سے جو علما عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سینکڑون دیہات حرمین محترمین کے مصارف کے لئے وقف تھے، دوسرے ملکون سے جو نادر اور تحفہ چیزین یہان آتی تھین وہ پہلے یہین پہنچتی تھین، حج کے لئے ہر سال ہزارون علما، امرا، اور عام مسلمان اسی راہ سے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے،

اخیر زمانہ مین سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدان جنگ یہی خطہ تھا اور اس لئے سلطانی لشکر کا پڑاؤ اکثر یہان رہتا تھا، اور اس تعلق سے یہ صوبہ کبھی پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بنجاتا تھا، اور ہر قسم کے اہل کمال ادھر کا رخ کرتے تھے،

دکن و گجرات کے علاقہ مین مسلمانون کی آبادی بہت کم ہے، اور جو ہے وہ ہندؤن کی کثرت، زور و قوت اور سیلاب تمدن مین غرق ہے، اور سب سے بڑھکر یہ ہے کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستانِ خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لئے یہان کے دیہاتون اور قصبون مین مسلمانون کی حالت قابلِ رحم تھی، سلطان عالمگیر کی دوربین نگاہون سے ان وجوہ واسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ مین علما، صوفیہ اور مذہبی معلمین کی قطار در قطار آباد کردی، مؤذن، خطیب، امام اور ملا، (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے) موروثی مقرر کردیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے، جو آج تک ان کے اخلاف کے قبضہ مین ہین، وہان کے دیہاتون مین آجتک ان ہی ملاؤن کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کر رہی ہے، یہانتک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے، تو یہ خون ان ہی کے ہاتھون سے کراتا ہے، یہان اب بھی ایسے سیکڑون ہزارون شریف خاندان آباد ہین، جو ان ہی مذہبی فرائض کے لئے یہان آباد کئے گئے تھے، اور ان کو اس کے لئے سرکاری اوقاف دیئے گئے، جن پر وہ آج تک قابض ہین اور ان ہی کے بدولت آج انگریزی سرکار مین بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے، اور مسلمانون کی کچھ ممتاز صورتین وہان نظر آتی ہین،

بھڑوچ بھڑوچ جس کے کنارے دریاے نربدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحر عرب مین ملجاتا ہے، عربون کے جنگی و تجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروص کہتے ہین ١٤ھ مین حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد مین جب اسلام کے ملکی فتوحات کا شباب تھا،

ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آکر لگے تھے، سفر کے اثنار مین جب مین بھڑوچ پہنچا اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھون نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویرین نگاہون کے سامنے کردین، اور گو مین شاعر نہین، تاہم جذبات کے تلاطم نے موزون ترانہ کی شکل اختیار کرلی،

نربدا اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب — گرچہ تو ہندی ہی لیکن زادۂ بحر عرب
جانتا ہی تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز — تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا ہمارا پہلا جہاز
تو گذشتہ کاروانون کا نشانِ راہ ہی — ہند مین اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہی
رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار — تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہی اسکی یادگار
ہند مین اسلام کے انجام کا آغاز تو — چار صدیون تک رہا اسلام کا دمساز تو
آج کسکو یاد ہی وہ داستانِ باستان — تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کاروان
تو ہی دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو — اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہی تو
تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام — اس تنِ آبی مین تیرا خون دوڑانا ہی کام
اے بھڑوچ! اے خاتمِ انگشتِ رودِ نربدا — عہدِ ماضی کی تری عزت رہی باقی سدا
توتیا سے چشمِ ظاہر آج تیری خاک ہی — ذرہ ذرہ پر تو خورشیدِ ذی لولاک ہی
یادگارِ عہدِ خیر القرن ہی تیری زمین — مطلعِ انوارِ ذی النورین ہی تیری جبین
چشمِ عبرت کی نگاہین جب تری جانب اٹھین — تیری موجین کہنہ افسانون کی سطرین بنگئین

یہ ترانہ تال سُر اور زیر و بم سے خالی ہے، اس لئے اہلِ وجد و سماع اس پر کان نہ دھرین،

بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان

بھڑوچ میں عہد عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے جو یہاں مسندِ قضا پر متمکن تھا، اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نور الدین شیرازی صاحب ہیں، لبِ دریا ان کا فضیلت کدہ یادگارِ زمانہ ہے، ایک موروثی کتب خانہ ان کے اسبابِ زینت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے، اس لئے میں کتب خانہ کی سیر نہ کر سکا، مگر میرے ایک عزیز نے ان کا کتب خانہ دیکھا ہے، اس کے حسب ذیل چند نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا،

اس خاندان کے چند نوادر کتب

(۱) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم، آخر میں ہے،

" ذو القعدہ سنہ ۱۰۹۰ھ میں بسنت رائے نے قصبہ مچھرہٹہ سرکار خیرآباد میں تحریر کیا"

(۲) حدائق السحر فی دقائق الشعر، مولفہ محمد بن محمد بن عبد الجلیل العمری المعروف برشید وطواط، آخر میں ہے،

تم الکتاب بعون الملک الوهاب وحسن توفیقه علی ید العبد الضعیف محمد الحافظ الهروی، تحریرًا فی یوم الاثنین، ثانی عشر من ربیع الاول سنہ ۸۶۲ھ اثنین وستین وثمانمائة الهجریة النبویة بدار السلطنة شیراز بزمان قید،

(۳) المحیط للسرخسی، جلد ثانی، جمع الامام الهمام مولانا رضی الدین محمد بن محمد سرخسی الحنفی، آخر میں ہے :-

---

لہ یہ کتاب ایران میں چھپی ہے، اور ملتی ہے،

کان الفراغ من کتابتہ فی یوم الرابع ذو القعدۃ سنہ ۹۹۵ھ، کاتب علی ابن علی بن رمضان العبادی الشافعی الازہری،

(۴) گلستان، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ،

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری نے اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین بن سید احمد حسن رضوی نے ۱۲۱۹ھ مین نقل کیا،

(۵) مخازن المعروف جلد ثانی شرح مشکوٰۃ فارسی، از کتاب الزکوٰۃ تا کتاب البیوع دوسری، تیسری اور چوتھی جلد ہے،

صفحہ اوّل مطلا ہے، تقطیع کلان، اس پر خواص خان غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر ۱۱۲۵ھ ہی،

ابو معروف حسین ۱۱۱۲ھ بھی تحریر ہے،

مدرسہ دار الارشاد احمد آباد مین بھی رہ چکی ہے،

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاویٰ) مؤلفہ ظاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری، ناقص از وسط، تقطیع کلان، مختلف مسخ شدہ مہرین ہین، آخر مین ہے،

تم کتاب الخلاصۃ من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر المدعو بحافظ البخاری علی ید افقر عبیدہ محمد المدعو آصفی الدین بن محمد الخلیلی ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد، فی دولۃ

الملک محمد بن مراد بن سلیم بن سلیمان، بن سلیم بن بایزید

من شهور سنۃ ثلاث بعد الالف سنہ ۱۰۰۳ھ نقل من نسخۃ

تاریخھا یوم الجمعۃ العشرین من شہر ربیع الاول سنۃ ثلاث

وتسعین وستہ مائۃ، سنہ ۶۹۳ھ

(۷)، مجمع البحرین، ترجمہ "اپنکھت پرم ہنس" از اتھرین وید، فارسی، شاہ سرمد نے سنہ ۱۱۳۶ھ مین سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب نندرام ولد انت رام خط فارسی نستعلیق، ۱۳×۸ تقطیع، صفحات ۸۲،

ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدین

قاضی صاحب کے عزیز خاص جنکو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے، وہ موجود تھے، ان کا دولتکدہ بھی گذشتہ جاہ و جلال کا کہنہ مرقع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیارون کی سیر کرائی، انکی عمارت کے سلسلہ مین ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے، جس پر سنہ ۴۳۰ھ کا یہ کتبہ لگا ہے، "ھذہ العمارۃ القدیمۃ فی شہور سنہ ۴۳۰" اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے، بہرحال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یون کہئے کہ محمود غزنوی کے حملہ گجرات سے چند سال بعد کی ہے جو بہرحال کوئی مستقل فتح نہ تھی،

اس کے بعد اس شہر مین اسلام کی ایک اور قدیم یادگار وہان کی سنگی جامع مسجد ہے، اس جامع مسجد کی اصل تعمیر کا کتبہ سنہ ۵۴۸ھ ہے، بعد کو محمد تغلق کے عہد مین سنہ ۷۲۱ھ مین دروازہ

کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے، یہ گنبد سنگِ خارا سے بنایا گیا ہے، اور اس پر حسبِ ذیل کتبہ لگا ہے،

"در عہد دولت سلطان عالم غیاث الدین والدنیا محمد تغلق، ہفتصد وبست ویک"

غالباً ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی،

انگلشور کا ایک خاندان

بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انگلشور نام ہے، جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے، خاندان کے بانی شاہ عبد العلیم صاحب ہیں، جو اکبر کے معاصر تھے، ۱۰۰۵ھ میں انھوں نے وفات پائی ہے، ان کی خانقاہ و مسجد یہیں واقع ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعام دار ہے، موصوف کے پاس خاندان کی پرانی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں،

اس خاندان کے چند نوادر کتب

عربی کتابوں میں سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت ۵۸۸ھ ہے، نسخہ بخطِ عرب شیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے،

حقہ کی تاریخ

یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ "ناخوشی بنی" کے الفاظ سے نکالی گئی جس سے ۱۰۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ

سے ہندوستان مین وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہین کہ تاریخی بیان صحیح ہو، سنہ ١٠٢٩ھ جہانگیر کا عہد ہی،

بناے سورت کی تاریخ گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحر عرب سے جاکر ملتا ہے، دریاے تاپتی ہی اس کے ایک کنارہ پر شہر سورت آباد ہے اور دوسرے کنارہ پر راندھیر، پہلے بحر عرب مین جانے والے جہازون کا بندرگاہ راندھیر تھا، مغلون کے شروع عہد مین اس کے بجاے سورت کی آبادی بڑھی اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت مین اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ سنہ ٩٣٧ھ نظر آئی، تاریخ کا مصرع یہ تھا، ع

باد آباد بندر سورت

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات مین ہے، اس یادداشت مین اس کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی تھی،

بناکرد مسجد بجاے کنشت   برایوانش انا فتحنا نوشت
٥٩١ھ

راندھیر کی پرانی مسجد چند دوستون کی دعوت پر راندھیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دولتمند دیندار مسلمان تاجرون کا مسکن ہے، اور دعوی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس قصبہ مین جس قدر خوبصورت، اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدین دیکھنے مین آئین پورے ہندوستان مین کہین نہین آئین، ان مسجدون مین سے ایک قدیم مسجد جونا دوارہ ہے، یادداشت مذکور مین اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی،

گر کسے پرسد ز تو نافع ازین معبد شریف   گو مسمی مسجد اعلی و درباب شریف
٧٩٥ھ

گجراتی ہندوی کی بعض کتابین بھی اس خاندان کے ذخیرہ مین دکھائی دین جنمین سے درجِ ذیل کتابین ذکر کے قابل ہین،

لغتِ عربی و ہندی | عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا جس کے شروع کے چند شعر یہ ہین،

اللہ خدا ہے کرتار	الخالق آفرید سرجنہار
الدنیا گیتی سنسار	الاحمق نادان گنوار
الجنت بہشت سرگ	السقر دوزخ نرگ
الیوم روز دیس	الشہر موئی کیس
اللیل شب رات	القول گفت بات
السبیل راہ باٹ	السبع ہفت سات
الاسم نام ناؤں	الموضع دیہہ گاؤن
الظل سایہ چھانوں	المقام جایگہ ٹھانوں
الراس سر سیس	العشرین بست بیس
العین چشم آنکھ	اللحیہ ریش پانکھ
الاذن گوش کان	الورق برگ پان
الطعام خوردن کھان	السہم تیر بان

آخری حصہ:-

الفرح خوشی بلاس   القنوط نا امید نراس

الفخذ ران تہی جانگ   الجسم تن ہے آنگ

المورد آب خورا درارہا   السمر افسانہ پواڑا

الکدر تیرہ گدلا   النقیم نابینا اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا،

اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز سید نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت مین ہے، مگر وہ اس کے علاوہ ہے، اس کے ابتدائی شعر یہ ہین،

الالہ پرستیدہ پوجیا   المعلوم دانستہ پوچھیا

المحمد ستودہ بکھانیا   المعروف شناختہ پچھانیا

الرسول فرستادہ بھیجیا   الواضح روشن سنجیا

الآل دودمان کنبہ   العنقود خوشہ لونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات مین عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندی سے آشنا کرنے کے لئے اس قسم کے لغت یہان لکھے گئے ہین،

رسالۂ فقیری چہار پیر چودہ خانوادہ

اس رسالہ کا آغاز ان لفظون سے ہے،

" بدانکہ بوجھ تون یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے، باید پوچھے ویسکے وگرنہ تو فقیری نہ کرے،

سوال ۔ اگر تیرے پوچھے کہ اوّل فقیری کیا ہے و آخر فقیری کیا ہے، اور خانہ

یعنی گھر فقیری کیا ہے، اور کیلی فقیری کیا ہے، اور لقمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال و جواب پر رسالہ کے اکیس صفحے ختم ہوئے ہین، تصنیف و مصنف کے ذکر سے پوری خاموشی ہے،

رسالہ فقہ ہندی | یہ فقہی مسئلون کے بیان مین ایک نظم ہے، آغاز کے اشعار یہ ہین،

حمد و ثنا سب رب کون خالق کل جہان — لائق حمد ثنای کے اور نکو نہ جان
علم شریعت نال وہی بھیجا پاک رسول — جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
یارب اپنے کرم سون بیحد بھیج درود — نبی محمد مصطفےٰ تسون ہوں خوشنود
بھیجو اُن کی آل پر اور اصحاب تمام — تس پیچھو احباب پر بہت درود سلام
کیتے مسئلے دین کے عبد رکھے اہین — فقہ ہندی زبان سے بوجو کر دو یقین
مطلب مسئلے پوچھنا جو کچھ ہوئے زبان — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہین اور ان کے تحت مین ہر قسم کے مسائل ہین، خاتمہ مین تصنیف کا سال ۱۰۷۵ھ بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ مین ہے،

فقہ ہندی کوں موماں کرو زباں پر یاد — مسائل آوین دین کے کبھو نہ ہوے فساد
سنہ ہزار پچھتر بیچ ماہ رمضان تمام — اورنگ شاہ کے دور مین نسخہ ہوا تمام

اس فقہی نظم مین خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی و فارسی کے بجاے ہندی وزن کی پیروی مین ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگون کے زمانہ مین ہندی کس کو کہتے تھے،

داستان حضرت ماہ رمضان	اس نظم مین ماہ رمضان کی فضیلتون کا ذکر ہے مصنف کا نام بدیع الدین ہی شروع کے شعر حسبِ ذیل ہین،

سرنامہ از نام سبحان لکھوں — کہ دل کی ورق پر سجل کر رکھوں
زبان کو ہے جو ہر اسی کی ثنا — اسی کی سو قدرت ہی جگ مین عیاں
کریم و رحیم و وہ غفّار ہے — کرم عاصیاں پر کرہنا رہے
ز ہر چیز اس کی صنعت کا بیان — کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما

آخر مین لکھا ہی،

کرو اسکی سب نعمتوں پر شکر — مصیبت کے اوپر حلم ہے صبر
کہ تا عاقبت تیری ہووے بھلی — کہ شادی و غم جگ مین جائے چلی
بدیع الدین تعریف عمل کی کرو — کہ چھوٹک کی جس سین توقع دھرو

اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبین، اور قافیون مین صرف صوتی ہمرنگی ہی عربی الفاظ حلم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے جس طرح ہندی مین بولے جاتے ہین،

داستانِ قیامت	اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے،

سخن ہی مرا جوں گلِ بوستاں — نصیحت کی باتاں سنو دوستاں
بباسی مسلماں کہاتے ہین دست — کہ کھاتے ہین سب گاے بکری کا گوشت
بباسِ شریعت کریں تن منین — شریعت کی باتاں نہ کچھ من منین
بڑی ریش تسبیح خوش پیرہن — بھری دل میں کیں بھاتے مکر و فن

آخری شعر مین اس نظم کا سال ۱۱۰۰ھ (؟) بتایا گیا ہے،

سنہ ایکہزار و ستو تر نے سو — لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو
بتاریخ غرہ دریں ماہ پیر — باتمام آں شد، مدد دستگیر

فقہ مبین | یہ نظم فقہ کے مسائل مین ہے، آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بنام پاک رب العٰلمین سوں — شروع کرتا ہوں میں فقہ مبین سوں
بحق مفخر و مقبول مرسل — سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل
مسائل فقہ کے ہین اصل ایمان — جو نیں بوجھے سو وہ کیوں ہوئے مسلمان

اس کے بعد اپنے تمام ۱۴ ماخذوں کا نظم مین ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل پھر طہارت، وضو، غسل وغیرہ، اس کے آخر مین بدعت کا رد اور جوے کی برائی ہے، آخر مین ہے،

یقین فقہ المبیں کوں کرتے مختوم — بحق دیں پناہ آل معصوم
صد و ہشتاد و دو والف ہجرہ — بتاریخ ہمایوں گشت تمت
اگیارا سو میں اسی اوپر دو — سنہ ہجری نبیوں کے بتایو

رسالہ کے آخر مین خاتمہ کی عبارت ہے،

"نسخہ قوت دین فقہ المبین تصنیف حضرت شاہ یقین رحمۃ اللہ علیہ"

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین، کتاب کا نام قوت دین فقہ المبین اور تصنیف کا سال ۱۱۸۲ھ معلوم ہوتا ہے،

مثنوی کتخدائی | کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف مین ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

ثنا و حمد ہے درگاہِ یزداں | وو خالق سب کا ہے کیا جن و انسان
ثنا و حمد کے لائق سدا ہے | سزاوار او خدائی کا خدا ہے

. . . .

محمد اشرف اولادِ آدم | حبیب و سرور و سردارِ عالم
شہ آدم محمد سرورِ دین | کہ ختم الانبیا رہیں رہبرِ دیں
ہوا جس شان میں لولاک وارد | دیکھو محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہما السلام کی تعریف میں چند شعر ہیں۔ اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے،

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف | نزاکت سیں لکھوں میں اسکی توصیف
مہیا سب کیا سامانِ اظہر | لباس و زیور و لولو و گوہر

اس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں:- در وصف الطعام، در وصف المجلس، در وصف بردن برات، در وصف شہر گشت، در وصف نکاح خوانی، در بیان خلوت، خاتمہ اس پر ہوتا ہے،

سخن کو مختصر کاں تک لکھے گا | یہ ہے طومار آخر کوں تھکے گا
بحضرت عیش باد اساز واری | مری یو مثنوی ہے یادگاری
شب بست و دوم از ماہ رجب | کہ شادی ہور شہر گشت ہے شب
سنہ ہجری دراں وقت بود موجود | ہزار و یکصد و تسعین و یک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے، وزن سے حرفوں کا گرنا، اس وقت معیوب نہ ہوگا،

وفات نامہ حضرت نبیؐ | آغاز:-

بنا اوّل کروں حمد خدا میں زبان او پر اپس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے جس مین زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے،

مجھے توفیق دے یارب کہ بولوں بنا ہجر نبی دکھنی ہیں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں، کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہی،

قصہ بانو | اس مثنوی مین ایک قصہ بیان ہوا ہے جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی مین تھا، اور اب دکھنی مین اس کو نظم کیا جاتا ہے،

عزیزاں روایت سنو کان دھر اوّل فارسی تھی یہ دکھنی دگر
اتھا گوڈرہ ایک شہر کا جو نام ہمیشہ فتنج کا اتھا وان مقام
بیٹھے ایک دن اس جمعہ مسجد منے اتھے خرد و بزرگ او سارے جنے
وُتے میں مسافر نیا آن کر سلامُ علیک کہہ کے بیٹھا مگر
پوچھے سب نے اسکوں توں کاں سے آیا شہر ہے دور ہے نام محمدؐ حیا
لگا بولنے کوں او یوں سُنکے بات زلیخا کا قصہ اونوں کے سنگات
مگر ساری مجلس نے سنکر کلام لگے بولنے آفرین سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے، آخر مین ہے،

فتح مختصر کر تو اپنی زبان　　　کہاں تک تو لکھیگا اسکا بیان

زمانہ معلوم نہین، تاہم اس کے بعض الفاظ خاص لحاظ کے قابل ہین، "تھا" اور "تھے" کی جگہ "اتھا" اور "اتھے" "اور" کی جگہ "او" "مین" کی جگہ "منے"، "کہاں" کی جگہ "کان"، "دہ" کی جگہ "او"

قصۂ سوداگر عجم | یہ نظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان مین ہے آغاز اس طرح ہے:-

ثنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں　　　درود آل مصطفیٰ اوپر دل و جاں سیں مین پڑھتا ہوں
درود اں حمد کے پیچھوں حکایت اک کہوں تا　　　عزیزاں تم سنو اسکوں کہوں ل کوں تمیں حاضر

آخر مین تاریخ ہے،

گیارہ سو اوپر چھپن برس گذری تھی ہجرت کے　　　تبھی تصنیف مین آئے خوارق پیر حضرت کے
۱۱۵۶ھ
توجہ رحمۃ اللہ پہ کرد نظم اسے شہ پیراں　　　صفائی باطنی ہوے اسے اک حضرت میراں

خالق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات مین خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے، اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس مین شک ہے، تعجب کی بات ہے کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہین ملا ہے، اس کتبخانہ مین اس کا ایک نسخہ نظر آیا لیکن وہ بھی قدیم نہین، رسالہ تاریخ سے گو معرا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سوا سو برس سے زیادہ عمر کا نہین،

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع مین ایک لفظ ملتا ہے، جو "بدا" یا "بڑا"

پڑھا جاتا ہے، ع

واحد ایک، بڑا کرتار

مسلم یونیورسٹی کے سلسلۂ تصنیفاتِ خسرو مین جو نسخہ چھپا ہے، اس مین یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے، اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے لیکن عربی مین "بدا" کرتار کے معنی مین میرے پندار مین نہین آیا ہے، معلوم نہین فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونون کے فاضل ہین، اسکی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ مین یہ لفظ بڑا لکھا گیا، لیکن یہ بھی مہمل ہے، بعض مطبوعہ نسخون مین "خدا" چھپا ہے، اور شاید یہی صحیح ہو،

زیر بیان نسخہ مین اوّل تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر مین قدامتِ زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے جو مطبوعہ نسخہ مین مجھے نہین ملے،

چون برادر خسر بورہ کیست، جو کا بھائی ہے | درخسر پی جو کا باپ جن دی جائی ہے
ریخت اندر گوش خود سیماب دی بورا بھیا | پنبہ پیک وئی گالا (گھٹا)، جسم تن آمد۔ کیا
وان نہالی بستر و بالین تکیہ لے جوان | غلط بالا۔ لیٹ اوپر۔ اُس بچھاؤ گسترا ن

حسبِ ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ نمبر ۱۸۴ مین اس طرح چھپا ہے،

عطسہ چھینک، شاخ سینگ، کفش گر ہے کفش دوز

گازر و خیاط ہے دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہین معلوم ہوتا، فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم ہے، پیشِ نظر نسخہ مین یہ غلطی نہین، پھر دوسرے مصرع مین قافیہ دوز مکرر ہے، جو درست بھی نہین، اور جامہ دوز تو خیاط اور درزی کے تقابل کے بعد بےمعنی سا ہے، پیشِ نظر نسخہ مین یہ شعر یون ہے،

عطسہ چھینک و شاخ سینگ و کفش گر ہے کفش دوز

گازر و خیاط ہے دھوبی و درزی، دیس روز

اسی کے بعد تتمہ نسخہ مطبوعہ نمبر ۱۰۵ مین ہے،

وانکہ بےبخت ست ابھاگ بخت بھاگ فارسی آمد سرود و ہندوی گویند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع مین غلط ہے، دوسرا رکن ٹوٹتا ہے، اور تیسرا رکن غائب ہے، چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے، پیشِ نظر نسخہ مین یہ غلطیان نہیں،

وان کہ بدبخت است ابھاگا، بخت در فُرس ست ابھاگ

فارسی آمد سرود و ہندوی گویند راگ

مطبوعہ نسخہ مین ہے، ع

"طُعم سواد، و طعام خورش، جو کہئے کھانا"

پیشِ نظر نسخہ مین طُعم کی جگہ "مزہ" ہے، جو زیادہ بامزہ ہے،

مطبوعہ مین ہے،

دُرّ و مروارید موتی جانئے ہم صدف سیپی، بسمندر آنئے

پیشِ نظر قلمی مین دوسرا مصرع یون ہے ع

"ہم نُبد، رانی گلے پیچھانئے"

اس قسم کے اختلافات اور بھی ملین گے لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے، مطبوعہ نسخون مین لوگون نے زمانۂ مابعد کی ضمیرین کردی ہین، مثلاً قدیم "تون" کی جگہ جدید "تو" بہت پرانی زبان مین متکلم "ہون" تھا جو اب بھی ہوتا ہے واحد متکلم کا صیغہ ہے، حضرت خواجہ فرید شکر گنج ۵۰۴ھ مین پیدا ہوئے اور ۶۶۴ھ مین وفات پائی، اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ۷۲۵ھ مین وفات پائی ہے، غرض دونون کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا جو فقرہ مین نے اپنے مضمون "ہندوستان مین ہندوستانی" کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس مین واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیرین "ہون" اور "توں" استعمال ہوئی ہین، بعینہ یہی دونون ضمیرین پیش نظر نسخہ مین ہین، مثلاً

خواہم گفت کہونگا ہوں	خواہم کرد کروں گا ہوں
خواہی آمد آویگا توں	خواہی نشست بیٹھیگا توں
خواہم دید دیکھونگا ہوں	خواہی دید دیکھے گا توں
خواہم داد دیونگا ہوں	خواہی داد دیویگا توں
خواہم دوید دوڑیگا ہوں	خواہی دوید دوڑیگا توں

مطبوعہ نسخہ مین "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ "تیں" ہے،

سفر گجرات کی کچھ اور باتین بھی بیان کرنی تھین، مگر دیکھتا ہون کہ یہ قلمی سفر بھی خاصہ طویل ہو گیا ہے، ہمسفر ناظرین کے ملالِ راہ کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ یہین روک لیجاتی ہے،

(معارف ستمبر ۱۹۳۶ء)

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

"ہندوستانی ایکاڈیمی کی ادبی کانفرنس الہ آباد ۱۹۳۷ء میں پڑھا گیا"

لغت کا کام عام طور سے لفظوں کے معنی بتانا سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی طرح قوموں سے متعلق ہر چیز ایک مستقل تاریخ رکھتی ہے، زبان قوم کی تاریخ کا نہایت اہم جزو ہے اس لئے زبان اور اس کے لفظوں کی تاریخ بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے اور یہ تاریخ ہمارے لغت کا بڑا اہم باب ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی طرف ابھی تک ہماری زبان کے لغت نویسوں نے توجہ نہیں کی ہے،

قومیں اپنی تاریخوں میں کتنی ہی خیانت کریں، اور اُن کے واقعات کو کتنا ہی الٹ پلٹ ڈالیں، مگر زبان اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ ایک سچے امانت دار کی طرح پچھلی روداد کا ریکارڈ یا مسل ہمارے لئے تیار رکھتا ہے جس سے اس زبان کے محقق ضرورت کے وقت پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں، چنانچہ اگر ہم یہ جاننا چاہیں کہ کسی قوم سے تعلقات اور رابطے دنیا کی کن کن قوموں سے رہے ہیں، تو اس قوم کے لفظوں کے خزانے میں ہمارے لئے معلومات کا بڑا سرمایہ محفوظ ملے گا،

ہماری ہندوستانی اردو زبان کی عمر چاہے کتنی ہی چھوٹی ہو پھر بھی اس کی ملکیت مین ایسے لفظون کی کمی نہین، جو اپنی مستقل تاریخ رکھتے ہین، اور اپنی خاموش زبان سے ہم کو سنانے کے لئے بہت سے ایسے واقعات یاد رکھتے ہین جنکو کاغذی تاریخ کے اوراق بھلا چکے ہین،

ہم اپنی زبان کے اس قیمتی سرمایہ کا آغاز سکون سے کرنا چاہتے ہین تاکہ یہ لفظی دولت مضمون کی معنوی دولت کے لئے فالِ نیک بن سکے،

دام - ہماری زبان کا ایک پامال لفظ دام ہے، ایک تو اس کے معنی قیمت کے ہین، اور دوسرے معنی ایک معمولی سکہ کے ہین جسکی ایک ذلیل ترین صورت ہماری زبان مین چھدام کی ہے، جو چھے اور دام دو لفظون سے بنا ہے، اس لفظ کی تاریخ کے لئے آج سے دو ہزار برس پہلے ہم کو لوٹ کر جانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ یونان کے کشورکشا اور سوداگر یورپ ایشیا پر چھاگئے تھے، مصر وشام وعراق سے ایران اور ہندوستان تک کے ڈانڈے مل گئے تھے، ان ملکون مین یونانی حکم اور یونانی سکے چلتے تھے، اور ان کے یونانی نام زبانون پر تھے یونانیون کے چاندی کے سب سے کم قیمت سکہ کا نام درخم (DRACHMA) تھا، اسنے عربی مین درہم اور فارسی مین بیچ سے ایک حرف گرا کے درم کی صورت اختیار کی اور ہندستان مین ایک ف اور گر کر اور اسکی جگہ ایک لمبی آواز بڑھکر دام ہوگیا، یہ لفظ جس طرح سکہ کو بتاتا تھا، سکہ کے وزن کو بھی بتاتا تھا، چنانچہ عربی طب مین دواؤن کا وزن درہم، اور فارسی طب مین درم سے بتایا جاتا ہے، اسی لفظ نے جب فرنگستان کی ٹوپی پہنی تو ڈرام ہوگیا، جو اب ہمارے انگریزی طبی کالجون، دواخانو

اور شفاخانون مین ایک بیگانہ کی حیثیت سے وارد ہے، اور شاید اب کوئی پہچانے بھی نہین کہ دام اور ڈرام دونون کی ایک ہی شخصیت ہی صرف آب وہوا، لہجہ اور شکل وصورت کا فرق ہوگیا ہے،

اکبر کے زمانہ مین دام چاندی کے سب سے چھوٹے سکہ کے بجائے تانبے کے سکہ کا نام تھا، (صفحہ ۱۰ نولکشوری) اسکو پہلے پیسہ کہتے تھے، اوراب بھی کہتے ہین، یہ روپئے کا چالیسوان حصہ تھا، پھر ایک دام کے پچیس حصے کرکے ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے، اب اس کو گنڈہ کہتے ہین، اکبر کے زمانہ مین بھی اس کا نام ملتا ہے، (صفحہ ۱۲)

اسی تقسیم سے ایک محاورہ یورپ کی زبان مین اورچلا ہے، ہر گانون یا ہر زمیندار کی ملکیت ۱۶ آنے فرض کیجاتی ہے اور یہ آنے پھر پائی اور دام پر بانٹے جاتے ہین، ایک دام کا آدھا ادھیلہ اور ۱/۴ پاؤلہ، اور ۱/۸ دمڑی کہلاتا ہے، اور یہ اخیر لفظ دام کی تصغیر یا تحقیر ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ جو دام قیمت کے معنی مین ہم بولتے ہین، وہ اسی سکہ کی یادگار ہے، جس سے پہلے چیزون کی قیمت کا اندازہ اور لین دین کا کاروبار کرتے تھے

آئینِ اکبری کے مطابق ایک من تانبے مین ایک ہزار چالیس دام (پیسے) تیار ہوتے تھے،

تغلقون کے زمانہ مین" درم سنگ" خرید فروخت کی تول مین باٹ کے معنی مین

لہ آئین اکبری جلد اوّل (ادارہ)

بولا جاتا تھا۔ (فیروز شاہی ضیا برنی ص ۳۱۹)

کیرانت اودھ کے دیہاتی کاغذوں میں ۱۶ آنے کی تقسیم آنوں پر اور آنوں کی پائیوں پر اور اس کے بعد کیرانت اور جو پر ہوتی ہے، لفظی بہروپیوں کے پہچاننے والوں کو اس کے پہچاننے میں دقت نہیں ہو سکتی کہ یہ کیرانت عربی قیراط کی خرابی ہے، ایک عربی دینار میں ۲۰ یا ۲۴ قیراط ہوتے تھے[1]، عربی میں قیراط یونانی سے آیا ہے، آجکل انگریزی میں بھی لفظ کیرٹ (Carat) کی صورت میں مستعمل ہے، اور انگریزی سونے کے بنے ہوئے زیور اور چیزوں میں اتنے کیرٹ گولڈ کی اصطلاح کا عام رواج ہے۔

اشرفی درم اور قیراط جس طرح باہر سے آئے ہوئے نام ہیں اسی طرح ہمارے سب سے قیمتی سکہ اشرفی کا نام بھی باہر سے آیا ہوا ہے، مجھے بہت دنوں سے اس کی اصلیت کی تلاش تھی، اور پتہ نہ چلنے پر اس کو یہ کہہ کر تسکین دے لی کہ چونکہ یہ طلائی سکہ سب سکوں میں اشرف ہے، اس لئے اشرفی کہلایا، مگر دفعۃً ایک غیر متوقع ماخذ سے اس کی اصلیت دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ سکہ اشرف نہ تھا، بلکہ جس بادشاہ کی طرف وہ منسوب ہے، وہ اشرف تھا۔

طلائی سکہ کے لئے سب سے پرانا نام دینار ہے، اور یہ بھی یونانی ہے[2]، مگر چونکہ یونان میں یہ سکہ جاری تھا، اس لئے انھوں نے عبد الملک کے زمانہ میں ۷۴ھ یا ۷۶ھ[3] میں جب اپنا طلائی سکہ ڈھالا تو اس کا نام دینار ہی رہنے دیا، جب ان کے قدم ہندوستان پہنچے تو ان کا دینار

۱؎ لسان العرب لفظ قرط ج ۹ ۲؎ جرجی زیدان نے اس کو لاطینی لکھا ہے، تاریخ تمدن اسلامی ص ۱۱۹ ج ۱ ۳؎ مقدمہ ابن خلدون ص ۲۱۸

بھی ان کے ساتھ آیا، اور آج تک خاندانی مسلمانوں میں دینِ مہر کی تعداد میں سکہ رائج الوقت کے ساتھ چند "دینار سرخ" رسمی طور سے جاری ہیں،

تغلق کے زمانہ میں ہم کو اشرفی کے لئے دو لفظ ملتے ہیں، ایک تنکۂ زر، یہ تنکہ سکہ کے معنی میں عام طور سے بولا جاتا تھا[1] (برنی ص ۳۱۴ و ص ۳۱۵) اور اسی سے تنخواہوں کی تعیین ہوتی تھی، پیادے کی ماہانہ تنخواہ ۴۴ تنکہ، اور سوار کی ۷۰ تنکہ تھی، (برنی ص ۳۱۹) مخدوم زادہ بغداد کے لئے دس لاکھ تنکہ وظیفہ مقرر ہوا، (برنی ص ۴۹۶) مصری خلیفہ کا سفیر جب سلطان محمد تغلق کے دربار میں آیا ہے اور جمعہ کے دن خلیفہ کا نام خطبہ میں پہلی دفعہ پڑھا گیا ہے تو چند طبقہا پُر از تنکۂ زر و نقرہ بر آں نثار شد (برنی ص ۴۹۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کے لئے اس زمانہ میں تنکۂ زر بولا جاتا تھا، خلجی کے زمانہ میں ایک تنکۂ زر ایک تولہ سونے کا ہوتا تھا اور تنکۂ نقرہ ایک تولہ چاندی کا (فرشتہ ص ۱۱۴) روپیہ کو تنکۂ نقرہ، اور اس سے کم درجہ سکہ کو صرف تنکہ کہتے تھے، یہ لفظ قدیم یادگار کے طور پر آج بھی بعض بعض پرانے خاندانی مسلمانوں میں دین مہر کی تعیین میں بولا جاتا ہے

(دیکھو مولانا حالی کا خط بنام سید سلیمان ندوی در معارف)

خیال ہوتا ہے کہ یہی تنکہ تو آج "ٹکے" کی صورت میں ہمارے سامنے نہیں ؟

دوسرا لفظ مہر زر ہے، اس کو مہر اس لئے کہتے تھے کہ اس پر شاہی نام نقش ہوتا تھا، مہر زر کی اصطلاح برنی میں ملتی ہے،

---

[1] ڈاکٹر تارا چند صاحب نے بتایا ہے کہ تنک سنسکرت میں سکہ کو کہتے ہیں،

سلطان محمد مہر پیدا آورد و فرمان داد کہ مہر را خرید و فروخت چنانچہ مہر زرد نقرہ جاری است ، (ص ۴۷۵)

یہی مہر زر اکبر کے زمانہ مین بھی زبان وقلم پر تھا، آئین اکبری مین اکبری سکون کے بیان مین بھی یہ لفظ ملتا ہے، (ص ۱۷) اگرچہ اکبر نے اشرفی کے لیئے سہنسہ، رہس، آتمہ، چگل، لعل جلالی، آفتابی وغیرہ الفاظ بنائے اور چلائے، مگر مہر کا نقش بھی مٹا نہین، بلکہ پرانی شاہی اشرفی کو آج بھی مہر کہتے ہین،

دکن مین طلائی سکہ کا نام "ہون" تھا، جو آخر مین مخفف ہو کر ہن ہو گیا، اور آج ہماری زبان مین اس نسبت سے دولت کی کثرت کے معنی مین "ہن برسنا" ایک یادگار رہگیا ہے، روپیہ کا لفظ اور سکہ شیر شاہ کا چلایا ہوا ہے، (آئین اکبری ص ۱۸) اور عجب نہین ہے کہ روپا سے بنا ہو، سونے کے سکے کے لئے اشرفی کا لفظ ہندوستان مین نورالدین جہانگیر کے زمانہ مین استعمال مین آیا ہے، چنانچہ فرشتہ نے اپنی تاریخ مین حسن گنگو بہمنی کے خزانہ پانے کی اتفاقی سرگذشت کے بیان مین لکھا ہے :-

"زنجیر را در گردن ظرفے مملو از اشرفی علائی وطلائے غیر مسکوک دید" (فرشتہ نولکشوری ص ۲۷۴)

فرشتہ کی تصنیف کا زمانہ ۱۰۱۵ھ سے ۱۰۳۳ھ تک ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گجرات و دکن کی راہ سے یہ اشرفی مسافرانہ ہندوستان وارد ہوئی ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ سونے کے سکہ کے لئے افریقہ کی طلاخیز اور زرریز زمین ہی سب سے زیادہ موزون ثابت ہوئی ہے، انگریزی گنی کا مولد افریقہ کا ملک گانیا یا گینی قرار

پایا ہے جس کو عرب غانہ کہتے تھے، اور بلاد التبر (سونے کا ملک) کے نام سے پکارتے تھے، اور وہین سے سونا لاتے تھے، وہم پہنچا ہے کہ غانہ کا تعلق عربی کے غنی اور غنا سے تو نہین؟ بہرحال ہماری اشرفی کا مولد و منشا بھی ہندوستان نہین، بلکہ ایشیا بھی نہین، افریقہ ہی کا ایک گوشہ ہے، مگر دوسری طرف کا، یعنی مصر،

مصر کے چرکسی بادشاہون مین سے ایک برسبائی تھا، اس نے سنہ ۸۲۵ھ سے سنہ ۸۴۱ھ تک حکومت کی ہے، اس کا شاہی لقب الملک الاشرف تھا، یہی اشرف اشرفی کا مصدر و معدن ہے، مشہور عرب جہازران ابن ماجد اسد البحر نے جس نے سنہ ۹۰۴ھ (سنہ ۱۴۹۸ء) مین واسکوڈی گاما کو ہندوستان پہنچایا تھا، الفوائد فی اصول البحر والقواعد کے نام سے جہازرانی پر ایک کتاب لکھی ہے، جو چند سال ہوئے کہ فرانس سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے، اسکا زمانہ نوین صدی ہجری کا اخیر اور دسوین صدی ہجری کا شروع تھا، یہ بحر ہند اور بحر عرب کا ایک نڈر جہازران تھا، گجراتی ہندو بیوپاریون کی طرف سے اس کو کنکا کا سنسکرت خطاب ملا تھا، جس کے معنی ماہر ریاضی دان کے ہین، (دیکھو میری کتاب عربون کی جہازرانی ص ۱۳۰-۱۳۷) اس کی اسی کتاب کے مطالعہ سے اشرفی کا بھید مجھے معلوم ہوا، ابن ماجد ایک خاص سلسلہ مین لکھتا ہے،

والحادی عشر برسبی الاشرف	گیارھواں بادشاہ برسبائی
ضارب سکۃ الاشرفی،	اشرف ہے جو اشرفی سکہ کا چلانے
(ص، ۴۰ طبع پیرس)	والا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ اشرفی کا سکہ مصر سے چل کر بحر ہند مین داخل ہوا تھا اور وہان سے پورے ہندستان مین پھیل گیا، ابن ماجد نے اپنی یہ کتاب ۸۹۵ھ مین لکھی ہے، وہ اس سکہ کے بانی کا ذکر کیا ہے، اور فرشتہ نے اپنی اصل کتاب اس کے بیس برس بعد ۹۱۵ھ مین لکھی اور "اشرفی علائی" کا نام لیا ہے یعنی علاء الدین خلجی کے وقت کی اشرفی، حالانکہ خلجی کے زمانہ مین اشرفی کا نام بھی پیدا نہین ہوا تھا، مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم پرانے زمانہ کے بادشاہون کے سونے کے سکون کو یا انگریزی پونڈ کو اشرفی کہدیتے ہین،

بیمہ روپیے اور اشرفی کی تقریب سے وہ طریقہ یاد آیا جس سے قیمتی چیزین محفوظ کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر بذریعہ ڈاک بھیجتے ہین جس کو ہم آپ بیمہ کہتے ہین، خیال یہ تھا کہ یہ ڈاک کے نئے طریقون مین سے ہے، اور جہان سے یہ نئے طریقے آئے ہین، وہین سے یہ لفظ بھی بگڑ کر آیا ہے، مگر اتفاق سے سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ کا قلمی نسخہ نظر سے گذرا، جو عالمگیری عہد کی تصنیف ہے، ۱۱۰۷ھ مین عالمگیر کی تخت نشینی کے چالیسوین سال مرتب ہوئی ہے،

سجان رائے اہل ہند کی دیانت اور امانت داری کی دلیل مین یہان کے مہاجنون کے ذریعہ سے ترسیلِ زر کا حال لکھتا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے،

"لین دین مین یہان کے لوگون کی سچائی کا یہ حال ہے کہ کوئی کتنا ہی ناآشنا اور انجان ہو، گواہی اور شہادت کے بغیر ہزارون روپیے امانت صرافون کے حوالے کر دیتا ہے یہ صراف بھی ایسے سچے ہوتے ہین کہ جب اُن سے امانت واپس مانگیے

بلا حیلہ حوالہ کیے بے توقف واپس کر دیتے ہین، اور طرفہ یہ کہ اگر کوئی دور دراز راستون کے ڈر سے اپنا نقد روپیہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکے تو وہ ان کے حوالے کر دیتا ہے، یہ دیانت دار صراف ان روپیوں کو اپنی تحویل مین لے کر ہنڈی مین اپنے کارندون کے نام جو ہر شہر مین ان کی طرف سے سچائی کی دوکان کھولے رہتے ہین، ایک پرچہ لکھ کر دیدیتے ہین، اس کو یہان کی زبان مین ہنڈی کہتے ہین، یہ کارندے اگرچہ سیکڑون میل کی مسافت ہو اس پرچہ کو دیکھنے کے ساتھ بلا حجت اس کو روپیہ دیدیتے ہین، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس پرچہ کو جو کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہین ہے، اگر مقررہ مقام کے علاوہ مالک کسی دوسری جگہ بھیجنا چاہے تو اُتنے ہی روپئے اس کو فوراً مل جائینگے، صرف یہ ہوگا کہ خریدنے والا تھوڑا کمیشن (تمتع) اس سے لیگا"

اب اس کے بعد اصلی فقرہ آتا ہے،

"عجیب تر آنکہ اگر تاجران بسبب طرق ہائلہ اقمشہ و امتعہ و دیگر اموال آنہا بجنس در قرارگاہ سلامت رسانیدہ بمالکان عائد می نمایند، وآں را بزبان این مردم بیما گویند"

اس عبارت سے یہ معلوم ہو گیا کہ پرانے ہندوستان مین منی آرڈر بھیجنے، بنک چک استعمال کرنے، اور قیمتی چیزون کو ہمیشہ کسی دوسری جگہ بیمہ کر کے بھیجنے کا کیا طریقہ تھا، اور اس سے لفظ "بیما" کی قدامت کا حال بھی معلوم ہوا،

"بزبان این مردم بیما گویند" سے خیال ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہندی یا سنسکرت کا لفظ ہو گا مگر مین نے ہندی اور سنسکرت کے عالمون سے اس کی تحقیق چاہی تو کوئی اس کا پتہ بتا

نہ سکا، اس سے وہم ہو جاتا ہے کہ یہ فارسی لفظ "بیم" بمعنی خوف سے نہ لیا گیا ہو، سجان رائے نے اس بیان کا آغاز بھی ان لفظون سے کیا ہے :-

"وطرفہ آنکہ اگر بنا بر خوف ممالک شخصے مبلغہائے نقد بمسافت دور و نزد یک نتواند برد"

اس لفظ "خوف" سے بھی ادھر ہی خیال جاتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ فارسی لغت کی کتابون مین یہ لفظ نہین ملتا، انیسویں صدی عیسوی کے آخر مین سید تصدق حسین نامی ایک بزرگ نے لغات کشوری کے نام سے ایک فارسی لغت منشی نولکشور صاحب کے نام سے لکھا ہے، اور نولکشور پریس مین سنہ ۱۹۰۰ء مین چھپا ہے، مؤلف نے مقدمہ مین یقین دلایا ہے کہ تمام لغات دیکھکر بڑی احتیاط سے یہ لغت لکھا گیا ہے، اس مین "بیمہ" کے لفظ کے نیچے اس کو فارسی بتا کر یہ تشریح لکھی ہے،

"بخوف رہزنی جو کسی ساہوکار کو محصول کسی نقد یا مال کے پہنچانے کا دین اور وہ اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہو"

لغات کشوری کی امانت و دیانت کا اگر اعتبار کیا جائے تو پھر بیمہ کے فارسی ہونے مین کوئی شک نہین رہ جاتا،

ڈاک - بیمہ کے ذکر سے سب کا خیال ڈاک، ڈاک خانہ اور ڈاک گھر کی طرف چلا گیا ہوگا، موقع ہے کہ آپ کے اس حسنِ التفات سے ہم فائدہ اٹھائین تعجب ہوگا کہ اس ڈاک کا ہمارے لغت مین پتہ نہین،

عربی مین ڈاک کے لئے برید کا لفظ استعمال ہوتا ہے مسلمانون مین امیر معاویہ نے سب سے پہلے اس نظام کو قائم کیا، اور برید اس کا نام پڑا، ہمارے عجمی اہل لغت نے اس کو فارسی بُریدن سے لیا اور بتایا کہ چونکہ ڈاک کے لئے دم بریدہ یعنی دم کٹے گھوڑے کام مین لائے جاتے تھے اس لئے ڈاک کو برید کہنے لگے، حالانکہ اگر یہ اشتقاق درست بھی ہوتا تو زبر کے بجائے ب کو پیش ہونا چاہیئے تھا، اب نئی تحقیق یہ ہے کہ یہ یونانی اور لاطینی سے عربی مین آیا ہے، اور وریڈا اسکی اصل ہے، ہندوستان مین مسلمانون کے ساتھ پہلے یہی لفظ آیا پھر ترکی لفظ اولاغ چلا، (برنی ص ۷۴۴ کلکتہ) مگر فوراً ہی اس کی جگہ ایک ہندوستانی لفظ نے رواج پایا، اور وہ لفظ دھاوا ہے، چنانچہ تغلقون کی تاریخ مین یہ لفظ بولا گیا ہے، ابن بطوطہ نے سفرنامہ مین بعینہٖ یہی لفظ لکھا ہے (۲ ص امصر) برنی نے فیروزشاہی مین اسی لفظ کا استعمال کیا ہے، (ص ۴۴۷ کلکتہ)

مگر اس کو دھاوا کیون کہتے تھے؟ اس کا پتہ ہم کو اپنون سے نہین بلکہ ابن بطوطہ جیسے بیگانے سے چلتا ہے، وہ کہتا ہے کہ دھاوا کے معنی اہل ہند مین تہائی میل کے ہین، چونکہ یہ ہرکارے ہر تہائی میل پر مقرر ہوتے تھے، اس لئے اس کو دھاوا کہتے تھے، اور استعمال سے راستے کے بجاے خود راستے والے پیادے کو دھاوا کہنے لگے لیکن غریب ناآشناے زبان کو اس مین غلط فہمی ہوئی ہے، دھاوا کے معنی سنسکرت مین دوڑنے کے ہین چونکہ یہ دوڑ کر چلتے تھے اس لئے ان کی چال کو دھاوا کہنے لگے، پھر وہ دھاوا ہو گئے، اور ہر تہائی میل پر جہان ٹھہرتے تھے وہ دھاوا ہو گیا،

دھاوے کے ان پیادون کی چوکیان ہر تہائی میل پر دلی سے لیکر دولت آباد تک بنی ہوئی تھین، پیادہ گھنگرو دار لاٹھی کو کندھے پر رکھکر تیزی سے دوڑتا ہوا اگلے دھاوے پر پہنچتا تھا، وہان دوسرا پیادہ گھنگرو کی آواز سنکر تیار رہتا تھا، وہ فوراً اس سے ڈاک لے کر آگے کے دھاوے کو دوڑتا تھا، اس طرح سندھ سے دلی ۵ دن مین ڈاک پہنچتی تھی (ابن بطوطہ)

اس دھاوے کی یادگار ہماری زبان مین دھاوا کرنا، دھاوے پر چڑھنا، دھاوا بول دینا اور دھاوا مارنا، آج بھی موجود ہے، اور دھاوے کے پیادے کو پایک کہتے تھے، جو پیک کی صورت مین محرم کی تقریب مین امام کے نقلی قاصدون کا ہم نے نام رکھا ہے،

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آل تیمور نے جب ہندوستان پر دھاوا کیا تو یہ لفظ یہان سے مٹ چکا تھا، چنانچہ اکبر کے زمانہ مین جب بدایونی نے اس لفظ کا استعمال کیا تو اس کو اس کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی، سلطان محمد تغلق کے حال مین کہتا ہے :۔

"در ۷۲۷ھ سلطان محمد تغلق عزیمت دیوگر کردہ از دہلی تا آنجا بر سر کروہے دھاوہ یعنی پایکان خبردار نشاندہ"

فرشتہ نے جہانگیر کے زمانہ مین اپنی کتاب لکھی تو "دھاوہ" کا لفظ مٹ کر ڈاک چوکی کا لفظ پیدا ہوچکا تھا، مگر کہتا ہے کہ اس کو پہلے یام (ی ام) کہتے تھے سلطان علاءالدین کے حال مین لکھتا ہے :۔

"از دہلی تا آنجا ڈاک چوکی کہ بزبان سلف یام می گفتند می نشاند"

یہ یام فارسی استعمال مین ہے، دکن مین مدراس سے لے کر پونا تک اس کے پیٹے

ٹپال اور ٹپہ خانہ بولا جاتا ہے، ریاست حیدرآباد کا سرکاری لفظ یہی ہے،

بہرحال ڈاک کا لفظ جہانگیر کے عہد مین یا اس سے کچھ پہلے سے بولا جانے لگا، اسکی اصلیت پر مین غور کرتا رہا ہون، میرا خیال ہے کہ اس کے معنی منزل کے ہونگے، چونکہ یہ منزل بمنزل جاتے تھے، اس لئے اس کو ڈاک کہنے لگے، اور اس کے ہر پڑاؤ کو ڈاک چوکی، چوکی بمعنی پہرہ، جس کی ایک یادگار چوکیدار ہمارے پاس موجود ہے، اسی لئے انگریزون نے اسی اصول پر بنگال سے الہ آباد تک اپنے منزل بمنزل سفرون کے لئے جو مختصر قیامگا بنائین ان کو ڈاک بنگلہ کہا، اور اب بھی وہ یہی کہے جاتے ہین، اور اگر لغت گھڑنے کا الزام نہ قائم کیا جائے تو جی چاہتا ہے کہ یہ کہون کہ ہندوستان و افغانستان کی سرحد پر ڈکہ اور بنگال کی حد پر ڈھاکہ، اور دوسری طرف موتی ہاری مین نیپال کے پاس دوسرا ڈھاکہ اسی منزلگاہ کے باقی نشان ہین، بہرحال منزل نے راستے کی، اور راستے نے خطوط ولفافہ اور اشیاے ڈاک کی صورت اختیار کی، اور اب وہ ریل گاڑی جو بہت کم منزل کرتی ہے مگر ڈاک لے کر چلتی ہے، ڈاک گاڑی کہلاتی ہے، ڈاک کے پچھلے معنی کی یادگار ڈاک بٹھانا، ڈاک لگانا، یعنی جلدی جلدی منزل بمنزل یا ہاتھون ہاتھ چیزون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا رہ گیا ہے،

فیض ساقی نے مرے ڈاک لگا رکھی ہے، (راسخ)

روح ہے ہر جسم مین مشتاق اخبار اجل،
اس لئے یہ آمد و رفت نفس کی ڈاک ہے (ناسخ)

اسی سے ڈاک بولنا بھی ایک محاورہ ہے یعنی نیلام مین منزل بمنزل کسی چیز کی قیمت بڑھانا

کچھ دن ہوے ایک قلمی ہندوستانی فارسی لغت برادرم پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (اسماعیل کالج بمبئی) کے پاس نظر سے گذرا یہ لغت کسی ایرانی یا پارسی نے لکھا ہے تالیف کا سنہ نہین معلوم، اس مین ایک لفظ ڈانکیہ دیکھا جس کے معنی نقیب کے لکھے ہین نقیب شاہی درباروں مین درباریون کو باادب بیٹھنے کے لئے زور سے آواز لگایا کرتے تھے، ڈانکنا کے معنی زور سے آواز لگانے کے ہین، اس سے دوسرا خیال یہ ہوتا ہے کہ ڈاک کی اصل ڈانک، اور ڈاکیہ کی ڈانکیہ ہے، چونکہ ڈاک کا چوبدار آواز دیتا ہوا چلتا تھا اس لئے اس کو ڈانکیہ اور اس کے کام کو ڈانک کہا گیا، اور ڈانک نے ڈاک کی صورت بدل کر منزل بمنزل رفتار کے معنی اختیار کر لئے ،

اگلے زمانہ مین مصر وغیرہ اور ہمارے ملک مین بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر اڑا دیئے تھے، اس نسبت سے ایک اڑتی سی بات کبوتر ہی سے ایک ملتے جلتے پرندے کی نسبت سن لیجئے ،

قمری ہماری زبان مین ایک خوش نوا پرندے کا نام قمری ہے، یہ نام عربی و فارسی سے آیا ہے، مگر اس کی اصلیت کے بتانے سے یہ دونون زبانین قاصر ہین، فارسی کے خاص لغتون مین یہ لفظ سرے سے نہین، مؤید الفضلا مین جو عربی آمیز فارسی الفاظ کا پرانا لغت ہے یہ لفظ ملتا ہے، اور تاج نام کسی لغت کے حوالے سے لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہین، پھر اس سے اختلاف کیا ہے کہ فاختہ اور چیز ہے اور قمری اور، فاختہ کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور

اس کی آواز یکے تو یا کو کو کی ہوتی ہے، گلے مین طوق ہوتا ہے، اور قمری کی دو قسمین ہوتی ہین، ایک سفید کافوری اور دوسری صندلی، اور اس کی آواز سے یا غفور کی صدا نکلتی ہے، تاج کے مشہور نام سے تو جوہری کی تاج اللغۃ کی طرف خیال جاتا ہے، اس مین شک نہین کہ جوہری نے قمری کا ذکر کیا ہے، مگر یہ نہین لکھا ہے کہ فاختہ کو کہتے ہین، بہر حال یہ فارسی نہین، عربی بھی نہین، کیونکہ اوّل تو عرب اس سے واقف نہ تھے، ان کے شعرون مین اس کا ذکر نہین، قدیم عربی لغت مین یہ مذکور نہین، اس کی ساخت اصل عربی لفظ کی نہین، اس کے اخیر مین جو یاے مشدّد ہے وہ نسبت کو ظاہر کرتی ہے، اور اسی نسبت کی طرف اکثر اہلِ لغت گئے ہین، جوہری کی تحقیق یہ ہے کہ یہ قُمر سے مشتق ہے جس کے معنی سپیدی کے ہین، اور اس سے صفت بنی اقمر بمعنی سپید، اس اقمر کی جمع ہوئی قُمر جیسے احمر سے حُمر، اور اب یہ ہوا کہ سپید پرندون کو جمع کے ساتھ یون بولے طیر قُمر، اب اس جمع کا واحد جب مراد ہوا تو جمع کی طرف یاے نسبت لے کر قمری واحد بنا لیا، جیسے روم سے رومی، زنج (زنگ) سے زنجی (زنگی) مگر اس تحقیق مین بڑی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے، عربی مین اس محنت سے کسی اور پرندے کا نام نہین رکھا گیا،

مجد فیروز آبادی نے قاموس مین قمر یہ لکھا ہے، اور بتایا ہے کہ کبوتر کی ایک قسم ہے، مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) نے تاج العروس مین لکھا ہے کہ مجد نے یہ محکم زمخشری سے لیا ہے، بعضون کا دعویٰ ہے کہ قمری عربی کا قدیم لفظ ہے، اس کی جمع قُمر، ابو عامر نام ایک جاہلی عرب شاعر کے کلام مین ہے،

ما فوق قمر الواد بالساھق

مگر اس کا کوئی دوسرا شاہد نہین،

قمری کے آخر مین جو ی ہے اس کو کوئی صاحب یاے مبالغہ سمجھتے ہین، مگر اکثرون کی راے یہی ہے کہ یہ یاے نسبت ہے، اب رہی یہ بات کہ کس کی طرف نسبت ہے، تو بعض لوگ اس کو اس نام کے ایک پہاڑ کی طرف نسبت سمجھتے ہین، اور بعض اس نام کے کسی مقام کا ذکر کرتے ہین، علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس مین اوپر کی تفصیل بتا کر لکھا ہے کہ ان کے استاذ نے شرح کفایہ مین اس کی تحقیق کی ہے،

اب اہل لغت کے دربار سے اٹھکر ہم آوارہ گرد جغرافیہ نویسون کے مسافر خانون مین پہنچتے ہین، یاقوت رومی معجم البلدان مین قمر نام کے ایک مصری شہر کا ذکر کرتا ہے اور ابن الفارس سے نقل کرتا ہے کہ قمری پرندہ اسی شہر کی طرف منسوب ہے، مقریزی خطط مصر مین دریاے نیل کے منبع کی تلاش مین نکلتا ہے اور بحر ہند کے جزیرون کو دیکھتا بھالتا چلتا ہے، اور اسی اثنا مین جزیرۂ قمر کا ذکر کرتا ہے، اور جس کا دوسرا نام جزیرۂ ملائی بتاتا ہے جسکو آج ہم ملایا کہتے ہین، ان ہی مین سے ایک جزیرے کا نام قمریہ بتایا ہے، اور اس کے بعد کہتا ہے

والیھا ینسب الطائر القمری (خطط مصر) اور اسی جزیرہ کی طرف قمری پرند منسوب ہے

البیرونی نے کتاب الہند مین ملایا کے کچھ جزیرون کا نام قمیر[1] بتایا ہے، (صفحہ ۱۰۳)

پرندون کے نام ان مقامون کی نسبت سے رکھنا، جہان پہلے پہل وہ پرندے کسی

---

[1] ہمارے دوست ڈاکٹر تاراچند نے بتایا ہو کہ انگریزی و فرنچ مین، اس کو اب بھی کھمیر KHMER کہتے ہیں،

خوش مذاق کو ہاتھ آئے ہون، عام بات ہے، ترکی چینی شیرازی وغیرہ اسکی مثالین ہین،

اتنی مسافت طے کرنے کے بعد ذرا سستانے کے لئے "غالب" کے اس شعر کا مطلب حل کیجئے،

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے،

فارسی شاعرون نے گل و بلبل کی طرح سرو و قمری مین محبت کا رشتہ جوڑا ہے،

قمریان پاسِ غلط کردۂ خود می دارند
ورنہ یک سرو درین باغ بہ اندامِ تو نیست

ایک اور پارے نسبت حل طلب ہے،

سوسی ہمارے ملک مین رنگین باریک دھاریون کا ایک سوتی کپڑا ہوتا ہے جسکو سوسی کہتے ہین، اسلامی زمانہ کے اکثر بنے ہوے کپڑون کے نام یا تو کاریگر کے نام یا مقام یا اس امیر یا بادشاہ کے نام یا اس کام کے نام پر رکھے جاتے تھے جو اس کپڑے مین خاص طور سے کیا جاتا تھا، جیسے تافتہ، بافتہ، زری، کارچوبی وغیرہ، یا مظفری، محمودی، علی قلی خانی وغیرہ، یا کاشانی، بنارسی، بھاگلپوری وغیرہ، انگریزی مین ململ کو جو مسلین کہتے ہین، وہ موصل کی طرف نسبت ہے،

سوسی نہ تو شخص کا نام ہے، نہ ہندوستان کے کسی مقام کا، یہ تو ظاہر ہے کہ اس کی نسبت سوس کی طرف ہے، سوس کے نام سے ایک شہر ترکستان مین ہے، اور دوسرا مغرب اقصیٰ یعنی ملک مراکش مین ہے، مگر یہ دونون مقام پارچہ بافی سے کوئی نسبت نہین رکھتے، لیکن ہے یہ واقعی شمالی افریقہ کے ایک صنعتی مقام کا نام، اس کا نام سوسہ ہے، یہ عربون کی ترقی کے عہد مین پارچہ بافی کا بڑا مرکز تھا، اور یہان کے بنے ہوے کپڑون کو سوسی کہتے تھے، پھر

اس نمونہ پر جہاں جہاں کپڑے بنے جانے لگے ان کو سوسی ہی کہنے لگے، یہ گویا ایک طرز کا نام ہوگیا، یہ کپڑے کبھی اس شان کے بنے جاتے تھے کہ ان کے ایک ایک تھان کی قیمت آٹھ آٹھ اشرفی ہوتی تھی، جغرافی ڈکشنری معجم البلدان کا مصنف یاقوت حموی رومی جس نے سنہ ۶۲۶ھ مین وفات پائی ہے، سوسہ کے ذکر مین لکھتا ہے، (لفظ سوسہ)

"صحیح یہ ہے کہ سوسہ ایک چھوٹا سا شہر افریقیہ کے اطراف مین ہے۔۔۔ یہان کے اکثر باشندے کپڑا بننے والے ہین، یہ بیش قیمت (یا باریک) سوسی کپڑے بنتے ہین، اور جو کپڑا دوسری جگہون پر ویسا بنا جاتا ہے وہ ان ہی کی نقل ہے، (یا ان ہی کے مشابہ ہے) اُن مین سے ایک تھان کی قیمت وہان دس دینار ہے۔۔۔۔۔ اور جو دھاگا وہان کتتا ہے اس کے ایک مثقال کی قیمت دو مثقال سونا ہے"

لیکن ہماری ہندوستانی سوسی بہت سستی ہے، اور غریبون کی ستر پوش ہے، اکثر غریب عورتون کے پاجامون مین کام آتی ہے، چیز وہ نہین رہی، طرز وہی ہے، وہ ریشمی ہوگی یہ سوتی ہے،

ایک مجہول یا بے نسبت ہمارے ایک خوش ذائقہ کھانے مین بھی ہے،

فیرنی - یہ ہمارے کھانے کی ایک لذیذ قسم ہے، جس کے مزے سے ہم سب واقف ہین، مگر اس کی لفظی اصلیت سے ہم سب ناواقف ہین، پتہ یہ چلتا ہے کہ فرنی اصل مین فُرنی (بالضم) ہے، چوتھی صدی کا مصنف محمد خوارزمی جو غزنویون کا معاصر تھا، اپنی کتاب مفاتیح العلوم مین[1] بیمارون کی غذاؤن کے سلسلہ مین فُرنی نام لیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس غذا کی تیاری کی صورت

[1] ص ۱۶۹، لیڈن

یہ ہے کہ وہ مختلف شکلوں کی موٹی تنوری پھولی ہوئی (یا ڈبل روٹی سمجھیے) روٹی کو دودھ میں بھگو کر شکر ڈال کر تیار کیجاتی ہے، (نان بہ شیر کہیے) اس کا واحد فرنی ہے، اس کو فرنی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ موٹی روٹی تنور میں جس کو عربی میں فُرن کہتے ہیں، تیار ہوتی ہے، گویا فرنی کو تنوری کے معنوں میں سمجھئے، ہندوستان کا اثر یہ ہے کہ موٹی پھولی ہوئی روٹی کے بجائے اس میں چاول ڈالنے لگے اور اب شکر قند ہو، سابودانہ ہو، جس چیز کو آپ دودھ شکر میں پتلا کر کے بنائیے وہ فرنی ہے، مگر اسی کے ساتھ اتنی ترمیم اور کیجئے کہ ف کو پیش کی جگہ زیر دیجئے،

یہی مصنف ہمارے بھات کا ذکر ایسے لفظوں میں کرتا ہے جن سے کھیر کی خوشبو آتی ہے، وہ کہتا ہے بھتّہ (بہطہ) سندھی لفظ ہے، چاول میں دودھ اور گھی ڈال کر بناتے ہیں، کھیر اور شیر (دودھ) ایک ہی چیز ہے، سنسکرت میں دودھ کو کشیر اور سندھی میں کھیر کہتے ہیں، جس سے ہماری یہ کھیر نکلی ہے، اور اسی لئے کھیر کہلاتی ہے، بھات سے بھاتی کا لفظ نکلا ہے جو میت کے کھانے کو کہتے ہیں، کیوں صاحبو! انگریزی ملازموں کا بھتّہ اسی بھات سے تو نہیں ہے، جس کا آغاز بنگال کے انگریزی نوکروں سے ہوا ہو اور اس کے معنی خرچ خوراک کے ہوں، ۱۷۶۵ء ۱۷۶۶ء میں لارڈ کلایو نے جو اصلاحات کیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سپاہیوں کو تنخواہ کے علاوہ "بھتّہ" دیا کرتی تھی، کلایو نے اس زمانہ میں اس کو بند کر دیا، اس واقعہ سے بھی اس لفظ کا اصل تعلق بنگال سے ثابت ہوتا ہے،

رقم — اس بھتّہ سے لوگوں کو اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی ہے، کبھی آپ دوسروں کے ذمہ اپنی رقم نکالتے ہیں، اور کبھی دوسرے آپکے ذمہ، مگر کبھی آپنے یہ سوچا کہ یہ "رقم" آپ کو

کہان سے ہاتھ آیا (۱) آج ہم رقم روپیے کی ایک مقدار کو کہتے ہین، رقم کا لفظ یقیناً عربی ہے
مگر اس معنی مین نہ عربی مین مستعمل ہے نہ فارسی مین، بلکہ یہ خالص ہندوستانی ہے،

رقم کے معنی عربی مین نشان بنانے کے اور کپڑے کی دھاری کے ہین، حدیث مین ہے، الا رقما فی ثوب، اس سے لکھنے کے معنی ہوئے جیسے کالرقم علی الماء۔ عربی مین حساب اور ریاضیات کی کتابون کے ترجمے ہوئے تو عدد کے نشان کے لئے رقم کا لفظ پسند کیا گیا، اور اس پسندیدگی کی وجہ شاید یہ ہے کہ رقم اور قلم ایک قافیہ کے لفظ ہین، اور قلم خط یا اسکرپٹ کے معنی مین استعمال ہوچکا تھا، اس لئے اسی کے وزن کا لفظ رقم اعداد کے لئے مناسب معلوم ہوا، یہ جمع کے ساتھ اقلام اور ارقام بولے جاتے تھے، بیرونی نے کتاب الہند مین خطوط اور ارقام استعمال کیا ہے (ص ۷۸) اسی سے اعداد کے علامات خصوصاً روپیے کے اعداد کے علامات کے لئے جو خاص ہندوستان کی چیز ہے ارقام ہندیہ مستعمل ہوا، اور جب حساب کی اصطلاح مین ارقام اور رقم کا لفظ آگیا تو نقد روپیے کے لئے اس کا استعمال پاجانا کتنی بڑی بات تھی،

ہندسہ۔ رقم سے "ہندسہ" کی طرف خیال گیا چونکہ ارقام "ہند" سے عربی مین لیے گئے ہین، اس لئے عوام ہندسہ کو زبر کے بجائے زیر دے کر ہندسہ بولتے ہین، اور سمجھتے ہین کہ چونکہ یہ "ہند" سے ہے اس لئے ہندسہ ہے، اور تعجب ہے کہ خوارزمی کے الجبرا والمقابلہ

۱؎ افسوس ہے کہ میری کتاب عرب و ہند کے مصحح نے اپنی غلط تصحیح سے میرے صحیح کو غلط کر دیا ہے، (دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ اکاڈیمی ص ۱۴۵)

کا انگریزی مترجم فریڈرک روزن تک اس وہم مین مبتلا ہے (ص ۱۹۶ و ص ۱۹۷ مقدمۂ انگریزی ۱۸۳۱ء) فارسی لغت برہان قاطع کے مصنف بھی اسی غلطی مین گرفتار ہین، کہتے ہین،

"ہندسہ بکسر اول وثالث وفتح سین بے نقط بمعنی اندازہ وشکل باشد وارقامے را نیز گویند کہ درزیر حروف کلمات نویسند ہمچو ابجد ہوز حطی"

یہ بیان تمام تر غلط در غلط ہے، ہندسہ بفتح اول وثالث ورابع بروزن فعللۃ فارسی لفظ "انداز" کا عربی بنایا ہوا مصدر ہے جس کے معنی اندازہ کرنا، اور اس سے مراد عمارت کا ناپنا اور نقشہ بنانا یعنی فن تعمیر ہے جس کو آج انجینیرنگ کہتے ہین، بعضون نے اس کو فارسی "اندیشہ" کا معرب بتایا ہے، مگر یہ صحیح نہین، خوارزمی (چوتھی صدی) مفاتیح العلوم مین کہتا ہے،

اما الهندسة فكلمة فارسية	لیکن ہندسہ، تو یہ فارسی لفظ کا معرّب
معربة وفي الفارسية	ہے، فارسی مین اندازہ ہے، یعنی
اندازه اي المقادير قال	مقدار، خلیل نے کہا ہے کہ مہندس
الخليل المهندس الذي	وہ ہے جو نہرون کے نکالنے کا اندازہ
يقدر مجاري القنيّ ومواضعها	و پیمایش کرتا ہے تاکہ نہرین کھودی
حيث تحتفر وهي مشتقة	جائین، اور ہندزہ سے بنا ہے اور
من الهندزة وهي فارسية	وہ فارسی ہے، تو "ز" کی جگہ "س"
فصيرت الزاي سينا لانه	نے لے لی، کیونکہ عربی مین دال کے
ليس بعد الدال زاي في	بعد "ز" نہین ہے،

(مفاتیح (ص ۲۰۲ لیڈن))

ریاضیات ہندسہ سے ریاضیات کی طرف ذہن نے کروٹ لی، عربی مین روض کے دو معنی ہین، زمین کی سرسبزی وشادابی، اس نے باغ وبہار کا مفہوم پیدا کیا، اور ریاض جنت کے پھول کھلائے، دوسرا مفہوم سواری کے جانورون اور خصوصاً گھوڑے کے سدھانے سکھانے اور پھیرنے کا ہے، عربی مین فعالۃ کا وزن پیشہ، فن اور صنعت کے کام آتا ہے، اس سے ریاضہ بنکر گھوڑا پھیرنے کا فن یا پیشہ پیدا ہوا، گھوڑے کو پھیر کر سیدھا اور شائستہ بنانے سے صوفیہ نے نفس کو رام کرکے شائستہ بنایا اور ریاضتِ روحانی اس کا نام رکھا، ادھر گوشت وپوست اور جوڑ بند کے حسن کے شائقون نے جسمانی مشق وورزش کو ریاضتِ جسمانی کہا، اہلِ علم کیون چپ رہتے، انھون نے حساب وہندسہ وغیرہ مشقی علوم کو ریاضیات کا خطاب دیا، جاہل اہلِ پیشہ نے کہا کہ ہم کو بھی اپنے کامون مین محنت کم نہین پڑتی، انھون نے بھی اپنی صنعت کاری اور دیدہ ریزی کا نام ریاض رکھا، لیکن اس معنی مین یہ خالص ہندوستانی ہے،

عرب حکیمون نے ریاضیات کو ریاضیات کا لقب کیون دیا؟ جب کہ ریاضیات کی خصوصیت نہین، ہر فن مشق کا محتاج ہے، اصلیت یہ ہے کہ ہندیون کی طرح یونانیون مین بھی بچون کی تعلیم کا آغاز ریاضیات سے ہوتا تھا، اسی لئے جب شروع شروع مین عربی مین یونانی علوم آئے تو ریاضیات کا نام تعلیمیات پڑا، کیونکہ تعلیم کا آغاز اسی سے ہوتا ہے، اب عربی فلسفہ مین اس اصطلاح کا اثر اتنا ہی رہ گیا ہے کہ مقدار مطلق کا نام اس مین اب بھی جسمِ تعلیمی ہے لیکن تعلیمیات کی جگہ بہت جلد اس سے بہتر لفظ ریاضیات نے لے لی، اس لئے کہ بچون کی مشقی تعلیم اسی سے شروع ہوتی ہے،

علامہ شریف جرجانی اپنی تعریفات میں "جسم تعلیمی" کے نیچے لکھتے ہیں،

"وسمی جسما تعلیمیا اذ یبحث عنہ فی العلوم التعلیمیۃ ای الریاضیۃ

. . . . منسوبۃ الی التعلیم والریاضۃ فانھم کانوا یبتدؤن بھا

فی تعالیمھم ورياضتھم لنفوس الصبیان"

سیاست ریاضت کے وزن پر سیاست ہے، اور آجکل کیا کہنا کہ ساری دنیا میں اسی کی بہار ہے، مگر معلوم ہے کہ اس کی اصلیت کیا ہے، لغت میں اس کے اصلی معنی جانوروں کی دیکھ بھال اور نگرانی ہے اور اسی سے امیر کی اپنی جماعت کی اور بادشاہ کی اپنی رعایا کی نگرانی اور خدمت کا مفہوم پیدا ہوا، ظالم بادشاہوں کے ظلم نے اس کے معنی بدل دیئے، اسی سے "سیاست کردن" سزا دینے کے اور اردو میں قہر و غضب کے معنوں میں استعمال ہوا ہے،

عوض اللہ اس کا محکمہ میں حشر کے لے گا،

کرے گا جو سیاست حاکم ظالم رعیت پر (صبا)

سیاست کے لفظ کو یہاں ذکر کرنا کچھ اتنا ضروری نہ تھا، مگر مجھے پروفیسر ڈی ڈبلو ارنلڈ (دام فیوضہ علیہ) کی تحقیق سے اختلاف مقصود تھا، سوا بر ایل فی معرفۃ المولد والدخیل میں وہ کہتے ہیں کہ سیاست ترکی سے ہے، چنگیز خان نے اپنی اولاد کے لئے جو چند ملکی قاعدے بنائے تھے، ان کا نام "سہ یاسہ" تھا، اسی سے عربی میں سیاست آیا ہے، مگر یہ خیال قطعاً غلط ہے یہ لفظ عربی میں اتنا پرانا ہے کہ حدیث تک میں موجود ہے، ان الناس کان یسوسھم

الانبیاء (صحیح مسلم) پہلی صدی ہجری کے آخر مین محمد بن قاسم نے جب ۱۷ برس کی عمر مین سندھ فتح کیا تو ایک شاعر نے اس کی مدح مین کہا، ساس الرجال لسبع عشرۃ حجۃ (اس نے ۱۷ برس کی عمر مین لوگون کی سیاست کی) ابن ندیم نے فہرست مین جو ۳۷۵ھ مین تاتاریون سے صدیون پہلے لکھی گئی "سیاسیات" کا لفظ سیاسی ملکی کتابون کے معنون مین استعمال کیا ہے پھر قدیم کتب لغت مین اس کی اصل موجود ہے،

ہان اپنی زبان کے لحاظ سے یہ کہنا رہ گیا کہ ہماری زبان مین سائیس اور سئیس کا لفظ اسی سیاست سے بنا ہے، اس کی اصل سائس ہے، مگر پیشے اور نوکری کے لحاظ سے سائیس کا یہ مفہوم خالص ہندوستانی ہے، نہ عربی ہے اور نہ فارسی، مگر شوخی معاف! آپنے یہ دیکھا کہ سیاسی اور سئیس دونون کی اصل ایک ہی ہوئی، دونون نگرانی اور نگہبانی کرتے ہین، سیاستی آجکل جسکو کہتے ہین ہمارے تازہ دھنی نوجوانون نے اس کے لئے سیاس کا ایک نیا لفظ گھڑا ہے، مگر بالکل بے اصل اور بے قیاس ہے، یہ لفظ واوی ہے یائی نہین، دھوکا سیاست اور سیاسی کی "ی" سے ہوا ہے، مگر "واو" کی جگہ یہ "ی" قاعدے سے ہے اور سیاس مین واو کی جگہ ی بے قاعدہ ہے، اگر یہ لفظ بن بھی سکتا تو سواس ہوتا، سیاس نہین، اب یہ سیاس جبتک چل نہ جائے غلط العام فصیح کے حدود مین نہین آسکتا،

بحث "سیاسیات" کی خطرناک الجھنون مین پڑکر خطرناک ہورہی ہے، اس لئے خاموشی ہی بہتر ہے،

(ہندوستانی جولائی ۱۹۳۸ء)

---

(۲)

بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق

اس مضمون کا پہلا نمبر سیاسیات کی الجھنون مین پڑکر خطرناک ہورہا تھا، اس لئے جیسے بھی بنا اس کو وہین ختم کر دیا گیا ہے، لیکن اتنے دنون مین غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب سیاسیات وہ پہلے کے سیاسیات نہین رہے، اب یہ سننے مین آتا ہے کہ سیاسیات کا اصلی میدان لاکھون مربع میل کا وہ میدان نہین ہے جس کو اگلے لوگ سلطنت و حکومت کہتے تھے، بلکہ یہ دو بالشت کا پیٹ ہے، اسی کی خاطر سب کچھ ہے، اگلے زمانہ کے بھولے بھالے بزرگ کہا کرتے تھے "خوردن برائے زیستن است نہ زیستن برائے خوردن" یعنی کھانا جینے کے لئے ہے، نہ جینا کھانے کے لئے" حضرت مسیحؑ کہتے تھے، کہ "آدمی روٹی ہی سے نہین جیتا" لیکن آجکل کی سیاسیات نے یہ دونون مقولے جھٹلا دیئے، اب یہ ہے کہ "جینا کھانے کے لئے ہے نہ کھانا جینے کے لئے" اور یہ کہ آدمی روٹی ہی سے جیتا ہے، چنانچہ آجکل کے بولشزم، کمیونزم، سوشلزم وغیرہ کی بنیاد زمین پر نہین، پیٹ پر ہے،

پیٹ کے لئے کھانون مین سب سے زیادہ ضروری کھانا کون سا ہے، لوگ اپنے

اپنے تجربہ اور عادت کے مطابق اس کے کئی جواب دے سکتے ہین لیکن مین سمجھتا ہون کہ جو میرا خیال ہے وہی اکثرون کا ہے یعنی یہ کہ کھانون مین سب سے زیادہ ضروری کھانا ناشتہ ہے، صبح سویرے اٹھ کر منھ مین کچھ پڑ جانے سے سارے دن کے لئے ڈھارس ہو جاتی ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ ناشتہ کے لئے اکثر زبانون مین بھوک توڑنے کی اصطلاح بن گئی ہے، مین دو زبانین جانتا ہون ایک پورب کی اور ایک پچھم کی یعنی عربی اور انگریزی، دونون مین یہی بات ہے، اس سے سمجھتا ہون کہ اور زبانون مین بھی کچھ ایسا ہی حال ہوگا، عربی مین اس کو فطور کہتے ہین، اسی سے مسلمانون کا افطار نکلا ہے، اور جس سے افطار کرین اس کو افطاری کہتے ہین، فطور کے معنی توڑنے کے ہین یعنی روزہ کی بھوک کو توڑنا، ہمارا ناشتہ بھی اسی قسم کا لفظ ہے، فارسی مین اس کے معنی اس بھوکے کے ہین جس نے صبح سے کچھ نہ کھایا ہو، (مؤید الفضلاء و برہان قاطع) اب دیکھئے کہ یہ نام تو اس آدمی کا تھا جس کے منھ مین صبح سے کچھ نہ پڑا ہو، اور اب ہم اس چیز کو کہتے ہین جو صبح سویرے ایسے آدمی کو کھلا دی جائے، یعنی شخص کے بجائے چیز کا نام ہو گیا،

اسی معنی مین ایک اور لفظ نہار آپ بولتے ہین، "نہار منھ" یہ بھی فارسی ہے، مگر دیکھئے کہ یہ فارسی ہندوستانی سے ایسا مل گیا ہے کہ گویا ہندوستانی ہی ہے، اس کی اصلیت "ناہار" ہے، "نا" نفی کے لئے ہے اور "ہار" کے معنی غذا کے ہین، "ناہار" یعنی نہین کھایا ہوا، (برہان قاطع) اب اس سے ناہاری یعنی "نہاری" تیار ہوئی جو صبح کو نہار منھ کھائی جائے

اور لکھنؤ اور دلّی میں یہ خاص چیز ہو گئی، جو بازاروں میں پکی پکائی بہت چلتی ملتی ہے

"ناہار" سے "آہار" یا "دآیا"۔ آہار آٹے کی اس لپئی کو کہتے ہین جو کاغذ اور کپڑے پر اس لیے

چڑھائی جاتی ہے کہ وہ مضبوط ہو جائے، آپ سُن چکے کہ آہار غذا کو کہتے ہین، جو بدن

کی تقویت کا باعث ہوتی ہے اس سے اس لپئی کو بھی کہنے لگے جو کاغذ اور کپڑے کی

قوت کو بڑھا دیتی ہے۔ (برہانِ قاطع)

ناشتہ کے طور پر جلدی جلدی جو کھانا پہلے تیار کر کے مہمان کے سامنے رکھدیا جائے

عربی مین اس کو سُلفہ کہتے ہین، اسی سے سَلَف (اگلے لوگ) کا لفظ نکلا ہے، عربی کا یہ

سُلفہ ہمارے ملک مین کھانے کے دسترخوان پر تو بار نہ پا سکا، مگر پینے کی یارانہ محفل مین

ایک ہزار برس کے بعد اس کو جگہ مل گئی، نورالدین جہانگیر کے زمانہ مین تمبا کو امریکہ سے

ہندوستان آیا، اور حکیم گیلانی کی پر حکمت ترکیبون سے تو اچلم، حقّہ اور نے کی شکل پیدا

ہوئی، یہ تو امیرون کی باتین تھین، اس حقّہ کی تیاری کے لئے بڑا وقت، بڑا سامان اور

اور ایک دو ملازم چاہئین اور غریبون کے پاس نہ اتنا وقت، نہ اتنا سامان نہ ملازم،

انھون نے اپنے ہاتھ سے بھر کر سُلفہ جلدی جلدی تیار کر لیا، اور پی پلا کر اپنے کام پر روانہ ہو گئے

تکلّف کے کھانون کو قابون مین نکالتے ہین، عربی مین لفظ قَعب ہے، اس کے

معنی لکڑی کے پیالہ کے ہین، جو لکڑی کو بیچ مین کھود کر بنایا جائے۔ (لسان) لیکن

ترکی مین اور اس سے فارسی مین "قاب" کے معنی مطلق ظرف یا خانہ کے ہین، اسی لئے

عینک کے خانہ کو اور قلمدان کو قاب کہتے ہین، اور پھر اسی سے کھانے کے بڑے برتن

کو بھی ہمارے ملک مین **قاب** کہنے لگے،

یہی حال **رکابی** کا بھی ہے، رکاب فارسی مین ہشت پہل پیالہ کو کہتے ہین، اس سے رکابی بنی، اوراب وہ پھیلے ہوئے چوڑے ظرف کو کہتے ہین، اور اسی سے ہندوستانی امرا کیلئے رکابدار پیدا ہوئے، جو کھانے کا انتظام کرتے تھے، یا عمدہ عمدہ کھانے تیار کرتے تھے،

روزمرہ کے کھانون مین **قلیہ قورمہ** بہت عام چیزین ہین، قلیہ کی شکل عربی ہے مگر معنی عربی نہین، قلیہ کی عربی شکل قلیۃ ہوسکتی ہے، عربی مین قلی بھوننے کو کہتے ہین اس سے قلیہ بن سکتا ہے، اور بھونے ہوئے گوشت کو کہہ سکتے ہین، ہماری زبان مین قلیہ اس شوربہ دار گوشت کو کہتے ہین جس مین کوئی ترکاری پڑی ہو، بلکہ اسی ترکاری کو قلیہ کہنے لگے ہین، قورمہ تو ترکی معلوم ہوتا ہے،

شوربا تو صاف عربی کا شربہ ہے، مگر معنی بدل گئے ہین، عربی مین شُربَۃٌ اس کو کہتے ہین جتنا ایک دفعہ پی لیا جائے، اس سے ایرانیون نے شوربا بنا لیا، اورگوشت کے پانی کو کہنے لگے، انھون نے شوربا کو پھر شورباج بنا لیا، مگر ہماری ہندوستانی مین شوربا ہی رہا، بگڑا تو شروا ہوگیا،

اسی عربی شرب (پینا) سے ایرانیون نے **شراب** اور **شربت** تیار کیا، اور ہم ہندوستانیون نے قبول کرلیا، شراب کے عربی معنی ہین جو چیز پی جائے، یہانتک کے قرآن میں دودھ کو بھی شراب کہا، ایرانیوں نے جس کو شراب کہا، اس سے متوالی شرب

مراد لی، اسی سے یورپی زبانوں مین سیرپ (SYRUP) تیار ہوا، جو شکر پڑ کر میٹھا ہو گیا،
لیکن ایرانیون کے اثر سے ہم نے پانی مین شکر گھول کر جو چیز تیار کی اس کو شربت
کا نام دیا، لفظ عربی ہے، اور معنی عجمی، عربی مین اس کے معنی فقط پینے کے ہین،
میٹھے کے بعد نمکین چیز یاد آئی کباب، صورت عربی ہے، معنی عربی نہین، کبّ
عربی مین اوندھے کرنے کو کہتے ہین، اب جس گوشت کو اوندھا کرکے آگ پر رکھئے
اس کو کباب کہئے،

کھانے کے بعد تکلفات کی دوسری قسم فرش فروش ہین،

قالین سے بڑھ کر خوشنما، خوبصورت اور مضبوط فرش شاید ہی کوئی دوسرا ہو، جو زمین
کے فرش پر نہین بیٹھتے وہ بھی کرسیون کے نیچے اس کو بچھاتے اور اس سے لطف اٹھاتے
ہین، مگر یہ کوئی نہین بتاتا کہ یہ آیا کہان سے ؟ ہندوستان مین تو اس کو مسلمان لائے
مگر مسلمانون کو یہ ملا کہان ؟ تاریخ کا یہ بھید خود اسی لفظ کے اندر چھپا ہے،
ایشیائے کوچک مین آرمینیہ کے علاقہ مین ایک شہر کا نام قالیقلا ہے، چوتھی صدی
ہجری مین یہ اسلامی حکومت کا آخری شہر تھا، اس کی طرف جب نسبت کی جاتی تھی تو
قالی کہتے تھے، عربی زبان کا ایک مشہور ادیب اور نحوی اسی نسبت سے ابوعلی قالی
کہلاتا ہے، یہ فرش قالین اسی شہر کی صنعت اور کاریگری ہے، اسی لئے اس کو "فرش قالی"
پہلے نسبت کیساتھ کہا گیا، پھر استعمال کی کثرت سے اس کا نام ہی قالی پڑ گیا، یاقوت
رومی متوفی ۶۲۶ھ اپنے جغرافیہ معجم البلدان مین "قالیقلا" کے نیچے لکھتا ہے:

وتحمل بقالیقلا ھذا البسط	یہ فرش جسکا نام قالی ہے قالیقلا میں
المسمّاۃ بالقالی، اختصروا	بنایا جاتا ہے، لفظ میں ہلکا پن کیلئے
فی النسبۃ الی بعض اسمہ	نسبت میں اختصار مد نظر رکھا ہے،
لثقلہ (ج ۷ ص۱۱ مصر)	(یعنی قالیقلائی کی جگہ صرف قالی کہا ہے)

مؤید الفضلا میں جو فارسی کا قدیم لغت ہے، اس کو "قالی" لکھا ہے، اور ایک شعر نقل کیا ہے، فارسی شعرا نے بھی قالی ہی باندھا ہے، اور جس چیز کو ہم غالیچہ کہتے ہیں عجب نہیں کہ وہ قالیچہ ہو یعنی چھوٹا قالی، اب آخر کا نون جو قالین میں ہے، وہ ین ہے جو نسبت کے معنی بخشتا ہے، جیسے رنگ سے رنگین، قالین کے معنی وہ فرش جو قالی کی طرح ہو، ایک سی چونکہ پہلے سے موجود تھی، اس لئے دوسری ی نہیں لگی، یہ تحقیق میری ایجاد ہے، معلوم نہیں صحیح ہے یا غلط،

تکلفات کی تیسری قسم مکانات ہیں، پہلے بڑے بڑے محلوں اور ایوانوں میں اور اب بڑی بڑی کوٹھیوں میں اس حصہ کو جو نوکروں کے رہنے کے لئے بنایا جاتا ہے ہماری زبان میں **شاگرد پیشہ** کہتے ہیں، بیچارہ مولوی نورالحسن صاحب نیر مرحوم (نوراللغات کے مؤلف) نے ایک دفعہ مجھ سے استفسار فرمایا کہ اس کو شاگرد پیشہ کیوں کہتے ہیں میں نے ظرافت سے کہا کہ مغل درباروں میں جب بادشاہ پیری مریدی کرنے لگے تو نوکر چاکر چیلہ کہلانے لگے جس کی شہادت تاریخوں کے علاوہ دہلی کا "کوچہ چیلان" دے رہا ہے، اسی چیلہ کی فارسی شاگرد بنائی گئی، اور شاگرد پیشہ اس گروہ خدام

کا نام پڑا، اور اس سے ان کے رہنے کے حصہ کو بھی شاگرد پیشہ کہنے لگے،

کچھ دنون کے بعد مین اپنی بڑی بچی شمیمہ بانو کو گلستان پڑھا رہا تھا اُسمین وہ حکایت آئی جس مین پردہ اور عَلَم کا مناظرہ ہے،

این حکایت شنو کہ در بغداد   رایت و پردہ را خلاف افتاد

عَلَمِ شاہی نے جھک کر پردۂ شاہی سے شکایت کی، کہ سفر مین اور لڑائیون مین تو مارا مارا مین پھرتا ہون اور قربِ سلطانی تم کو حاصل ہے، تم نازنین کنیزون کے ہاتھون مین رہتے ہو، اور

من فتادہ بدستِ شاگردان

اس سے خیال آیا کہ شاہی ملازمین اور خدم وحشم کے معنون مین یہ پرانا لفظ ہے اور اسی سے شاگرد پیشہ ہے، اور ہماری زبان مین محلون کے اس حصہ کو کہنے لگے جو خاص طور سے ان کے لئے بنائے جاتے ہین،

ایک ہندوستانی لفظ کی اصلیت پر مجھے بڑا تعجب آیا، ایک دفعہ مین عربی کا مشہور لغت تاج العروس دیکھ رہا تھا کہ لفظ راز پر نظر پڑی، اس کے معنی اس مین استاد اور ماہر کے لکھے تھے، دفعۃً میرا دھیان اپنے ہندی راج اور راجگیر (معمار) کی طرف گیا، لیکن یقین نہین آتا تھا کہ عربی کا ایسا لفظ جو عربی مین بھی کتابون اور تحریرون مین برتا نہ گیا ہو وہ ہماری ہندوستانی مین کیسے آگیا ہوگا، لیکن دل یہی کہتا تھا، کتابین الٹین پلٹین، دیکھین، مگر سراغ نہ لگا، اس سال کی گرمیون

کی تعطیل میں برادرِ عزیز پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے پٹنہ میں نصاب الصبیان کی طرح کا ایک قلمی رسالہ فارسی عربی ہندی کا ملا جس میں فارسی اور عربی الفاظ کے مقابل ہندی الفاظ جمع کئے گئے ہیں، اور شاید کسی ایرانی یا پارسی کی تصنیف ہو، مصنف کا نام اور زمانہ نہیں دیا ہے، رسالہ کا نام "لسانِ فارسیات" لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستان کے کسی نووارد ایرانی کے لئے لکھا گیا ہو، تصنیف کا مقام گجرات ہے، اس میں پیشہ وروں کا باب دیکھ رہا تھا کہ لفظ راز جگہ پر نظر پڑی جس کے معنی اس نے کردیا یعنی "کرنے والے" کے لکھے تھے، دل نے کہا مدت کا کانٹا آج نکل گیا، اور معلوم ہوا کہ صحیح لفظ راجگر ہے، پھر بھی پوری تشفی نہ ہوئی خدا بخش خان کے کتبخانہ میں چلا گیا فارسی لغت کی کئی کتابیں نکلوا کر دیکھیں مطلب کا پتہ نہ پایا، آخر فرہنگ رشیدی عبدالرشید ٹھٹوی میں یہ عبارت نکلی،

"راز معمار و سردارانِ گلکاران بہ ہندی راج گویند لیکن بدین معنی عربی است، عسجدی گوید"

بہ یکے تیر ہمہ فاش کند سترِ حصار　　　　در بہ و کردہ بود، قیر گل کار راز

اس عبارت نے پوری تشفی کر دی، واپس آکر برہانِ قاطع میں دیکھا تو یہ لکھا پایا،

"و بنّا، و گل کار را نیز گویند و بعربی طیان خوانند و بعضے گفتہ اند راز در عربی کلانتر و بزرگ بنّایاں باشد،

یعنی جس معنی میں ہم مستری کا لفظ بولتے ہیں،

اچھا تو پھر مستری کیا لفظ ہے، خیال جاتا ہے کہ یہ اصل مین مسطری ہے، مسطر اس آلہ کو کہتے ہین جس سے سطر سیدھی کی جاتی ہے، پرانے زمانہ مین ایک موٹے کاغذ پر موٹے تاگہ کو سیدھ سے ناپ کر آجکل کے رولدار کاغذ کی طرح سی دیتے تھے، اور اس پر لکھنے کے کاغذ کو دبا کر سطرون کو ابھارتے تھے، تاکہ لکھنے مین سطرین سیدھی ہون، یہ تو کاغذ کی بات چیت ہوئی، عمارتون مین دیوارون کی سیدھ قائم کرنے کے لئے جس آلہ سے کام لیا جاتا تھا، وہ بھی مسطر ہوا، اور اس مسطر سے جو ماہر فن دیکھ بھال اور ناپ کر عمارت کی دیوارون کی سیدھ درست کرتا تھا وہ مسطری کہلایا، اور پھر جب وہ ہندوستانی زبانون سے ادا ہوا تو مسطری کا مستری ہوگیا، اور اب وہ ہماری زبان کا لفظ ہے، اور ماہر کاریگر کے معنی مین بولا جاتا ہے،

بڑھیون کی بول چال مین ایک لفظ خراد اور خرادنا ہے، میز کرسی یا پلنگ وغیرہ کے پایون کو چھیل کر کہین موٹا کہین پتلا، کہین گاؤدم وغیرہ شکلین بناتے ہین، یہ خالص عربی لفظ خرط ہے، عربی مین اس کے معنی لکڑی کے اس طرح چھیلنے کے ہین کہ اس کی اوپری پرت اتر جائے، اس سے خرّاط بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے، وہ خرّاط ہمارے ہان خرّاد ہوا، اور اس سے خراد پر چڑھنا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا،

یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانون کے ذریعہ ہندوستان مین آئی، اور پھیلی،

معمارون کے ایک ضروری آلہ کا نام ہماری زبان مین ساہول ہے، لمبے
تاگہ مین ایک وزنی لوہایا اور کوئی دھات گول سی بندھی ہوتی ہے، اس کو نیچے لٹکا کر
اونچائی سے دیوار کی سیدھ دیکھتے ہین، خوارزمی نے مفاتیح العلوم مین ایک آلہ کا نام
شاقول لکھا ہے، اور اس کی تشریح یہ کی ہے ھو ثقل یشدّ بہ فی طرف حبل
یمدّ ہ سفلا یحتاج الیہ النجارون والبنّاؤون (لیڈن صفحہ ۲۵۵) یعنی وہ ایک
بوجھل چیز جو رسّی کے کنارے باندھ کر نیچے لٹکائین، اس کی ضرورت بڑھیون اور معمارون
کو ہوتی ہے، اس تشریح سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ ہندی ساہول کی عربی صورت شاقول
ہے، عربی مین ثقل کے معنی وزن کے لکھے ہین، مگر کہین ایسا نہ ہو کہ یہ شاقول ش سے
نہین بلکہ ثاقول ث سے ہو یعنی ثقل اور بوجھ کے معنی! مگر ہیئت کی کتابون مین
بھی شاقول ہی دیکھا گیا ہے، کیا وہان بھی تصحیف ہوئی ہے،

اسی کتاب مین بڑھیون کے ایک اوزار کا نام الکونیا بتایا گیا ہے، اور اسکی
تشریح یہ کی ہے یقدّر بہا الزاویۃ القائمۃ (ص۲۵۵) یعنی "اس سے زاویہ
قائمہ نکالتے ہین"۔ کوئی کچھ کہے، ہو نہ ہو یہ لفظ ہمارا کونیا ہے، جسکو آج بھی ہمارے کاریگر
بولتے اور برتتے ہین، اور اس کا تلفظ کُنِّیا ہے، یعنی وہ آلہ جس سے کونہ (زاویہ) ناپین یہ
ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی دو لکڑیان ہوتی ہین جنکو بخط مستقیم جوڑ کر کونہ زاویہ قائمہ نکالتے ہین
اور اسکی صورت یہ ہوتی ہے 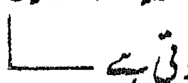

یہ کتاب چوتھی صدی ہجری مین لکھی گئی ہے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لفظ اتنے پرانے

زمانہ مین ہندوستان سے غزنویون کے زمانہ مین وسط ایشیا تک کیسے چلاگیا،

اس کے بالمقابل ایک دوسرا لفظ ہے جو وسطِ ایشیا سے ہندوستان آیا ہے، جہاز کا لفظ ہے، جہاز دیکھنے مین توعربی ہے مگرجس معنی مین یہ ہماری زبان مین بولا جاتا ہے، وہ قطعاً ہندوستانی یا ہندوستانی فارسی ہے، اصل مین اس کے لفظی معنی تو"سامان کرنے" کے ہین، اس سے تجہیز بنا جس کے جہازون مین یہ معنی پیدا ہوئے کہ کشتی مین سامان رکھکر کہین بھیجنا، یہ اصطلاح تیسری صدی ہجری مین پھیل چکی تھی، بزرگ بن شہریار کے سفرنامہ مین ہے،

انّہ جھّز مرکبًا لہ الی الزابج ۔۔۔ اس نے اپنا ایک جہاز سامان لاد کر جاوہ بھیجا، (صہ ۱)

یہ تو دریائی اصطلاح ہوئی، لیکن اس کے سوبرس بعد یہ لفظ وسط ایشیا مین خشکی کے سامانِ تجارت کے معنون مین سننے مین آتا ہے، حدود العالم مین جو ۳۷۱ھ کی تصنیف ہے، یہ لفظ ان معنون مین بار بار آیا ہے، شروع شروع مین تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ جہاز خشکی مین کیسے چلا، بعد کو سمجھ مین آیا کہ ابھی یہ لفظ سامان کرنے کے معنی سے قطع مسافت کرکے فقط "سامان" کی منزل مین پہنچا ہے،

وجہازہاے ہندوستان بدین شہر کہا افتد . . . . . . وآنجا بردہ ہندو جہاز ہندوستان افتد، صہ ۴۴، (ایران)

اس سے یہ بات سمجھ مین آگئی کہ یہی جہاز بعد کو خشکی سے تری مین آگیا، اور سامان

تجارت کے بجاے سامانِ تجارت لیجانے والے جہازون کو خود جہاز کہنے لگے،
ہندوستان مین اکبر کے زمانہ مین فرشتہ نے اس لفظ کو اس معنی مین استعمال کیا ہی،

وبگفتۂ فرنگیان جہازات متردد ساختند، (ج ۲ ص۳۴۷، نولکشور)

اب ہماری زبان مین یہ لفظ مطلق جہاز کے معنی مین بولا جانے لگا، اور سامان تجارت اس سے رخصت ہوگیا،

اسی سے ہماری زبان مین خوشی اور غم کے دو لفظ نکلے ہین، ایک جہیز اور دوسرا تجہیز، جہیز اس سامان کو کہتے ہین جو شادی مین باپ کی طرف سے لڑکی کو ملتا ہے، اس معنی مین یہ لفظ بھی خالص ہندوستانی ہے، اس کی اصل جہاز ہے، سامان دینا، یا سامان کرنا، فارسی کے قاعدہ سے الف مین امالہ ہو کر جہاز سے جہیز ہو گیا ہے، اور اس جہیز پر اب کسی عرب یا ایرانی کا قبضہ نہین رہا،

جہاز مردہ کے کفن دفن کے سامان کو بھی عربی مین کہتے ہین، جس سے مصدر تجہیز بنا، یعنی سامان کرنا، اس سے ہماری زبان مین تجہیز و تکفین کا لفظ پیدا ہو گیا،

ذرا ذرا سی مناسبت سے دیکھئے تو کیسے کیسے لفظ بنتے اور معنی بدلتے ہین ذراسی ذرا پر غور کیجئے، کیا یہ عربی کا ذرہ نہین جسکو آپ "ذرۂ بے مقدار" کی صورت مین اچھی طرح پہچانتے ہین، مگر استعمال کی کثرت سے مخفف ہو کر ذرا کے بہت ہی تھوڑے کے معنی ہو گئے، اور ایسے ہو گئے کہ اب اس کو ذرہ سے ذرا بھی تعلق نہین رہا،

ہماری زبان مین ایک لفظ مضمون کی سُرخی یعنی عنوان ہے، دیکھئے

تو یہ سیاہی سے سرخی کیسے بنگیا، بات یہ ہے کہ پہلے زمانہ مین قلمی کتابون مین باب اورعنوان کو امتیاز کے لئے سرخی سے لکھا کرتے تھے، اب ہمارے زمانہ مین جب چھاپہ ایجاد ہوا تو خود باب کے یا مضمون کے عنوان کو سرخی کہنے لگے، چاہے آپ اس کو سیاہی ہی سے لکھین، اس لفظ کی یہ توجیہ تو پہلے ہی سے ذہن مین آ رہی تھی، مگر اتفاق سے ایک پرانی قلمی کتاب سے سند ہاتھ آگئی، تو اپنے ذہنی الہام پر تصدیق کی مہر لگ گئی، شیخ نصیر محمودؒ چراغ دہلی کے مرید سید محمد حسنی" اپنے مکتوبات مین ایک جگہ لکھتے ہین،

کیفیت دیباچہ کہ بقلم مبارک آن محبوب نبشتہ بودند برائے سرخی نبشتن آن سپیدی بنشتہ عین فرستادہ شدہ است در دیباچہ بنویسند.....

ذات لفظ صلوٰۃ سرخی بنویسند" (کتبخانہ حکیم عبدالعزیز مشرقی جالندھر شہر)

مسل کاغذات کی مسل (م س ل) ایک عام دفتری اصطلاح ہے، اس کی اصل عربی لفظ "مثال" ہے، سرکاری شاہی کاغذات کی اصل تو دفتر مین رہتی تھی، اور اس کی بعینہ نقل (مثال) لوگون کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس سے مثال کے دوسرے معنی فارسی مین شاہی فرمان کے پیدا ہوئے، اور اس کی جمع امثلہ اور مثل بنی، مثال اور مثل نے مسل کی ہندی شکل اختیار کی، مثال اور امثلہ کا استعمال غالباً سلجوقیون کے زمانہ سے رواج پایا، تاریخون مین کثرت سے یہ لفظ آتا ہے،

نستعلیق ایک خاص فارسی خط کا نام ہے، یہ اصل مین نسخ اور تعلیق کی ہندی ترکیب ہے، ہندی ترکیب کا خاصہ ہی کہ جب دو لفظ ملا کر ایک بنائے جاتے ہین تو بیچ کا ایک دو حرف لفظ کو ہلکا کرنے کے لئے گرا دیتے ہین، اس طرح نسخ و تعلیق مل کر نستعلیق بنا، عربی مین نسخ لکھنے اور نقل کرنے کو کہتے ہین، اس مناسبت سے اہل عجم نے عربی خط کا نام نسخ رکھا، تعلیق اور تعلیقہ کے نام سے اس نے فارسی شکل اختیار کی، اور ان دونون سے مل کر نستعلیق خط بابر کے زمانہ مین بنا، یہ وہی خط ہے جس مین آجکل اُردو لکھی جاتی ہے، یہ خط دوسرے شکستہ وغیرہ خطون کے مقابلہ مین بہت بنا کر نہایت تکلف سے ٹھہر ٹھہر کر لکھا جاتا ہے، اس سے نستعلیق آدمی اور نستعلیق بول چال کی شکلین پیدا ہوئین، چراغ ہدایت مین ہے،

"نستعلیق گوئی حرفہا راساختہ گفتن وعبارت رابتکلف اداساختن اشرف گوید

"نستعلیق گویا قوت لب ریحان خط داغم"

اس سے ہماری زبان مین یہ وسعت پیدا ہوئی کہ نستعلیق لباس، نستعلیق چال، اور نستعلیق بول چال کہنے لگے بعض لفظون کی ظاہری شکل وصورت کیسا دھوکا دیتی ہے، کتنے ہندوستانی ایسے گورے چٹے ہوتے ہین کہ ولایتی معلوم ہوتے ہین، اور بعض سونلے رنگ کے ایرانی بھی دیکھے ہین، ہماری زبان کا ایک بہت ہی خوبصورت لفظ چلبلا، ہے جو غزل گو شاعرون کے ہان خوب خوب کام آتا ہے، اس کی شکل تو ہندی ہے مگر ہے ایرانی، برہان قاطع مین ہے،

"چلبلہ بضم اوّل و باے ابجد بروزن سنبلہ شتاب و اضطراب را گویند"

ہم سمجھتے تھے کہ اس کا تعلق ہمارے ہندی لفظ چھل بل سے ہے، اب غور کرنا پڑیگا لفظ بھی کیا کیا صورت بدلتے ہین، موٹے کپڑے کو ہم گفش کہتے ہین، مگر یہ آیا کہان سے، فارسی مین اس کی صورت گبز ہے، (بفتح اوّل وسکون ثانی وزاے نقطہ دار ہر چیز گندہ و قوی و سطبر را گویند (برہانِ قاطع) اس کی دوسری شکل غفص کی ہے، صورت تو عربی ہے، مگر عربی نہین،

اَحدی کے معنی ہماری زبان مین سست اور کاہل کے ہین، مگر ان سست کاہلون کی پیداوار تاریخی ہے، اَحَدی، اَحَدی ہے، اَحَد کے معنی عربی مین ایک ہی ہین، وہ سپاہی جو فوج سے الگ اکیلا ڈیوڑھی کی خدمت پر مامور رہتا تھا، اکبر نے اس کو احدی (اکیلا) کا لقب بخشا، یہ احدی کھاتے تھے اور ڈیوڑھی پر پڑے رہتے تھے، کوئی کام کاج ان سے متعلق نہ تھا، اس لیے زبانِ خلق نے اس کو سست و کاہل کے معنون مین لیکر پکارا، زبانِ خلق کو کون روک سکتا ہے،

ہماری زبان مین ایک لفظ قلعی ہے آیئے اسکی بھی قلعی کھولین، ہم لکھتے گو قلعی ہین مگر بولتے قَلَئی ہین، ہماری زبان مین اس کے معنی سپیدی اور صفائی کے ہین، برتنون پر قلعی کیجاتی ہے اور مکانون پر قلعی پھیری جاتی ہے،

یہ لفظ گو پرانی عربی کا نہین، مگر پھر بھی عربی لغتون مین ملتا ہے، قَلعِیّ عربی مین (لسان) اور اس سے فارسی مین (مؤید الفضلا) رانگے کو کہتے ہین، مگر رانگے کو قلعی کیون

کہتے ہین، لسان العرب کا بیان ہے کہ قلع ایک کان کا نام ہے جس سے رانگے کی بہترین قسم نکلتی تھی، اس لئے اس کی طرف نسبت کرکے اچھے رانگے کو قلعی کہتے ہین، اور چونکہ اسی رانگے سے تانبے کے برتنون پر سپیدی پھیری جاتی ہے، اس لئے اسکو قلعی کرنا کہنے لگے، پھر چونے سے بھی اگر مکانون پر سپیدی پھیری گئی تو اس کو بھی قلعی پھیرنا کہدیا، ہماری زبان ان استعمالون سے یہ معنی پیدا ہوے کہ کسی داغ دھبّے یا کسی کے عیب کو اگر چھپایا جائے تو وہ اس پر قلعی پھیرنا ہوا، اور اگر اس داغ دھبّے اور عیب کو ظاہر کرکے سب کو دیکھا جائے تو وہ قلعی کھولنا ہوا،

تماشا بھی عجیب تماشے کا لفظ ہے، لفظ تو عربی ہے لیکن معنی عجمی ہین، یہ مَشیٰ سے بنا ہے جس کے معنی چلنے کے ہین، اس کو باب تفاعل ہین لے گئے تو تماشی ہوا، اور معنی باہم مل کر چلنا ہوے، عجمیون نے تماشی کو اپنے قاعدہ سے تماشا بنا لیا جیسے تمنّی کو تمنّا بنا لیا چونکہ سیر و تفریح کے لئے چند احباب ساتھ مل کر چلتے ہین، اس لئے خود سیر و تفریح کو تماشا کہنے لگے، اس کے بعد آگے بڑھے تو سیر و تفریح کے سامان کا بھی تماشا نام رکھا،

بجرمِ عشق تو مارا کشند غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

(معارف۔ مئی سنہ ۱۹۳۹ء)

تہنید

"تہنید" کے اگر ہم ٹھیٹ معنی کریں تو "ہندیانا" کہہ سکتے ہیں، یہ اصطلاح اصل میں عربوں سے چلی، وہ جب کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر خراد کر اس کو عربی بنا ڈالتے تھے، تو وہ اپنے اس عمل کو "تعریب" کہتے تھے، یہی قاعدہ فارسیوں نے اپنی زبان میں جاری کیا تو اس کو تفریس کہا، یعنی فارسی بنا لینا، اب جب اہلِ ہند یہی کریں، یعنی وہ کسی دوسری زبان کے لفظ کو اپنی زبان کے اصول پر تراش خراش کر کے اپنی زبان میں ملالیں تو اس کو تہنید کہیں گے،

یہ اصول زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے لئے بہت ہی مفید ہے، یہ اصول قریب قریب دنیا کی سبھی زبانوں میں چلتا ہے، اور اس کے مانے بغیر ممکن ہی نہیں کہ زبان ترقی پا سکے،

بات یہ ہے کہ زبان کوئی جامد چیز نہیں، وہ ہمیشہ بڑھتی پھیلتی اور ادلتی بدلتی رہتی ہے، جو زبان بڑھنا چاہے گی اس کو دنیا کی دوسری زبانوں سے سروکار رکھنا پڑیگا اور قوموں کے میل جول کے ساتھ ان کی بولیوں اور لفظوں کی آمد و رفت بھی لگی

رہیگی، اس کا اثر یہ ہوگا کہ اس مین دوسری زبانون کے لفظ ملتے رہین گے اور بدلتے رہین گے،

ہر زبان کے لفظون مین حرفون کی خاص ترتیب، اور اس ترتیب سے خاص شکل پیدا ہوتی ہے، جس طرح انسان انسان سب برابر ہین، پھر بھی فرنگی، حبشی، ہندی، چینی، ترکی سب کی شکلیں ایک نہین ہوتین، ہر ایک کا رنگ روپ اور ناک نقشہ ایک نہین ہوتا، یہی مختلف بولیون اور ان کے لفظون کا حال ہے، اسی لیے ایک قوم کا آدمی جب کسی دوسری قوم کی بولی کا کوئی لفظ لیتا ہے تو اس کی زبان کی فطرت مجبور کرتی ہے کہ ارادہ اور احساس کے بغیر اس کی شکل بدل دے، ہندستان کے باہر کا آدمی خواہ کچھ ہی کرے مگر وہ ہمارے ہندی حرفون کو کبھی نہ بول سکیگا وہ اس کو کچھ نہ کچھ بدل دے گا، اور نہ وہ ہمارے لہجہ سے ہمارے لفظون کو نکالیگا وہ اس مین بھی کچھ ہیر پھیر کرے گا،

یہی حال ہندیون کا بھی ہے، عربی کے خاص حرف وہ ادا نہین کر سکتے ع، ء، اور الف مین اور ث، ص، اور س مین اور ت اور ط مین وہ فرق نہین کر سکتے اس لئے دوسری زبان کا جو لفظ ہمارے یہان آئے گا وہ جب تک اپنی بیگانگی چھوڑ کر بالکل گھریلو نہ بنجائے گا، وہ ہمارے دیس مین رہ نہین سکتا، یہی وجہ ہے کہ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے جو ہزارون لفظ ہماری زبان مین آگئے ہین وہ ہماری زبان کے قاعدون پر چڑھ کر ہماری زبان کی شکل وصورت

اختیار کرنے پر مجبور ہین،

معمار کے معنون مین راج کی اصل عربی اور فارسی مین راز ہی مگر ہمارا ہندوستانی لفظ راج ہی ہوگا، عربی کا صحیح لفظ تمنّی ہے، مگر فارس والون نے اس کو یا تو تمنّا کر دیا اور ہم نے بھی اسی کو قبول کیا، عربی تماشی کو ایرانیون نے تماشا کیا، اور ہم کو بھی یہی تماشا پسند آیا، لالٹین کی اصل لنٹرن ہے، مگر ہم کو لالٹین ہی کی روشنی پسند ہے، بٹن انگریزی ہو تو ہو، مگر ہمارا لفظ تو بوتام ہے جو بٹن کی بگڑی ہوئی شکل ہے،

لفظ تبادلہ عربی کے لحاظ سے غلط ہی کیون نہ ہو، لیکن ہماری زبان مین یہ صحیح ہی اس کو چھوڑ کر مبادلہ یا تبادُل بلوانے کی کوشش زبردستی ہے،

محاذ کی عربی اصل محاذی، اور ہندوستانی ورے (دلّی مین بولا جاتا ہے) کی اصل عربی ورا ہے، مگر اب محاذ اور ورے کو چھوڑ کر ان معنون مین محاذی اور ورا نہین بولا جائیگا، تبدیل کے مقابلہ مین تبدیلی غلط ہی ہو، مگر وہ ہمارے ہان صحیح ہے، خود صحیح کو سہی ہم نے کر دیا ہے، اور اس سے ایک نئے معنی پیدا کر لئے ہین، احوال عربی مین جمع ہی کیون نہ ہو مگر وہ ہماری زبان مین واحد کے طور پر بولا جاتا ہے، معنی کا لفظ عربی مین واحد ہے، مگر اردو والے اس کو جمع بولتے ہین، "ماتحت" عربی کے لحاظ سے بیجا ہے مگر ہماری زبان کا وہ نہایت صحیح و فصیح اور بامعنی لفظ ہے، آشا ہندی کا چاہے کھرا لفظ ہو مگر ہماری زبان مین وہ آس بنکر آیا ہے، اور وہی صحیح ہے، ہندی مین دچار لفظ ہو ہو، مگر وہ ہمارے ہان بچار ہے،

اسی طرح عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور یورپ کی زبانون کے ہزارون لفظ اپنی اپنی صورت بدل کر ہماری زبان مین ایسے رل مل گئے ہین کہ ان کو پہچان پہچان کر اگر ہم ان کی اصلی شکلون مین لکھنے اور بولنے لگین تو خود ہماری زبان کی حکومت ہمارے ملک سے اٹھ جائے گی، اور ایسے بدیسیون کی بھیڑ ہر جگہ دکھائی دیگی جو ہمارے دیس کے قانون کو نہین مانتی، اس لئے ان بدیسیون کو اس دیس مین رہنے سہنے کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے جب وہ ہمارے دیسی قانون کو قبول کر کے دیسی بنجائین،

رہی لفظی شکل وصورت کے تغیر سے بڑھ کر معنوی تغیرات ہین، ہزارون عربی اور فا کے ایسے لفظ ہین جن کے معنی خالص ہندوستانی ہین، جنکو عربی اور فارسی والے جانتے بھی نہین، اور وہ اسی قاعدہ کے مطابق بنے ہین،

اسی سے کسی زبان کی خودمختارانہ حکومت کا پتہ چلتا ہے، لفظ خواہ کسی قوم اور ملک کے ہون، مگر جب وہ دوسری قوم اور ملک کی زبان مین چلے جاتے ہین تو انکی مثال ان لوگون کی سی ہے جو پیدا کہین ہوئے ہون، لیکن جب کسی دوسرے ملک کی رعایا بنجاتے ہین تو اسی دوسرے ملک کے قاعدے اور قانون ان پر چلا کرتے ہین، اس وقت یہ نہین دیکھا جاتا کہ ان کی پیدایش کہان کی ہے، اور یہ پہلے کس کی رعایا تھے،

کسی لفظ کو ہندوستانی بنا لینے کے بعد ہم کو حق ہے کہ ہم اس کے وہ معنی سمجھین جو اصلی معنی سے مجاز کے طور پر یا اس کے قریب ہونے یا کسی اور لگاؤ کی وجہ سے ہماری

زبان مین پیدا ہو گئے ہین،

اسی فقرہ مین دیکھئے کہ "وجہ" عربی لفظ ہے، عربی مین اس کے معنی "منھ" کے ہین، اس سے رُخ کے معنی پیدا ہوئے، اور اس سے سبب کے معنی پیدا ہو گئے، خود سبب کیا ہے؟ عربی مین اس کے معنی رسّی اور ڈوری کے ہین، جس سے کسی کو باندھا جائے، اس سے عربی مین ذریعہ کے معنی پیدا ہو گئے، اس سے اہل فلسفہ اور فارسی اور اردو والون نے اس کو علت اور وجہ کے معنی مین بول دیا، اور لیجئے اس کی جمع اسباب بنائی اور اس کے دو معنی قرار دیئے جب اس کو مفرد کے طور پر بولین تو سامان سمجھین اور جب جمع بولین تو وہ سبب کی جمع ہے،

اسباب کے معنی سامان کے نہ عربی مین ہین نہ فارسی مین، خالص ہندوستانی مین ہین،
مین نے معارف مین ایک دفعہ اثر کی جمع اثرات لکھدی تھی، میرے مخدوم دوست سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے جو بڑے نستعلیق انشا پرداز اور نفاست پسند اہل قلم ہین خط لکھ کر مجھے فوراً ٹوکا کہ "عربی مین اثر کی جمع آثار ہے، اثرات نہین" مین نے مذاقاً جواب دیا کہ مین نے وہ لفظ اردو مین لکھا ہے، عربی مین نہین، لیکن یہ مذاق مین ٹالنے کی بات نہین، خدا جانے اور کتنے فضلاء اس قسم کی بالارادہ غلطیون کو لکھنے والون کی جہالت سمجھتے ہون گے، مگر بات یہ نہین، عربی مین "اثر" کے معنی زمین پر قدم کے نشان کے ہین، قرآن مین ان ہی معنون مین

یہ لفظ آیا ہے، اہلِ فلسفہ کو اپنے لئے لفظوں کی ضرورت پڑی انھون نے اسکو لیا اور اس سے تاثیر اور تاثر اور اثر بمعنی نتیجہ کئی لفظ بنا لئے، اس سے فارسی اور اردو مین اثر نتیجہ کے معنی مین آگیا، یعنی جس طرح قدم اٹھ جانے کے بعد قدم کا نشان رہ جاتا ہے، اسی طرح کسی شے کے ہٹ جانے یا مٹ جانے کے بعد اس کا جو نشان رہ جائے اس کو اس کا اثر کہنے لگے، اب اس کے بعد اثر خاصیت کے معنی دینے لگا، جیسے فلان دوا کا اثر یہ ہے، میری بات کا اثر یہ ہے، ملک مین ان کا اثر ہے،

اب جمع مین آیئے، اس کی عربی جمع آثار ہے، لیکن اردو مین اس کے معنی قرینہ کے ہون گے جیسے آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے، یا پھر دیوار کا آثار ہے، یا پرانی یادگار کے معنی مین ہے، جیسے آثار قدیمہ اسی لئے اثر نتیجہ یا تاثیر کے معنی مین جب بولین گے تو اس کی جمع اثرات بنائی جائے گی، خواہ وہ عربی کے لحاظ سے کتنی ہی بے قاعدہ ہو،

قرینہ ہی کا لفظ دیکھئے، عربی مین قرن کے معنی ملانے کے ہین، قرین ان دو جانورون مین سے ہر ایک کو کہتے ہین جن کے پاؤن ایک رسی مین ملا کر باندھ دیئے جائین، اس سے قرین کے معنی عربی مین ہمسر کے اور قرینہ کے معنی بیوی کے ہو گئے لیکن اردو مین قرین کے معنی قریب، نزدیک اور پاس کے ہین، اور قرینہ کسی شے کے ہونے کے قیاسی لوازم، جیسے قرینہ یہ کہتا ہے، قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے،

اب لوازم کو دیکھئے، عربی لزم اور لزوم سے نکلا ہے، لازمہ کی جمع ہے،

کسی شے سے چپک جانے کو لزوم کہتے ہین، اس سے اہلِ منطق نے ایسے مفہوم و معنی مین جسکا کسی دوسری شے سے چپکا رہنا ضروری ہے، یا وہ اس سے الگ نہین ہو سکتا اسکو استعمال کیا، اسی سے ہماری اردو مین لازم کے معنی ضروری کے ہو گئے، اس کی جمع کسی طرح لوازم بنی، اب اردو مین اس کی جمع لوازمات بنائی گئی، اور اس کے معنی کسی شے کے ضروری سامان و اسباب کے ہو گئے، لوازمات کے اس معنی کا اردو واحد سنئیے لوازمہ، جس کو عربی سے ادنی تعلق نہین،

جنس کا لفظ کون نہین جانتا، مگر یہ جنس عرب کی نہین، یونان کی ہے، عربی مین منطق والے لائے، اور اس کی تعریب کرکے اس سے تجنیس، مجانست، تجانس وغیرہ مصدر بنائے، جنس منطق کی اصطلاح مین اس کلّی (عام چیز) کو کہتے ہین جس کے تحت مین کئی مختلف حقیقتون کی اشیاء داخل ہون، جیسے حیوان کہ انسان اور گھوڑے گدھے، گائے بھینس، بکری وغیرہ ہر جاندار کو کہتے ہین، اب اس سے ادبی جنس پیدا ہوئی، یعنی کسی حقیقت مشترکہ کے مختلف افراد، اس سے ابنائے جنس بنایا (ایک جنس کے بیٹے) یعنی ایک حقیقت کے سارے شریک جیسے سارے انسان آپس مین ابنائے جنس ہین، اب اس سے بھی خاص ہو کر ہم جنس بنا،

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

کبوتر با کبوتر باز با باز

اب اس سے آگے بڑھ کر ہندوستان مین جنس کے معنی قسم ہو گئے، اور خاص طور سے غلہ کی قسم کے ہو گئے، کہتے ہین "نقد و جنس" نقد کے معنی روپیے پیسے کے اور جنس غلہ یا سامان، اس کی جمع اجناس جو بنی، تو یہ غلّون کے اقسام پر مشتمل ہو گئی، اور "نرخ اجناس" کی صورت مین اس کی جنس ہی بدل گئی،

لفظ نقد کو تو دیکھئے کہ یہ کیا ہے، نقد کے عربی معنی پرکھنے کے ہین، اس سے ریویو کے معنون مین آجکل نقد یا تنقید بولتے ہین، چونکہ پرکھے سکّے جاتے ہین، اس سے فارسی مین نقد کے معنی سکّے کے ہو گئے، اور دام کی صورت مین سکّے دیئے جاتے ہین، اسلئے اردو مین نقد دام کے معنی اس دام کے ہوئے جو فوراً دیئے جائین، اور نقد اور ادھار دو مقابل کے اردو لفظ ہو گئے،

خیر، عربی کا لفظ ہے، اس کے معنی بھلے اور نیک کے ہین، ہماری زبان مین یہ لفظ ایک تکیۂ کلام کی صورت مین ہے، اور اکثر ذرا وقفہ کے طور پر یہ بول دیا جاتا ہے پھر ہم نے اس مین ی اور ت لگا کر اس کو خیریت بنا دیا، اور اس کے معنی اچھی خبر کے ہو گئے، ات لگا کر اسکی بے قاعدہ جمع خیرات بنا دی تو صدقہ کے معنی ہو گئے،

عربی مین مؤنث لفظون کی جمع سالم بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اُن کے آخر مین ات لگا دیئے جائین جیسے مُسلمہ سے مسلمات، مگر پہلے فارسی والون نے اور ان کی دیکھا دیکھی ہندوستانیون نے اس مین ایسی آزادی برتی کہ فارسی اور ہندی لفظون تک کی جمع اس طرح بنانے لگے، جیسے کاغذات، دستاویزات، دیہات، اس سے زیادہ لطف

کی بات یہ ہے کہ جس لفظ کے آخر مین ہ دیکھا اس مین جات لگا دیا، جیسے صوبہ جات، میوہ جات، علاقہ جات،

علاقہ ہندوستانی مین زمینداری کے گاؤن کو کہتے ہین، عربی مین اس کے معنی لگاؤ کے ہین، اسی لگاؤ سے ہر چیز جس سے آپ کو لگاؤ ہے آپ کا علاقہ ہے، غدر کے معنی عربی مین بے وفائی کرنے کے ہین، اس سے اس بے وفائی کو کہنے لگے جو فوج اپنے عہد کو توڑ کر اپنے افسرون سے کرے اس فوجی بے وفائی کا نتیجہ بدامنی ہے، یہ دونون معنی ہندوستان مین پیدا ہوئے، اور بڑے شہرون مین بدامنی کے واقعے زیادہ پیش آتے ہین، تو بڑے شہر کو ہم نے غدار شہر کہدیا،

ایک جائداد کی فروخت کا ذکر ہو رہا تھا، اس پر ہمارے گاؤن کے ان پڑھ ہندو پٹواری نے کہا "دیکھ لیا جائے کہین جدادمبوس تو نہین ہے" جداد تو مین سمجھا کہ جائداد ہے، مگر مبوس نہین سمجھا، مگر سوچتا رہا، کچھ دنون کے بعد خیال آیا کہ یہ عربی محبوس ہے، جس کے معنی "قیدی" کے ہین، اسی سے حبس اور محبوس عربی مین وقف کے معنی مین ہیں، اب معلوم ہوا کہ وہ پرانے شاہی کاغذات کی اصطلاح بولا مقصود یہ تھا کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ یہ جائداد کہین قید تو نہین، یعنی کسی کے رہن، یا بیع مین تو نہین،

تقریب کے معنی نزدیک کرنا، پھر جو کسی مقصد سے قریب کرنے کا ذریعہ ہو، اس کو تقریب کہا، اب ہندوستانی ملاقات کے ذریعہ کو تقریب کہنے لگے،

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے،

ملنے ملانے کا سب سے عمدہ موقع کسی شادی اور خوشی کے مراسم کا موقع ہی، اس لئے ہم شادی و خوشی کے موقعون کو تقریب کہنے لگے،

جناب کے معنی چوکھٹ کے ہین، بادشاہون سے براہ راست مخاطب نہین ہوا جاتا تھا، اس لئے ان کے آستانہ اور چوکھٹ کی طرف نسبت کرکے بات کہی جاتی تھی، اس سے جناب تعظیمی خطاب کا لفظ ہوگیا،

حضرت بھی بڑے حضرت ہین، حضرت کے اصلی معنی حاضر ہونے کے ہین، اس سے حضرۃ کے معنی عربی مین بادشاہ کے حضور اور پیشگاہ کے ہوئے، ہمارے ہندوستان مین اب یہ بھی تعظیمی لفظ ہوگیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ مغلون کے زمانہ مین بنا، اس سے پہلے بندگی، اور خدمت کے لفظ تھے، ان دونون کے ایک ہی معنی ہین،

حضرت ہی کی دوسری صورت حضور ہے، اس کے بھی وہی معنی اور وہی روداد ہے، حضرت کے ساتھ صاحب کا بھی خیال آیا، صاحب کے عربی معنی ساتھی کے ہین، اس سے عربی مین والا کے معنی پیدا ہوئے، جیسے صاحب علم (علم والا) اسکے بعد وزیرون کو جو بادشاہون کے ساتھی اور مصاحب ہوتے تھے، صاحب کہنے لگے، جیسے صاحب ابن عباد وغیرہ، اب صاحب کے معنی آقا کے ہوئے، اور یہ نام کے آخر مین تعظیم کے لئے لگنے لگا، انگریز آئے تو وہ سارے ہندوستانیون کے آقا ٹھہرے، اس لئے وہ صاحب ہوئے،

ایک بادشاہ کی جگہ پر جب دوسرا بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو اس کے لئے عربی

کا لفظ جلوس غیر عربون نے استعمال کیا جس کے معنی بیٹھنے کے ہین، اور سال جلوس تخت نشینی کے سال کی اصطلاح بنی، اور چونکہ جب نیا بادشاہ پہلی دفعہ تخت پر بیٹھتا تھا، تو تزک و احتشام اور لاؤ لشکر کے ساتھ نکلتا تھا تو ہم ہندوستانی تزک و احتشام کے ساتھ کسی مجمع کے نکلنے کو جلوس کہنے لگے، اس کو عربی سے کوئی تعلق نہین اور جب بادشاہ اور حاکم دربار مین بیٹھے تو ہم نے جلوس سے اجلاس بنا لیا، جس کے معنی بٹھانے کے ہین، اور اب نئے زمانہ مین انجمنون اور جلسون کے بھی اجلاس ہونے لگے

جس جگہ بیٹھین عربی مین اس کو مجلس کہتے ہین بعض علما، اور صوفیہ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ خاص دنون مین بیٹھ کر لوگون کو وعظ و نصیحت کرتے یا درس دیتے، اس سے اس قسم کی نشست کو اور پھر اس نشست کی تقریرون کو مجلس کہنے لگے، ہندوستان مین ایسی نشستون کو کہتے ہین جن مین لوگ مذہبی اور علمی تقریرین کرین یا مرثیے پڑھین، اور اس سے ہم نے علم مجلس بنایا، جس مین تہذیب و شائستگی کے ساتھ مجلسون مین اٹھنے بیٹھنے اور سلیقہ اور دلچسپی کی باتین کرنے کے ڈھنگ سکھائے گئے

جلوس سے قعود یاد آیا، قعود کے معنی بھی عربی مین بیٹھنے کے ہین، اس سے عربی مین لفظ قاعدۃ بنا اور اس کے معنی بنیاد کے ہوئے، یعنی دیوار کا وہ حصہ جو زمین کے اندر بیٹھے، چونکہ بنیاد ہی کے اوپر ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے اس لئے اہل علم نے اپنی اصطلاح مین ان اصول کو جن پر بہت سے مسئلون کی بنیاد ہو قاعدہ کہا، اور اب ہماری زبان مین قاعدہ قانون کے معنی دینے لگا، اس کی جمع قواعد بنائی

اور اس کو جمع مذکر کے طور پر استعمال کیا، تو اس کے معنی جزئی قانون کے ہوئے، لیکن ہم نے فوج کے نظم وضبط اور ترتیب کے ساتھ چلنے، آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے کے قاعدے بنائے تو ان کا نام بھی قواعد رکھا، اور وہ ان معنون مین واحد مؤنث ہے اور خالص ہندوستانی ہے،

قاعدہ کے ساتھ اصول پر نظر رہے، یہ عربی مین اصل کی جمع ہے، اصل کے معنی عربی مین جڑ کے ہین، اس لئے جس ایک بات کی جڑ پر مسئلون کے بہت سے تنے کھڑے ہون اس بات کو اصل کہنے لگے، اور اس کی جمع اصول بنائی، مگر جب ہم ہندوستانیون نے اس کا استعمال کیا تو واحد کی صورت مین تو اصل کے معنی حقیقی اور واقعی کے کر دیئے اور جمع کی صورت مین اصول کے معنی قاعدون کے کر دیئے اور اس جمع کو واحد بنا لیا، اور کہنے لگے ایک اصول یہ ہے، دوسرا اصول یہ ہے اور جب اس کی جمع کی ضرورت ہوئی تو اردو کے قاعدہ سے اصولون کر دیا، اور کہا کہ ان اصولون سے ہمکو انکار نہین،

مادہ، مد سے اسم فاعل مؤنث ہے، اس کے معنی پھیلنے پھیلانے کے ہین، اور مادہ کے معنی پھیلنے والے کے لیئے، یونانی زبان سے فلسفہ کا ترجمہ جب عربی مین ہوا تو جسم کی صورت مین جو چیز پھیلی ہوئی ہے، اس کا نام مادہ گھڑ کر رکھا، اور اس کی جمع مواد بنائی ہماری زبان مین یہ لفظ مواد واحد کی صورت مین زخم کے اندر جو چیز بھری ہوتی ہے اس کے لئے بولا جانے لگا، انگریزی مین مادہ کو میٹر کہتے ہین، اور کسی مضمون کے معلومات

کو بھی میٹر کہتے ہین، اس لئے ہماری زبان مین میٹر کا ترجمہ بھی مواد ہوا، اور بولا جانے لگا،

حکیم برہم مرحوم (مشرق گورکھپور کے اڈیٹر) نے مجھ سے کہا تھا، کہ اصول اور مواد ان دونون لفظون کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے اردو مین ان نئے معنون مین استعمال کیا،

دَولت عربی لفظ ہے، معنی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ مین جانا، عربی مین جب مختلف سلطنتین یکے بادیگرے بنین اور مٹین تو سلطنت کو دولت کا نام دیا گیا اور جمع دُوَل بنائی گئی، ان معنون مین آج بھی دولت برطانیہ اور دُوَل یورپ ہم بولتے ہین، سلطنت اور بادشاہی خوش قسمتی سے ہاتھ آتی ہے، اس لئے ایرانی دولت کو خوش قسمتی کے معنون مین بولنے لگے، جس کی یادگار فارسی کے بدولت ہماری ہندوستانی مین بھی لفظ بہ دولت بولا جاتا ہے، جیسے کہتے ہین آپکے بدولت یہ ملا اور پھر بدولت ذریعہ کے معنی مین ہو گیا، خوش قسمتی کی بڑی نشانی زر و مال ہے، اسلئے یا اس لئے کہ یہ زر و مال بھی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ مین جاتا ہے، اس کو بھی دولت کہنے لگے، اور اس سے دَولت، دَولتمند اور دولتمندی کے لفظ ہندوستانی کو ہاتھ آئے،

عربی مین غصہ کے معنی حلق مین کسی چیز کے اچھو ہو جانے یا اٹک جانے کے ہین، ہندوستانی مین اس کے معنی غیظ و غضب کے ہوگئے، خفا فارسی مین خفہ ہی، اور معنی

وہی گلے مین اٹکنے اور پھنسنے کے ہین، ہندوستانی مین خفا ہونا، ناراض ہونے کے معنی مین ہے،

بعض لفظ خیالات کے بدولت ہاتھ آئے ہین، عربی مین فلک آسمان کو کہتے ہین، چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ ہماری ساری مصیبتین آسمان کی گردش کا نتیجہ ہین، اس لئے ہم نے فلک سے فلاکت بنایا، اور اس سے فارسی کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا) کیا، اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اسکا مفعول مفلوک بنالیا، اور عربی اضافت دے کر مفلوک الحال کہدیا، حالانکہ اسکے ان معنون کو عرب جانتا بھی نہین،

ہر لفظ پر اس تفصیل سے لکھنا پوری تصنیف کے برابر ہے، اس لئے ہم ذیل مین کچھ ایسے عربی لفظ لکھدیتے ہین جن کے معنی ٹھیٹ ہندی ہین، یا فارسی کے اثر یا اہلِ فلسفہ کی اصطلاحون سے ایسے معنون مین بولے جاتے ہین جو عربی قطعًا نہین

عربی	عربی معنی	اردو معنی
قطعًا	کاٹکر (یعنی ہر شک کو کاٹ کر)	یقینی طور سے
لفافہ	لپیٹ	خول، لفافہ
غارت	لوٹ	بربادی
اعتراض	آگے آجانا، سامنے پھیل جانا	اعتراض کرنا

عربی	عربی معنی	اردو معنی
عرض	پھیلانا	پیش کرنا
مقدّمہ	آگے کیا ہوا	جو جھگڑا عدالت مین پیش ہو،
متانت	بھاری ہونا،	مہذب ہونا
متین	بھاری	مہذب
میزان	تول، ترازو	جمع
مذاق	چکھنا	ظرافت
اہتمام	غم کھانا	اہتمام کرنا
مہتم (صحیح مہتم، مہتمّ)	غم کھانے والا	مہتمم
انتظام	دھاگے مین پرایا جانا	انتظام کرنا
منتظم	دھاگے مین پرایا جانے والا	انتظام کرنے والا
غلام	لڑکا	غلام، بندہ
فرض	واجب کرنا	ذمہ داری
ولی	دوست، دوست متولی	سرپرست، خدارسیدہ (خدا کا دوست)
محاذ	مقابل	لڑائی کا میدان
فوج	گروہ، جھنڈ	لڑائی کا لشکر
محنت	رنج و تکلیف	محنت یعنی پوری کوشش

اردو معنی	عربی معنی	عربی
صورت	مثل، مشابہ	شکل
خوبصورت	ہم مثل	شکیل
ایک جگہ کی خبر کو دوسری جگہ بیان کرنا	کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا	نقل
قبول	دیکھا گیا	منظور
دماغ، غرور	دماغ	دماغ
مغرور	×	مدمّغ
غرور	دھوکا	غرور
مغرور	دھوکا کھایا ہوا	مغرور
خاکساری	ٹوٹنا	انکسار
مضبوطی، ثابت قدمی	کم سمجھنا	استقلال
بڑا مکان	آبادی	عمارت
بڑی عمارت بنانا	آباد کرنا	تعمیر
(اردو کسر) عیب، کمی	توڑنا	کسر
عدالت یا انجمن کی نشست	بٹھانا	اجلاس
ضبط کر لینا، حاکم کا چھین لینا	نگاہ رکھنا	ضبط
قاعدہ	نگاہ رکھنے والا	ضابطہ

عربی	عربی معنی	اردو معنی
تقریر	ثابت کرنا	تقریر کرنا
مقرر	ثابت کرنے والا	تقریر کرنے والا
اقبال	سامنے آنا	خوش قسمتی
ادبار	پیچھے ہونا	تنزل
اقبال	× (بے معنی)	اقبال کرنا، قبول کرنا
رَقم	لکھنا	تعداد، چیزوں کی قسم
خراب	ویران	بُرا، مست
دقّت	باریکی	مشکل
غلیظ	موٹا	نجس
امیر	حاکم	دولتمند
غریب	مسافر	مفلس
تربت	مٹی	قبر
نفسانیت	جان ہونا	خودغرضی
غرض	نشانہ	مقصد
غایت	گھوڑ دوڑ کی آخر حد	غرض، آخری حد
عرصہ	میدان	مدت
مدت	درازی	زمانہ

اردو معنی	عربی معنی	عربی
ٹیکس	جس کا حصول ہو	محصول
گاؤن	رکھنے کی جگہ	موضع
گھر	ہونے کی جگہ	مکان
بخار (تپ)	بھاپ	بخار
گھیرا	گھیرنا	احاطہ
مہمان کی عزت کرنا	دل مین کھٹکنے والا	خاطر
عاجزانہ خوشامد	احسان	منت
حلوا	میٹھا	حلوا
خوف	تعجب و حیرانی	دہشت
جنسی خواہش	کسی قسم کی خواہش	شہوۃ
کھانے کی خواہش	"	اشتہا
روپیون کی تعداد	کسی حد تک پہنچا ہوا	مُبلغ
میت کا غم	میت پر غم کرنے کیلیے جمع ہونے کی جگہ	ماتم
حقہ	ڈبیا	حقہ

✓ اس قسم کے ہزارون عربی لفظ ہین جو اپنے خاص معنون مین ہماری ہندوستانی کے خاص لفظ ہو گئے ہین، یہی حال فارسی کا بھی ہے، فارسی کے بہت سے لفظ اور

ترکیبین ہین، جنکو ہم نے اپنے ہندوستانی معنون کے لئے ہندوستانی لفظ بنا لیا ہے، فارسی مین خانہ لگا کر ظرف اور مقام کے معنی کے لفظ بنائے گئے ہین، جن کی صورت تو فارسی کی ہے، مگر معنی اور استعمال سراسر ہندی ہین، جیسے پاخانہ، غسلخانہ، باورچی خانہ، بندی خانہ

اسی طرح فارسی مین دان لگا کر بھی ظرف بنتا ہے، جیسے خاکدان یعنی زمین، ہندوستانی نے اس سے اپنے بیسیون لفظ بنائے، جیسے پاندان، اگالدان، خاصدان، عطردان، گلدان، جزدان، چائدان، دودھ دان، شکردان، روشندان، نابدان، سنگاردان، شمعدان،

تصغیر کے لئے دان کو ہم نے کبھی دانی بھی کر دیا، جیسے سرمہ دانی، گوندانی، مچھر دانی، تلے دانی (سوئی تاگا رکھنے کے لئے)

گیر (لینے والا) لگا کر فارسی مین اسم مرکب بنائے جاتے ہین، جیسے دلگیر، جہانگیر، ہم نے اس سے لفظ بنا کر بہت سی چیزون کے نام رکھدیئے، جیسے خوگیر (خو کے معنی فارسی مین پسینہ کے ہین) عرق گیر، کفگیر، نمگیر، پھر اس سے نمگیرا (نم یعنی شبنم چونکہ اس قسم کے خیمون سے شبنم سے بچاؤ مقصود رہے اس لئے نمگیر کہدیا) دیوارگیر (پہلے اس کپڑے کو کہتے تھے جو دیوار پر آرایش کے لئے لگاتے تھے، تاکہ دیوار سے پیٹھ ٹیکنے مین کپڑا خراب نہ ہو، اب اس لیمپ کو کہتے ہین جو دیوار مین لٹکایا جائے،

اس سلسلہ مین جاگیر تاریخی لفظ ہے، جاگیر کے لغوی معنی تو جگہ لینے والا ہین، بادشاہ اپنے امیرون کو منصب کے ساتھ جو گاؤن دیتے تھے، جہان جا کر امرا اکثر قیام کرتے تھے، اس کو جاگیر کہنے لگے، رفتہ رفتہ جاگیر کے خاص معنی ہو گئے، یہانتک کہ غریب بلا البعلبو

کے کھانے کے ٹھکانے کو بھی جاگیر کہنے لگے،

اسی سے ملا ہوا جاداد کا لفظ ہے، فارسی لفظ کی اصل صورت جاے داد ہے، معنی "دی ہوئی جگہ" بادشاہ کی طرف سے امیرون کو جو گاؤن ملتے تھے وہ جاے داد تھی، رفتہ رفتہ جاداد نے زمینداری اور ملکیت کے معنی پیدا کرلئے، زمیندار اور زمینداری بھی لفظون میں فارسی ہین اور معنی مین سراسر ہندی،

تنخواہ کے لفظی معنی "بدن کا چاہنے والا" معنی یون پیدا ہوے کہ مغلون کے زمانہ مین سرکاری امیرون کو خوراک وغیرہ کے لئے جو معاوضہ ملتا تھا، اس کا نام تنخواہ رکھا گیا، اب تنخواہ کے معنی مشاہرہ کے ہین، ایرانی اس تنخواہ کے حرف سے بھی واقف نہ ہونگے،

ہندوستانی نے یہی عمل ہندی اور سنسکرت لفظون کے ساتھ کیا ہے، ہندی اور سنسکرت لفظون کو اپنانے کے لئے ان کی شکلین بدلی ہین، ان کو ہلکا کیا ہے، ان کی ترکیبون سے نئے نئے لفظ بنائے ہین،

مُہنال، منہ ہندی ہے، نال نالی اور نلی لمبی سوراخ دار چیز کو کہتے ہین، جیسے بندوق کی نال، ویسی ہی نیچہ کی نالی کے منہ پر جو لگا یا جائے وہ مُہنال ہے، گنگا اور جمنا دو دریاؤن کے نام ہین، سونے چاندی کے ملان سے جو نقاشی کی جائے وہ گنگا جمنی ہے، لفظ برہمنتر تھا جو ذرا بھاری تھا، اس کو ہماری زبان نے برہمن کر دیا، اسی طرح گنٹر کو گن کرکے اس کو ہلکا کر دیا، برکھارت نے برسات کی شکل اختیار کی، وچار بچار ہو گیا، اور سوچ بچار کے ساتھ بولا جانے لگا، آشا نے آس ہو کر یہ مثل کہوائی کہ

جب تک سانس ہے، تب تک آس ہے، اسی طرح ہندی اور سنسکرت کے لاتعداد لفظون کو ہندوستانی نے ذرا ذرا ہیر پھیر سے اپنے رنگ مین رنگ کران پر زمانہ کے تغیر کا نیا رنگ چڑھا دیا ہے،

غرض عربی اور فارسی اور سنسکرت نسل کے ان ہندوستانی بچون کی تعداد بیشمار ہے، یہان ان سب لفظون کو پہچنوانا اور بتانا مقصود نہین، مقصود یہ ہے کہ آج ہمارے سنسکرت دوست ہندو دوستون کی جو یہ کد ہے کہ ہندوستانی زبان کے ہر ہندی یا سنسکرت لفظ کو اصل صحیح ہندی اور صحیح سنسکرت رنگ روپ مین لکھین اور اسی صحیح ہندی اور سنسکرت نام سے ان کو پکارین، ان کو تسلی رہے کہ ہندوستانی نے عربی اور فارسی لفظون کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے، اور ہر خود مختار زبان کو اس کا حق ہے کہ وہ دوسری زبانون کے لفظون کو اپنی رعایا بنانے کے لئے ان کے ساتھ یہ سلوک کرے، یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے، اور کسی کی قدرت مین نہین کہ وہ اس سے اس کے اس حق کو چھین سکے،

(معارف ماہ جون ۱۹۳۹ء)

ہماری زبان

ہندوستان مین ہزارون برس سے قومون کا ریلا ہے، آریائی آئے، یونانی آئے، تاتاری آئے، سیتھین آئے، عرب آئے، ترک آئے، مغل آئے، پٹھان آئے، لیکن زبان سے پہچانو تو یہان کس قوم کی اصلیت کیا ہے؟ ہندوستان کا خاصہ یہ رہا ہے کہ وہ دوسرون کو اپنا لیتا ہے، اور پچھلون کے لئے پہلون سے اپنی جگہ خالی کرالیتا ہے۔ ہندوستان کے اصلی رہنے والے ڈراویڈی، اور ہندوستان کی اصلی زبانین ٹامل تلنگو اور کنڑی وغیرہ ڈراویڈی زبانین ہین، سنسکرت اور پرانی ہندی خود باہر کی زبانین ہین، جنکا اس ملک سے چند ہزار برس سے زیادہ کا تعلق نہین لیکن دیکھیے کہ ہندوستان نے ان کو ایسا اپنایا کہ وہ اب اس ملک کی اصلی زبان ہونے کا دعوی کرنے لگین،

آریہ جو زبان بولتے ہوئے اس ملک مین آئے، معلوم نہین وہ اس کو کبتک بولتے رہے، بہرحال اس مین میل ہوا اور اس سے اترکر ایک دوسری زبان کا خاکہ تیار ہوا، جو ذرا ذرا سے فرق سے ہر صوبہ مین الگ الگ ہوگئی،

اسی طرح عرب عربی، ترک ترکی، مغل فارسی اور پٹھان پشتو بولتے ہوئے اس ملک مین آئے، مگر آخر مین سب بھول کر ایک ایسی زبان بولنے لگے جو اسی ملک کی پیداوار تھی، جس مین زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ اپنی زبانون کے بھی کچھ لفظ ملا دئے اور اس سے چارہ نہ تھا،

ہر فاتح قوم تلوار ہاتھ مین لے کر آتی ہے اور مفتوح قومون کو ہٹا کر یا مٹا کر اپنے لئے راستہ صاف کرتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے، فاتح اور مفتوح قومون مین سخت نفرت اور دشمنی ہوتی ہے، کیا مسلمانون کو وہ وقت یاد نہین جب وہ ترک ملیچھ کہلاتے تھے، اور ہندو ان کے سایہ سے بھاگتے تھے، اور مسلمان ان کو بت پرست کافر سمجھکر حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے، صدیون کی لڑائی جھگڑے، خونریزی اور فساد کے بعد دونون قومون نے ایک دوسرے کو سمجھا، اور ایک دوسرے سے قریب ہونے لگیں اور پورے ایک ہزار برس مین وہ اس قابل ہوئین کہ وہ ایک ملک کی ایک ایسی متحدہ قوم بن سکین جن کی زبان ایک ہو، اس لئے آج جو زبان ہماری زبان ہے وہ درحقیقت ایک دو دن، اور ایک دو نسل کی پیداوار نہین، بلکہ پورے ایک ہزار برس کی کشاکش، کشمکش، پھر سمجھوتہ، پھر میل جول اور میل ملاپ کا قیمتی نتیجہ ہے،

دونون قومون نے اس میل ملاپ کے ذریعہ کو پیدا کرنے، ترقی دینے اور پھیلانے مین صدیان گذاری ہین، اور نسلین بیتی ہین، تب کہین جا کر یہ مقصد

حاصل ہوا ہے، آریون نے اپنی سنسکرت، عربون نے اپنی عربی، ترکون نے اپنی ترکی، ایرانی اور مغلون نے اپنی فارسی اور پٹھانون نے اپنی پشتو بھلا کر یا ملا کر اس زبان کا قوام تیار کیا، اور ایسی بولی سیکھی جسکو ہر کوئی اپنی بولی کہہ سکے، اور قومون کے نسلی امتیازات، اور لسانی اختلافات کا خاتمہ ہو سکے،

اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ہماری یہ زبان جسکو ہم اردو کہین، ہندی کہین ہندوستانی کہین، اسی سمجھوتے اور مفاہمت پر مبنی ہے کہ اس کی بناوٹ مین ہر قوم کی زبان اور ادب کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل رہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے اس سے زیادہ بہتر ادبی سمجھوتہ ممکن نہین،

اب ایک ہزار برس کے بعد اگر کوئی قوم یہ چاہتی ہے کہ اس دیس کی بولی اور ادب خالص کسی ایک نسل کی میراث کو قرار دے اور اس کو عربی یا فارسی یا ترکی یا سنسکرت بنانے کی کوشش کرے تو وہ درحقیقت ہمارے بزرگون کی ایک ہزار برس کی زندگی کو خاک مین ملانا اور صدیون کی محنتون کو برباد کرنا اور ہندوستان کے بنانے والون کی ان ہزارون لاکھون قربانیون کو جو اس راہ مین انھون نے کی ہین، ستیاناس کرنا چاہتی ہے، اور آج کے اس ہندوستان کو جس مین محبت کی نہرین بہ رہی ہین، اور جو ہندو مسلمانون کی گنگا جمنی سے جگمگا رہا ہے، اس زمانہ کا ہندوستان بنانا چاہتی ہے جب محمد قاسم راجہ داہر سے یا محمود غزنوی راے جیپال سے یا شہاب الدین غوری پرتھی راج سے

لڑ رہا تھا، اور ہندوستان مین خون کی ندیان بہ رہی تھین،

ہندوستان اب کسی ایک نسل کی ملکیت نہین، اب چاہے وہ پرانے دراوڑی اور آدی ہندو ہون، چاہے سیتھین راجپوت اور گوجر ہون، اور چاہے آرین برہمن ہون، یا عرب و ترک و تاتار و مغل اور پٹھان ہون، اب وہ سب ہندی اور ہندوستانی ہین، اور ان کی ایک ہی زبان ہے جو خیبر کے درون سے لے کر دریائے شور کے کنارون تک بولی یا سمجھی جاتی ہے،

اس مین شک نہین کہ ابھی اس بولی نے دکھن اور بنگال کے بہت سے علاقون کو فتح نہین کیا ہے، پھر بھی اتنے عرصہ مین وہ بہت سے صوبون کو ایک کر چکی ہے، اور یہ کام ہمارے بزرگون نے کیا ہے، اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس کو اور آگے بڑھائین اور بنگال اور دکھن کے علاقون کو فتح کر کے ایک ایسا ملک بنائین جسکی ایک بولی ہو، اس معاملہ مین سب سے آگے اہل بنگال کو ہونا چاہئے، اور ان ہی کی جیت سے اس کی جیت ہے،

اس کا مطلب یہ نہین کہ ہندوستانی کی صوبہ وار بولیان بالکل بھلا دی جائین، بلکہ یہ مطلب ہے کہ صوبہ وار بولیان چاہے اپنی جگہ پر رہین، مگر پورے ملک کیلئے ایک ایسی بولی ہو جائے جو سارے ملک مین سمجھی اور بولی جائے، جس سے پورب کا سرا پچھم سے اور اتر کا کونہ دکھن سے مل جائے، اور ایک دوسرے کے دل کی بات سمجھ سکے،

جو لوگ اس زبان کو اکیلے مسلمانون کی زبان بتاتے ہین، وہ دیکھین کہ مسلمانون کی سب سے بڑی تعداد جہان جہان آباد ہے وہان کی یہ مادری زبان ہے، یا اُن صوبون کی ہے جہان ہندو بھائیون کی کثرت ہے، مسلمانون کا بڑا حصہ بنگال، کشمیر، سندھ، سرحد اور پنجاب مین آباد ہے، ان مین سے ہر ایک صوبہ کی علمی و تعلیمی زبان گو ہندوستانی اردو ہے، لیکن ان کی مادری زبان بنگال مین بنگالی، کشمیر مین کشمیری، سندھ مین سندھی، سرحد مین پشتو، اور پنجاب مین پنجابی ہے، پنجاب کی سرحد سے لیکر بنگال کے حدود تک جہان ہندوؤن کی اکثریت ہے، یہ مادری زبان ہے، مگر سرحد، کشمیر، پنجاب اور سندھ کے مسلمانون نے ایثار کرکے اس ہندوستانی زبان کو اپنی علمی و تعلیمی اور ادبی زبان قرار دے کر ہندوستان کی وحدت اور اتحاد کا ثبوت بہم پہنچایا ہے، اب ضرورت ہے کہ بنگال، بمبئی اور مدراس کے رہنے والے بھی اسکو قبول کرکے اس کو ہندوستان کی عام زبان قرار دے کر ہندوستان کے شمالی اور جنوبی دونون بازوؤن کو ایک ساتھ مضبوط کرکے پورے ملک کو متحد کرین،

یوپی کے موجودہ وزیر تعلیم نے ہندوستانی زبان مین سنسکرت لفظون کو جس حد تک ممکن ہو ملانے اور بڑھانے کی ایک ایسی عجیب دلیل دی ہے جو ایک وزیر کی ذہانت سے بہت کم درجہ کی چیز ہے، کہتے ہین کہ مدراس اور بمبئی مین ہندی کے پھیلنے کے لئے بہت ضروری ہے کہ سنسکرت لفظون کو جس حد تک ہو اور زیادہ بڑھایا جائے، مہاراشٹر کو نہین کہتا، مگر جہانتک دکن اور مدراس کا تعلق ہے وہان

کی زبانین ڈراویڈین ہین، جنکو سنسکرت سے کوئی تعلق نہین، چنانچہ مدراس مین ہندی کے خلاف جو زبردست تحریک جاری ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہان کی غیر برہمن ذاتین اس برہمن زبان (ہندی) کو نہین سیکھنا چاہتین، وہ سمجھتی ہین کہ اس کے ذریعہ مدراس کے برہمن ان کی ذات، قومیت، ادب اور تمدن کو فنا کرنا چاہتے ہین،

پھر بھی لائق وزیر کی خدمت مین یہ کہنا ہے کہ اگر مہاراشٹر، گجرات اور مدراس مین سمجھے جانے کے لئے اس ہندوستانی مین بیش از بیش سنسکرت لفظون کے بڑھانے کی ضرورت ہے تو سرحد، کشمیر، پنجاب اور سندھ مین اس کے زیادہ سے زیادہ سمجھے جانے کے لئے عربی، فارسی، پشتو، کشمیری اور سندھی کے لفظون کو اسی نسبت سے کیون نہ بڑھا دیجئے، پھر دیکھئے کہ ایسی ملی جلی زبان صاف، سادہ اور سہل اردو زبان کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، جس کو ملک کی نسبت سے ہم ہندوستانی کہہ سکتے ہین،

الٰہ آباد یونیورسٹی کے فاضل وائس چانسلر نے ہندی کے حق کو مضبوط کرنے کے لئے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ اردو ہندوستان کے شہرون کی زبان ہے اور ہندی دیہات کی، چونکہ ملک کا بڑا حصہ دیہاتون مین رہتا ہے، اس لئے شہرون مین بھی ہندی ہی کو رواج دینا چاہئے،

ایک بڑی یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر کا ادب ملحوظ رکھکر یہ کہنا چاہتا ہون، کہ ہندوستان کوئی انوکھا ملک نہین، دنیا کے ہر ملک مین شہری اور دیہاتی زبانون کا فرق ہوتا ہے، مگر ہر ملک کی ادبی، علمی، تعلیمی اور مجلسی زبان

شہری ہی ہوتی ہے، دیہاتی نہین، شہراور دیہات کی زبانون کا یہ فرق شہراور دیہات کی زندگیون کے فرق سے ہے، شہریون کی ضرورتین اور میل جول کے ذریعے دیہاتیون سے بالکل الگ ہین، اس لئے دونون کی زبانون اور لفظون مین ہمیشہ فرق رہا ہے اور رہے گا،

اگر آج کوئی تلوار کی طاقت یا اکثریت کے قانون کی قوت سے کسی دیہاتی زبان کو علم و تعلیم اور ادب و مجلس کی زبان بنا بھی دے تو شاید چند سال بھی گذرنے نہ پائین گے کہ پھر شہر اور دیہات کی زبانین دو ہو جائینگی،

پھر یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہندوستان کے سارے دیہاتون کی کوئی ایک ہندی زبان ہے، بلکہ پورے ملک مین تھوڑے تھوڑے فرق سے الگ الگ دیہاتی لہجے اور مقامی بولیان ہین، پھر ان مین سے کہان کی دیہاتی بولی ہماری زبان کا معیار قرار پائے گی،

کسی کا یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ زبان کوئی جامد چیز ہے جس کو کوئی پکڑ کر ایک جگہ جمائے یا ٹھہرائے رہ سکتا ہے، بلکہ وہ ایک چلتی پھرتی چیز ہے جو آج کہین ہے تو کل کہین ہے، چار سو برس کی پہلے کی انگریزی کو آج کی انگریزی سے ملاؤ تو معلوم ہوگا کہ یہ دو قسم کی زبانین ہین، آج ایران مین سعدی اور حافظ کی زبان کہان ہے، سارے عربی ملکون کی زبان ایک ہی عربی ہے، مگر حالت یہ ہے کہ مصر کی عربی عراق کی عربی سے، اور مغرب کی عربی مشرق کی عربی سے بالکل مختلف ہے،

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

ہندوستانی اردو تو دنیا بھر کی زبانون مین سب سے کمسن زبان ہے، ذرا بیجاپور اور گولکنڈہ کے زمانہ کی زبان کو ولی اور ہاشم علی کی زبان سے ملائیے اور ولی اور ہاشم علی کی زبان کو میر اور سودا کی زبان سے ملائے، اور میر و سودا کی زبان کا موازنہ آتش و ناسخ کی زبان سے کیجئے، اور آتش و ناسخ کی زبان کو امیر اور داغ کی زبان سے تو لئے، اور پھر اس کو آجکل کے شعراء عزیز و صفی، اور فانی و حسرت کی زبان سے ملا کر دیکھئے، آپکو معلوم ہو جائے گا کہ زبان کا ہر دور بدل رہا ہے،

نثر مین معراج العاشقین کا خواہ وہ نوین صدی ہی کی ہو، ذرا فسانہ عجائب اور طلسم ہوشربا سے مقابلہ کیجئے، اور پھر شرر اور سرشار کی زبان سے ملائیے، اور سرسید کی زبان کو دیکھئے کہ وہ حالی اور شبلی کے عہد مین بدل گئی، اور اب حالی و شبلی کی زبان بھی بدل رہی ہے، ہندی کا بھی یہی حال ہے، اصل راماین کی ہندی کو ملک جائسی کی ہندی سے ملائیے، پھر کبیر کی ہندی پڑھئے، اور آجکل کی ہندی دیکھئے غرض یہ ہے کہ ہر زبان ہمیشہ بدلتی رہی ہے اور بدلتی رہے گی، اسکا چولا قصداً اور ارادہ سے نہین بدلا جاتا، بلکہ زمانہ کا ہاتھ خود اس کو بدلتا رہتا ہے، ایسی حالت مین آج جو کشمکش جاری ہے وہ کتنی فضول ہے، اس کشتی کو سمندر کے بہاؤ پر چھوڑ دیجئے وہ آپ بہکر ساحل مقصود تک پہنچ جائے گی،

ہمارا یہی کہنا ہے اور ہم نے بار بار یہی کہا ہے کہ زبان وہ ہے جو چلن مین ہے جو ہندوستان مین عام بولی کی حیثیت سے بولی اور لکھی جا رہی ہے اور جس کو ہندو

مسلمان بول اور سمجھ رہے ہین، اور لفظون کی جانچ کا طریقہ شبدساگر اور قاموس نہین ہین، بلکہ ہمارے گھر اور بازار اور راستے اور گلی ہین، اگر اس جانچ کے طریقہ کو مان لیا جائے تو سمجھوتہ سامنے ہے،

ابھی انجمن ترقی اردو لکھنؤ مین صوبہ کے ایک ذمہ وار وزیر نے فرمایا ہے کہ لوگ سنسکرتی ہندی اور عربی و فارسی آمیز اردو سے کیون گھبراتے ہین، کیون دونون کو پڑھنے نہین دیا جاتا، پوچھنا یہ ہے کہ جب اس صوبہ کے رہنے والے دو ایسی زبانون مین بٹ جائین گے جن مین سے ایک کا بولنے والا دوسرے کی نہ سمجھ سکے، تو اس صوبہ کے رہنے والون کی آپس کی بول چال، خط کتابت، لین دین، لکھنا پڑھنا کس زبان مین ہوگا، اور ایک دوسرے کے میل ملاقات کا ذریعہ کیا ہوگا، اور اس ہندو مسلم اتحاد کا کیا حشر ہوگا، جس کے لئے ہم سب بےچین ہین، یہ کہنا کہ اس کے لئے وہی زبان کام آئے گی جو ہمارے درمیان صدیون سے کام آرہی ہے تو کہنا تو یہی ہے کہ پھر یہی ہماری سرکاری اور ادبی اور تعلیمی زبان کیون نہ ہو،

بہرحال اب جہان تک حالات سے اندازہ ہوتا ہے، ہمارے سنسکرت دوست دوستون نے یہ طے کرلیا ہے کہ دلیل و حجت اور معقولیت کی پروا کئے بغیر عملی طور سے وہ وہی کرینگے جو وہ طے کرچکے ہین، یعنی یہ کہ وہ پوری کوشش کرینگے کہ سنسکرتی ہندی اس ملک کی تعلیمی، ادبی اور مشترکہ زبان بن جائے، اس کے مقابلہ مین ان کی جو اس زبان کے حامی ہین جو اس ملک مین صدہا سال سے بو

جاتی ہے یہ طے کر لینا ہے کہ اب تک جو زبان ہندو مسلمانون کے میل ملاپ سے بولی جا رہی ہے، وہ اس کو اس محبت کی یادگار مین قائم رکھین گے اور اپنے بزرگون کی صدیون کی محنت کو برباد نہین ہونے دینگے،

ابھی اردو کا جو دن منایا گیا تھا اس مین بہت سے ممتاز اور سربرآوردہ ہندو بھائیون نے اس مروجہ زبان کی حمایت مین جو حصہ لیا، اس سے پورا اندازہ ہو گیا کہ سمجھدار ہندو دوست بھی اسی کو ملک کے لئے موزون اور مناسب زبان سمجھتے ہین، اور اس کو دونون قومون کے بزرگون کا ورثہ جانتے اور دونون کے میل ملاپ کی تاریخی یادگار مانتے ہین، اور یہ اتحاد اس زبان کی آیندہ زندگی کی بہت بڑی ضمانت ہے،

This book will not serve today because the position of urdu is changed now. read it to know how people were devoting to the progress of urdu.

———— .ــ.:.؛؛:؛ ــ.ــ ————

جواہر الاسرار

میں

کبیر کی بات چیت

جالندھر مین ایک دوست (حکیم عبدالعزیز صاحب مشرقی) کے پاس اُن کے بزرگون کی امانت اور وراثت تصوُّف کی قلمی فارسی کتابون کا اچھا ذخیرہ ہے، ان مین ایک فارسی کتاب جواہر الاسرار نام نظر سے گذری، مصنّف کا نام اور تصنیف کی تاریخ مذکور نہین، رسالہ کے ساتھ خلاصۃ العارفین وغیرہ حضرت زکریا ملتانی، حضرت فرید گنج شکر، حضرت جلال بخاری رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کے ملفوظات ہین، اسی مجموعہ مین فارسی مین گیتا کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس کے آخر مین کتابت کی تاریخ ۲۷ کاتک سنہ ۱۸۷۶ سمت لکھی ہوئی ہے، (سنہ ۱۲۳۳ھ) کاغذ یکسان پرانا اور کشمیری قسم کا ہے، آجکل سمت سنہ ۱۹۹۵ ہے، اس بنا پر اس رسالہ کی کتابت آج سے ایک سو انیس برس پہلے کی ہے، تصنیف کا زمانہ اس سے خدا جانے کتنا پہلے ہو،

بہرحال اس رسالہ جواہر الاسرار مین مصنفؒ نے چند ہندی، فارسی اور عربی کے صوفیانہ لفظون اور فقرون کی تشریح کی ہے، اس مین پنجابی ہندی یا اردو کے چند شعر بھی کہین کہین آگئے ہین، اور وہی میری دلچسپی کا باعث ہوئے، ایک موقع پر لفظ "معرج

نسبت برآب دارد، برائے این قلب گویند" یہ دوہرہ نقل کیا ہے،

جل ترنگ جلهیں تمیں اچی جلمین رائے سمائی   مائی ہیں ما دھویں موہیں ما دھو ہوں توں بچ سمائی

جملہ الصلوٰۃ الا بحضور القلب (حدیث مشہور صوفیہ) کی تشریح مین ہی،

" و ہمین است ہرکہ در عالم یافت اورا ہمہ جا است و ہرکہ در عالم نیافت اورا مشکل حق آسان کند انشاء اللہ تعالیٰ،

اس کے بعد اس مضمون کا یہ دوہرہ ہے،

جن کو درشن ات ہے انکو درشن اُتت   جنکو درشن ات نا نہ تنکوں ات نہ اُتت

الصوفی لا مذھب لہٗ کی تشریح مین دو شعر ہین،

آپس آپ سو بسرا با اس   دوجی بسری پہلے تس

یاد اکیلی رہے سو یاد   اس میں باقی سبہ برباد
(سب)

وحدۃ الوجود کی ایک تمثیل کی تشریح مین ہے،

خدا سو بندا ہو دکھلائے   بندے خدا نکھیا جائے
(بندہ)

کسی فقیر "عبد الفتاح" کا ایک فقرہ نقل کیا ہے،

" اسے میاں ٹک پیچھے دیکھو" یعنی اے فلاں اندک پس بین"

ایک اور فقرہ کی تشریح کی ہے،

" کھوجی جیسے پی بادی مرے" کھوجی یعنی داس بادی یعنی مقابل یعنی ہرکہ جویندہ باشد و تلاش دانستن داشتہ باشد او زندگی یابد و ہرکہ یک چیز یافتہ برہموں ایک

چیز دیک مرتبہ و ہر یک عمل ماند، و در لذت ہوں یک عمل گرفتار شود لاف زند، او مردہ برائے آنکہ او پیشتر راہ نیافت"

اس رسالہ میں سب سے دلچسپ چیز مشہور فقیر کبیر اور بیراگیوں کی ایک بات چیت کی بعینہ نقل ہے، جو اگر درست ہے، تو ہم کو کبیر کے زمانہ کی زبان کی ہو بہو تصویر نظر آجاتی ہے، نقل لکھی ہے،

"جمعے اتیتاں و بیراگیاں پیش کبیر آمدند، وگفتند کہ اے کبیر توں اتیت اور بیراگی ہے، توں واسطے تیرتھ کے اور استھان کے کیوں نہیں چلتا، اٹھ تیرتھ کوں اور استھان کو چل، کبیر گفت کہ بابا تم اتیت اور بڑی بیراگی ہو، اور میں اناڑی ہوں، تمیں جاؤ، میں پڑیا ہوں، بیراگیہا گفتند کہ نہ توں چل ہمارے ساتھ، یا بیراگ چھوڑ، کبیر الحاح کرد، وگفت بیراگیو مجھے چھوڑ دو، بیراگیہا بگذاشتند، باز کبیر گفت کہ بھلا اب کی مجھے چھوڑ دو، اینہہ تونبرا میرا لیجاؤ، اسے تیرتھ اور اشنان کراؤ دوسری بار میں چلوں گا، بہزار منت ماند و تونبرا ہمراہ داد، بیراگیاں تونبہ گرفتہ رفتند، ہمہ جا تیرتھ و اشنان کردند، تونبہ را ہم کنانیدند، بعد از مدت آمدند پیش کبیر کبیر پرسید، کہ تونبرا کہاں ہے، بیراگیاں گفتند کہ ہے، تونبہ را پیش کبیر گذاشتند کبیر گفت کہ تونبرا کوں توڑو، بیراگیہا تونبہ را شکستند، باز کبیر گفت کہ کھاؤ، بیراگیہا خوردند، باز کبیر پرسید کہ کیہا ہے، بیراگیاں گفتند کہ کروا ہے، کبیر گفت کہ اسے بیراگیو تیرتھ اور اشنان کیں کیا ہوتا ہے، جب ترتیں میتھا نہو ئے"

یہ جو کروا تھا، تو تیرت اور اشنان سوں میتھا نہ ہوا جائیگا اصل میتھا نہ ہووی اس کے تئیں سنگت کروی بیل کی تھی تو ای میتھا کیونکر ہوے، جو میتھی سنگت ہوتی تو میتھا ہوتا، پس رفتن و پرسیدن و شنیدن و غوغا کردن چہ کار می آید"۔

کبیر کی وفات کا سال ۱۵۷۵ء سمت مطابق ۱۵۱۸ء مشہور ہے، تو کیا یہ سولہویں صدی عیسوی کی ہندوستانی بولی ہے، ؟ کبیر کی شاعری کی زبان بھی بہت آسان ہے، اور اس میں عربی اور فارسی کے بگڑے ہوئے لفظ بہت ملتے ہیں،

آگے ایک اور شعر نقل کیا ہے، دوہرہ،

نہ دیکھ پرائی چوپڑی نا ترسا اپنا جیو　　روکھا سوکھا کھا کر ٹھنڈا پانی پیو

تجھ کن علم سو ہے فی الحال　　دی بصارت تجھے کمال

ذوق ہوئے نہیں کر دیکھ　　نہیں بھوت کرتھیں اینٹھا بھیکھ

پھیکہ کہیں بید یا نہیں کوئی　　کھاند کہیں میٹھا نہیں ہوئی

بیدھے انتر جب جو ئی　　جوں جھنک کر نہیں نکھے بہر ہوئی

دو بہنیں تھیں، بڑی بہن کا جب بیاہ ہوا، تو چھوٹی بہن نے پوچھا:-

"بوبو بیاہ کیسا ہوتا ہے؟" ایں گفت "کہوں گی"! جب چھوٹی بہن کا ہوگیا تو اس نے کہا" بوبو بیاہ ایسا ہوتا ہے"!

جو نہ دیکھے اپنیں نین توں　　تو نہ پنچی کورکے بین توں

افسوس کہ رسالہ ناتمام ہے،

(معارف ۔ مارچ ۱۹۳۹ء)

مقدّمات

مکاتیبِ شبلی

انسان کی سب سے بڑی یادگار اس کے دن رات کے خیالات کا ذخیرہ ہے، انسان خود فنا ہوجاتا ہے، لیکن اس کے وہ خیالات جن کو وہ کاغذ کے صندوق مین امانت رکھ جاتا ہے، زندۂ جاوید ہین، پچھلی نسلین اگر ان کی حفاظت کرسکین تو یہ مصری مومیائی لگاکر لکھنے والے کی لاش کو صحیح وسالم رکھنے سے زیادہ مفید ہے، کیونکہ اس مومیائی سے ہم اس کے بدن کے ڈھانچ ہی کو بچا سکتے ہین، اور اس کاغذی مومیائی کے ذریعہ اس کے دل کے اندر کے بھید اور اسرار صحیح وسالم اور محفوظ رہتے ہین،

تاریخی انسانون کے صحیح حالات جاننے کا ایک ذریعہ ان کی سوانحعمریان ہین لیکن درحقیقت سوانح نگار کا قلم اپنے ہیرو کی زندگی کا جو مرقع کھینچتا ہے وہ صرف اسکے ظاہری خط وخال کی نقاشی ہوتی ہے، عمقِ قلب کے اندر جو رموز اور اسرار ہین اور جن سے اصل مین "انسانیت" عبارت ہے، ان کی تصویرکشی کے لئے جو رنگ درکار ہے وہ دوسرون کو میسر نہین آسکتا، انسانون کی خودنوشت سوانحعمریان ایک حد تک

اس کی تلافی کرتی ہین، لیکن چونکہ انسان یہ سمجھ کر اپنے حالات حوالۂ قلم کرتا ہے، کہ ایک دن یہ مجموعہ لوگون کے ہاتھ مین جائے گا، اس لئے اصل تصویر مین جہان عیب ہین وہ ان پر سیاہی پھیرتا جاتا ہے، اس بنا پر یہ مرقع بھی اس کی صورت کی سچی شبیہ نہین ہوتی

صرف ایک ہی چیز انسان کی حقیقی شکل وصورت کا آئینہ ہوسکتی ہے، اور وہ اس کے ذاتی اور نجی خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے، چونکہ لکھنے والے کو یہ کبھی خیال بھی نہین آتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظر عام پر آئین گے، اور بہت سے ایسے مکتوب الیہ ہوتے ہین جو اس کے محرم اسرار اور عزیز دوست ہوتے ہین جن سے کوئی پردہ نہین رہتا، اس لئے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس وپیش قلم کے حوالہ کرتا جاتا ہے، اس لئے اس آئینہ مین انسان ویسا ہی نظر آتا ہے، جیسا کہ وہ ہے،

کسی انسان کی بڑی سے بڑی لائف اگر مرتب کیجائے اور حالات کے استقصا کا خاص اہتمام کیا جائے پھر بھی اس کی زندگی کے بہت سے ورق سادہ چھوڑ دینے پڑین گے، بیچ بیچ مین ہفتون، مہینون، بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی مین مخفی رہ جاتے ہین، لیکن اکابر رجال اور خصوصًا اہل قلم اور مصنفین کے بہت کم دن ایسے گذرتے ہین کہ ان کو خود خط لکھنا اور دوسرون کے خطون کا جواب دینا نہ پڑتا ہو، اس لئے اس مسالہ سے اگر ان کی سوانح نگاری کا کام لیا جائے تو ان کی زندگی کے روزنامچہ کا کوئی صفحہ خالی نہ رہ سکیگا،

استاذ مرحوم کے خطوں کے جمع کرنے کا شوق مجھ کو شروع ہی سے تھا، سب سے پہلے ۱۹۰۶ء مین مجھے اُن سے مراسلت کا شرف حاصل ہوا، سنہ ۱۹۰۶ء سے لیکر ۱۹۱۴ء تک ان کا لکھا ہوا اپنے نام کا ایک ایک پرزہ مین نے ایک گرانبہا خزانہ کی طرح محفوظ رکھا، ان مین لفافے، کارڈ، عام رقعے، ہر قسم کے مکتوبات ہین جنکی تعداد ۲۵۰ سے سنہ ۱۹۰۹ء مین خیال آیا کہ یہ جواہر ریزے ممکن ہے کہ کچھ قدرشناس جوہریوں نے محفوظ رکھے ہون اس لئے اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء کے الندوہ مین اپنا خیال احباب کی خدمت مین پیش کیا، انھون نے نہایت سرگرمی سے اس کی تائید کی، اور اطراف ملک سے کئی ہزار خطوط کا مجموعہ جمع ہوگیا، جلد اوّل کے اکثر خطوط مولانا کی زندگی ہی مین صاف ہوکر ان کی نظر سے گذر چکے تھے، پھر کچھ ایسے عوائق پیش آئے کہ یہ مجموعہ سالہا سال تک گوشۂ اہمال مین پڑا رہا، سنہ ۱۹۱۴ء مین مولانا کی وفات کے بعد برسون کی سرد تحریک مین نئی گرمی پیدا ہوئی، دوبارہ مسودہ نکال کر صاف کرایا، خیال تھا کہ مولانا کے احباب اور تلامذہ کے کل خطوط ملا کر ایک جلد پوری ہو جائے گی، لیکن اس تحریک کے دوبارہ اعلان پر اس کثرت سے ہر طرف سے خطوط کی بارش ہوئی کہ یہ تمام ذخیرہ ایک جلد مین نہ سما سکا، جو بچ رہا اس کو ایک اور خزانہ کیلئے سمیٹ کر رکھنا پڑا، اس پر بھی بڑی مشکل سے اس سلسلہ کو دوسری جلد پر تمام کیا جا سکا، ورنہ خطوط کا یہ حال ہے کہ ان سطرون کے لکھتے وقت تک ان کی آمد کا تار نہین ٹوٹا، دوسری جلد کو بھی صرف تلامذہ کے خطوط پر ۲۰۰ صفحہ مین تمام کرنے کا ارادہ تھا، لیکن ۲۰۰ صفحون کے چھپ جانے

کے بعد مولانا کے بعض ایسے اخص الخاص دوستون کے خطوط ملے کہ اگر وہ **مکاتیب شبلی** مین جگہ نہ پاتے تو ہمارا یہ کارنامہ یقیناً ناقص رہ جاتا،

ابتدا ہی سے مولانا کے خطوط اس قدر دلچسپ ہوتے تھے کہ ان کے قدیم وطنی احباب اور تلامذہ نے ان کو حرز جان بنا کر رکھا تھا، اور اگرچہ مختلف حالات اور حوادث کے پیش آنے سے ان کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا، تاہم مولوی محمد عمر صاحب، اور مولوی محمد سمیع مرحوم، مولانا کے دو مخلص شاگردون نے جو کچھ ان کو ملا اس کو سینہ سے لگا کر رکھا، اور مکاتیب کی ترتیب کے وقت یہ امانت انھون نے میرے سپرد کی، اکثر پرانے فارسی اور اردو خط جن سے مولانا کے ابتدائی حالات اور خیالات پر روشنی پڑتی ہے، ان ہی دونون بزرگون کے سلسلہ سے ہم تک پہنچے ہین،

مولانا کے خطون کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے اس کی قدیم سے قدیم تاریخ ۱۸۷۲ء تک پہنچتی ہے[1]، اس زمانہ مین شرفا کی مراسلت کی زبان فارسی تھی، چنانچہ ۱۸۸۳ء تک جب تک مولانا علیگڈہ نہین گئے تھے ان کے تمامتر خط فارسی زبان مین ملتے ہین، علیگڈہ جانے کے بعد بھی ان لوگون سے جن کی نسبت ان کو معلوم تھا کہ انھین فارسی سے ذوق ہے، اسی زبان مین خط وکتابت کرتے تھے، یہ فارسی خطوط مولانا عموماً قلم برداشتہ لکھتے تھے[2]، لیکن ان مین بعض خط ایسے بھی ہین جن کو انھون نے کوشش اور محنت سے لکھا ہے، ایک فارسی خط کے سرے پر لکھا ہے، کہ "یہ ترک

---

[1] مکتوب فارسی ا - [2] مکتوب فارسی ۱۹ و ۲۶ و ۲۸،

الفاظِ عربی"۔ ان فارسی خطوط کی زبان، روان، بامحاورہ، عبارت مقفّی لیکن بے تکلف ہے۔
مولانا نے ان فارسی خطوں کو نہایت عزیز رکھتے تھے، اور ان کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے،
چنانچہ ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں" این نامہ رانزد خود نگاہ باید داشت" (فارسی)
ایک اور صاحب کو لکھتے ہیں" این نامہ را ...... خواہند سپرد وضائع نخواہند فرمود[1]
بلکہ شاید یہ بھی ارادہ تھا کہ ان فارسی خطوط کو مرتب کرکے چھپوا دیا جائے، مولوی محمد
سمیع صاحب کو لکھتے ہیں کہ "جناب مولانا محمد فاروق صاحب کو ہمارے فارسی نامے
اور غزلیں جو تمھارے پاس موجود ہوں نہایت جلد بھیجدو"[2] اور پر اُن کے چھپنے کا ذکر ہے،
لیکن ان کی نگاہ میں اپنے اردو خطوں کی اتنی وقعت نہ تھی کہ وہ ان کو محفوظ
کرنے کے قابل سمجھیں، چنانچہ مولانا کے چھوٹے ماموں زاد بھائی شیخ رشید الدین صاحب
انصاری نے جب ان کو لکھا کہ وہ ان کے خطوط جمع کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے جواب
میں لکھا،

"میرے خطوط بالکل بدمزہ ہوتے ہیں، ان کو کیا جمع کرتے ہو؟ مجھ کو خود مزہ
نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا"[3]

میں نے مولانا کی خدمت میں ان کے خطوں کو جب جمع کرنے کا ارادہ ظاہر
کیا تو ناپسند فرمایا، اکتوبر ۱۹۰۹ء میں ان کی اطلاع کے بغیر جب الندوہ میں اُس عبارت
کے ساتھ جو مکاتیب جلد اول کے دیباچہ میں درج ہے میں نے اس کا اعلان شائع

---

[1] مکتوب فارسی ۴۲ [2] مکتوب ۸ - ۱ [3] مکتوب ۱۹ - ۱

کیا تو انھون نے اس پر یک گونہ برہمی ظاہر کی تاہم تیر کمان سے نکل چکا تھا، لوگون نے خطوط بھیجنے شروع کر دیے، آخر مولانا کو بھی راضی ہونا پڑا، چنانچہ ۵ مئی ۱۹۱۰ء کو مولوی حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کو لکھتے ہین،

"سید سلیمان میرے خطوط جمع کر رہے ہین، کیا آپ کے پاس میرے کچھ ہفوات غلطی سے محفوظ ہون گے"[1]

دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ "ہفوات" مولانا سے شروانی کے پاس "غلطی سے" محفوظ رہ گئے ہین، اس ذخیرہ کو ذی ثروت بنانے مین جن بزرگون نے میری اعانت کی ہے، ان کے خطوط کی تعداد خود ان کی لطف فرمائی کی غماز ہے، تاہم حسب ذیل محسنون کا شکریہ ادا کیے بغیر آگے نہین بڑھ سکتا،

مولوی محمد سمیع صاحب[1]، مولوی محمد عمر صاحب[2]، مولانا حبیب الرحمن خان شروانی[3] مولانا حمید الدین صاحب بی اے[4]، پروفیسر عبد القادر ایم اے[5]، مسٹر ایم مہدی حسن صاحب[6] تحصیلدار، مولوی مسعود علی صاحب ندوی، ان مین سے دو اول الذکر اصحاب نے نہ صرف اپنے نام کے خط اور رقعے محفوظ رکھے تھے، بلکہ دوسرون کے نام کے خطون کو بھی تلف ہونے سے بچایا تھا،

مولانا کی انشاء کے خصوصیات پر بھی کچھ عرض خیال کا ارادہ تھا لیکن اسی زمانہ مین ہماری زبان کے جادو نگار انشا پرداز جناب ایم مہدی حسن صاحب نے اس موضوع

---

[1] مکتوب ۶۹، ۸۰،

پر ایک دلچسپ تحریر لکھکر بھیجی، جس نے میرے اس فرض کو بہت ہلکا کر دیا، چنانچہ مین نہایت مسرت کیساتھ اس موقع پر اپنی جگہ سے ہٹ کر ان کو آپکے سامنے کھڑا کر دیتا ہون،

"تعلقات کی تدریجی رفتار کے ساتھ، تحریر کا لب لہجہ (ٹون) بھی بدلتا گیا ہی جس طرح مولنا کی تقریر برجستہ اور حشو وزوائد سے پاک ہوتی تھی اسی طرح انکی تحریر بھی ہوتی تھی پچھلے تذکرے اس طرح کرتے تھے کہ یاران کہن کی بزم سے اٹھ کر ابھی آئے ہین، اور باتون باتون مین سب کچھ یون کہہ جاتے تھے گویا واقعات سنے سنائے نہین آنکھون دیکھے ہین، یہ مادہ اجتہادی (اور بحثلبی) جیسے جان ادب کہئے، ان کی وسیع معلومات کے ساتھ ان کی تقریر کا خاصہ امتیازی تھا، ان کی شستہ رفتہ اور نہایت پاکیزہ تحریرون مین یہ رنگ اور نکھر جاتا تھا شراب محبت تھی جو کھینچ کھنچ کر دو آتشہ ہو جاتی تھی، نج کی تحریرون مین چونکہ اہتمام کو دخل نہین ہوتا، یعنی اظہار خیال مین صنعت گری طبع کی جگہ صرف آمد جذبات ہوتی ہے، اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبۂ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے، اچھے اچھے بولنے والون بعض چوٹی کے شاعرون کو دیکھا کہ دو سطرین سیدھی سادھی نہین لکھ سکتے، مولانا مین یہ خاص جامعیت تھی کہ جس طرح بولتے تھے، اسی طرح لکھتے تھے، اور نہایت خوشخط لکھتے تھے،

مولانا خاص حالتون کے سوا، لکھنے مین بہل کم کرتے تھے، لیکن ملک کے سب سے بڑے "مستجمع صفات کمالیۂ انسانی" یعنی سر سالار جنگ اعظم کی طرح بوالیسی ڈاک جواب دینے کے عادی تھے؛"

"جس روز ڈاک مین مولانا کا خط ملتا تھا، اس کا پڑھنا پڑھانا میرے لئے ایک ایسا عیش ہوتا تھا جسے کبھی نہین بھولون گا، سوادِ خط اتنا پیارا ہوتا تھا کہ مین نے عمدہ سے عمدہ ولایتی کاغذ اور لفافے بہم پہنچائے، کہ تحریر کے ظاہری حسن کی چمک دمک کچھ اور بڑھ جائے لیکن طبیعت اس کی پابند نہین رہتی تھی، کبھی کارڈ پر ٹالتے تھے، کبھی اس طرح لکھتے تھے کہ کاغذ اور لفافہ، تاہم میرے پاس بعض ایسے خطوط محفوظ ہین جو اس لائق ہین کہ ان کی عکسی ہاف ٹون کاپیان لی جائین"

حسن کہین ہو، کسی حیثیت سے ہو، فطرت کا وہ پاکیزہ مظہر ہے جس سے حافظ کی "شراب معرفت" کی طرح قطع نظر نہین کیجاسکتی، مولانا ادبی حیثیت سے اس کا نہایت صحیح مذاق رکھتے تھے، عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ان کی حکیمانہ شوخیان سرمایۂ ادب ہوتی تھین۔

"مولانا نہایت خوش ترتیب تھے، اونچے طبقے کی سوسائٹی مین بہت مانگ رہتی تھی، جہان وہ کہین سے بیگانہ نہین ہوتے تھے، ملک کے بعض نہایت اونچے خاندانون سے مخلصانہ روابط تھے، ان مین بعض لیڈیان نہایت شایستہ، قابل اور مولانا کے مذاق ادب کی دلدادہ تھین، ان کو کبھی خط لکھتے تھے تو اس طرح جیسے سرکاری گزٹ! بہت ہوا "دعائین" لکھدین، ایک کو لکھا کہ "کچھ نہین"! مین نے عرض کیا، مولانا! "مقصود بالذات" تو وہی تھی، یہان بھی امتیاز رہا! سنکر پھڑک گئے، اور میرے انتقالِ ذہن سے خوش ہوتے رہے

اسی طرح ایک رئیس نے جن کی بیوی نہایت حسین تھین، مولانا سے پوچھا جنسِ لطیف مین کن کن اوصاف کی ضرورت ہے؟ مولانا نے کہا اسے صرف "حسین" ہونا

چاہیئے، اس فقرے کا میاں بیوی پر جو اثر ہوا تھا آجتک اسکا سماں آنکھوں مین ہے،

بہرحال خطوں مین نسبتۃً کم کھلتے تھے لیکن مجھ پر خاص عنایت تھی، اس لئے راز نہین رکھتے تھے، تاہم تصریحات کی جگہ آپ دیکھین گے چشم سخن صرف اشارون سے کام لیتی ہے، مین اس لطف کو کھونا نہین چاہتا، اور یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر تصریح طلب نکتون کی بے نقابی مین نے جائز نہین رکھی، میرا خیال ہے "آفتاب علم کی یہ ضیا، یکطرفہ ( ) (خطوط) ان کی مستقل تصنیفات کے مقابلہ مین نسبتۃً کم دلچسپ نہین ہے" ام

اب مین پھر اپنی جگہ پر آتا ہون،

مولانا کے خطوط نویسی کی خصوصیتین مختصر لفظون مین یہ ہین،

(۱) وہ خط نہایت مختصر لکھتے تھے، کبھی کبھی صرف "ہان" "نان" پر اکتفا کرتے تھے، مفصّل اور طویل سوالون کا جواب بھی ایک دو فقرون مین دیتے تھے اس قسم کے سیکڑون خطوط میرے پاس ہین لیکن مین نے ان کو قصداً اس مجموعہ مین شامل نہین کیا میری مرحوم بیوی (خدا اس کو غریق رحمت کرے) مولانا کے خط کو "تار" کہتی تھی، نمونہ کے طور پر اس قسم کے تار مہدی حسن صاحب کے خطوط مین نظر آئین گے،

(۲) لیکن درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہین ہے، اصل خوبی یہ ہے کہ لفظون کے اختصار کے ساتھ معنی مین پوری وسعت ہو، یہی خصوصیت مولانا کی انشا پردازی کی جان ہے، وہ انھی ایک دو فقرون مین جو کچھ کہہ جاتے ہین، ہم صفحون مین

ان کو نہین کھپا سکتے، وہ چند لفظون مین جو جادو پھونک دیتے ہین، اس زمانہ کے سامری سینکڑون منترون مین وہ روح نہین پیدا کر سکتے، ضرورت تھی کہ اس نکتہ کو مثالون سے واضح کر دیا جاتا، لیکن اس خوف سے کہ یہ مختصر دیباچہ مطول نہ بنجائے اس کو دوستون کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہون،

(۳) آداب و القاب کی پروا نہین کرتے تھے، اکثر بلا تمہید مطلب شروع کر دیتے تھے، (قدما کا یہی طرز تھا) جس کا بڑا خیال کیا اس کو صرف ایک دو لفظ القاب کے لکھدئیے

(۴) خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ خط لکھا، اور آنے جانے کا حساب لگا کر جو دن مقرر کیا اسی دن جواب آگیا، بیماری تک مین بھی وہ اس وضعداری کو نباہتے تھے، بہت مجبور ہوتے تو دوسرون سے لکھا دیتے، چنانچہ مکاتیب کی دونون جلدون مین اس قسم کے خطوط ملین گے،

(۵) شروع مین مولانا کا خط شکستہ تھا، پھر خوشخط نستعلیق لکھنے لگے تھے، آخر مین شکستہ اور نستعلیق مل کر ایک عجیب خوش سواد خط پیدا ہو گیا تھا، یہ خط اس قدر خوبصورت اور حسین تھا کہ بیسیون سلیقہ شعار اشخاص نے اس کی نقلین کین، اور بہت سے اس مین کامیاب ہوئے، چنانچہ ندوہ کے طلبہ، مولانا کے شاگردون اور بعض دوستون نے یہ مشق بہم پہنچائی ہے کہ بہت مشکل سے ان مین تمیز ہو سکتی ہے،

(۶) مکاتیب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہو گا کہ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات

کے مطابق گفتگو کرتے تھے، شاگردون کے خطوط مین علمی و اصلاحی مشورے نظر آئین گے
مولوی حبیب الرحمن خان کے خطوط مین زیادہ تر فارسی شاعری، نوادر کتب، اور ندوہ
کے متعلق باتین ہین، پروفیسر عبدالقادر سے "ادب و تاریخ فارسی" کے مباحث پر گفتگو
ہے، مولانا حمید الدین صاحب سے تفسیر اور سیرت پر مکالمے ہین، مسٹر عبدالماجد سے معقولات
کی باتین ہین، مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف "دائرۂ ادبیہ" کے خطوط مین "محاسنِ ادبی"
اور "لطائفِ شعری" پر گلفشانیان ہین،

خطون کے انتخاب مین جو اصول سامنے رہا آخر مین اس کو بھی ظاہر کر دینا چاہئے،
مین نے صرف ان خطون کو لیا ہے جن مین یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ
ہے یا کسی علمی، اصلاحی اور قومی مسئلہ کا ذکر ہے، یا انشا پردازی کا نمونہ ہو، ان ہی تین
اصولون کی رہبری مین ہزارون خطوط کے انبار سے یہ چند دانے چھانٹ کر الگ کئے
ہین، ورنہ ایک سچے مومن کے نزدیک تو قرآن کی سب سورتین برابر ہی ہین،

(۷، اکتوبر ۱۹۱۷ء)

مکاتیب مہدی

خط کیا ہے؟ آپس مین دو آدمیون کی بات چیت! اس بات چیت کو کاغذون مین محفوظ رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے، بادشاہون اور وزیرون کے حکم احکام کے چھوٹے چھوٹے فقرے جو بلاغت کی جان ہوتے تھے، اور توقیعات کہلاتے تھے یاد رکھے جاتے تھے، عیسائیون مین مقدس حواریون کے خطوط کی خاص اہمیت ہے، اور وہ مجموعۂ انجیل کے ضروری جز خیال کئے جاتے ہین، اور قبول کے ہاتھون سے لئے اور ادب کی آنکھون سے پڑھے جاتے ہین،

لیکن جہانتک میرا علم ہے خطوط کی نگہداشت اور یادداشت کو جو کثرت اور وسعت مسلمانون کے دور مین ہوئی، وہ اس سے پہلے نہ تھی، مسلمانون نے پہلے خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط کو محفوظ رکھا، روایتون مین ان کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ بہت سے عالمون نے ان کو الگ کرکے ان کی کتابین بنائی ہین، دوسری صدی مین امام مالکؒ کا خط ہارون رشید کے نام اور امام لیثؒ کا خط امام مالکؒ کے نام خاص اہمیت رکھتے ہین،

تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے دیلمیون، سامانیون، غزنویون اور سلجوقیون کی حکومتون مین اہلِ قلم ادیبون کو اپنے خطوط اور مراسلات کے جمع کرنے کا خیال ہوا، اس خیال کی تحریک دو وجہون سے ہوئی، ایک تو یہ کہ چونکہ ان عجمی بادشاہون کی زبان فارسی اور ان کی حکومت کی زبان عربی تھی، اس لئے ان بادشاہون کو ایسے محکمۂ انشاء کی ضرورت ہوئی، جہان ایسے اہلِ قلم موجود ہون جو فارسی و عربی دونون زبانون مین پوری مہارت رکھتے ہون، اس ضرورت نے مانگ پیدا کی، اور مانگ نے شے مطلوبہ کو پیدا کرنا شروع کیا، اس سے انشاء کا ایک فن پیدا ہوا، اور منشی پیدا ہوئے، جو بڑی محنت اور جانکاہی سے شاہی فرمان اور مراسلے تیار کرتے تھے، اور چونکہ ان کو وہ بڑی محنت سے تیار کرتے تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ان کے اس خونِ جگر کا کوئی قطرہ ضائع نہ ہونے پائے،

اس سے دوسری وجہ بھی پیدا ہوئی یعنی یہ کہ چونکہ انشاء کا ایک خاص فن پیدا ہوگیا تھا، اس لئے اس کے سیکھنے اور سکھانے کیلئے لائق منشیون کی تحریرون کی ایک ایک سطر، اس کی قدر جاننے اور پہچاننے والے جمع کرنے لگے،

ادیبون مین صابی، صاحب، اور عماد کاتب کے زمانہ سے لے کر "مثل السائر" کے مصنف ابن عبد الکریم تک بیسیون اہلِ انشاء ہین جن کے خطوط اور مراسلے ادب کے خزانون کے بیش قیمت موتی ہین، ہندوستان کے شاہی منشیون مین علامہ **ابو الفضل** کے خطوط و منشآت سے پہلے کی کوئی

چیز ہمارے ہاتھ مین نہین، اس کے بعد تو شاید ہی کوئی فارسی کا انشا پرداز غالب تک ایسا گذرا ہو جس نے اپنی عمر کی محنت کی یہ کمائی ترکہ مین نہ چھوڑی ہو، چنانچہ انشاآت، منشآت اور رقعات کے طرح طرح کے گلدستون سے فارسی کی بزم ادب رشکِ گلستان ہے، اور عالمگیر کے رقعات اس چمن کے سدا بہار پھول،

علما، اور صوفیون مین امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کے مکتوبات سے پہلے کی کوئی چیز ہمارے سامنے نہین، صوفیانہ مکتوبات کے سلسلہ مین بھی ہندوستان کا نمبر سب ملکون سے آگے ہے، دنیا مین جبتک تصوف کی دھارین بہتی رہین گی مکتوبات شیخ شرف الدین منیریؒ اور مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کے کوثر و سلسبیل روحانی پیاسون کی پیاس کو بجھاتے رہین گے،

اُردو مین غالب نے جب ادب کے گرم مجمر مین عود ہندی جلایا ہے، اردوے معلّی کی محفل اس کی خوشبو سے بس گئی ہے، علما، اور صوفیہ کے خطوط اور مکتوبات تو اپنی روحانی برکتون، علمی بحثون اور مذہبی حقیقتون کے سبب سے ہماری عقیدتمندیون کا صحیفہ ہین، مگر غالب کے خطوط مین جو مزا ہے وہ صرف ادبی نکتہ پردازیون کے چٹخارے سے ہے،

مرزا غالب کیا کیا خونِ جگر کھا کر اپنے فارسی نامے لکھا کرتے تھے، مگر تقدیر کی عجائب کاری دیکھئے، کہ اُن کے اس خونِ جگر کا ایک قطرہ بھی ہمارے ادبی خزانہ کا کوئی قیمتی لعل نہ بن سکا، اور ان کی اردو کے چند فقرے جو ہنستے بولتے، چہکتے اور چہچہاتے ان کی زبانِ قلم سے نکل گئے، ان کا ہر نقطہ قدردانون مین موتیون سے زیادہ

قیمتی ٹھہرا اور آج وہ ہمارے ادبی خزانہ کا بیش قیمت سرمایہ ہے،

اس کے بعد جو ادبی دور آیا، اس مین ادب وشاعری کے نکتہ پردازون اور ملک و ملت کے خدمتگذارون کے بہت سے خطوط جن کو قدردانون نے تعویذ بنا کر رکھا تھا چھاپ کر اس تبرک کو وقفِ عام کیا، سرسید کے خط، مولانا حالی کے نامے، نواب محسن الملک کے مکتوبات، مولانا نذیر احمد کے نصائح، منشی امیر احمد صاحبؒ امیر مینائی کی تحریرین، اکبر مرحوم کے عنایت نامے، اور مولانا شبلیؒ کے مکاتیب چھپ کر ہماری زبان کے خزانہ کا سرمایہ بنے،

اب ہماری زبان کے ایک ایسے ادیب کے خطوں کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے، جو نہ کوئی قومی رہبر تھا، نہ شاعر تھا، نہ مصنف تھا، نہ عالم تھا، نہ پیشوا تھا، نہ ناصحِ مشفق تھا، نہ مصلحِ وقت تھا، نہ سیاسیات کا علمبردار تھا، اس کے باوجود اس کے خطون مین وہ لطف تھا جس کی گھلاوٹ سالہا سال گذرنے کے بعد بھی زبان کو اب تک یاد ہے، اور یقین ہے کہ جب تک زبان چلتی رہے گی اس کا مزہ پھیکا نہ ہوگا،

مہدی مرحوم کے خطوط پر نقد اور تبصرہ کرنا اور ان کی خوبیون کو ایک ایک کر کے دکھانا ایسا ہی ہے جیسے کسی خوشرنگ اور خوشبو پھول کی ایک ایک نکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صنّاعی کی داد دے، وہ پھول ہین پھول، پھولون کی قدر یہی ہے کہ آپ ان سے لطف اٹھائین، اور بس! جہان آپ نے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھانے لگے، اور نازک پتیان آپ کی انگلیون کی سختی سے جھڑنے لگین، بہتر سے بہتر صورت

نزاکت و لطافت کی ان تصویرون کے لئے یہی ہے کہ دور ہی سے ان کی خوشنمائی، خوش رنگی، خوش قامتی اور خوشبوئی کی تعریفین کیجایئن، اوران سے خود لطف اٹھایئے اور دوسرد ل کو لطف اٹھانے دے،

مہدی مرحوم کے ادب پر بہتر سے بہتر جو راے دی جاسکتی ہے وہ وہی ہے جو انھون نے آپ شمس العلما آزاد کی نسبت ظاہر کی ہے، کہتے ہین،

"سرسید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہین رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہین توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب کورے رہجائین گے، حالی بھی جہانتک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہین، لیکن آقاے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہین جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہین" (افادات ص ۲۵۲)

بعینہ یہی بات مہدی مرحوم پر چسپان ہوتی ہے، اور وہ صرف انشا پرداز تھے جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہ تھی، اور معلوم ہوتا ہے کہ آزاد مرحوم کے لٹریچر کا اثر ان کی زبان کی لطافت و نفاست پر پورا پورا پڑا تھا، یہ بات آج نہین کہی جارہی ہے بلکہ ہماری زبان کے ایک بہت بڑے ادیب نے جس کا معیار بڑا اونچا تھا، اس وقت کہی جب مہدی مرحوم ادبی نشو و نما کی عمر مین تھے، مولانا شبلی ان ہی کو لکھتے ہین

"مضمون دیکھا، نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے، حیرت ہوتی ہو کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہین یا نذیر احمد و آزاد کی وورد حون نے ایک قالب اختیار کیا ہے، کئی دن

تک دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا" (مکاتیب شبلی ۲ صفحہ ۲۵۹)

جس "ادبی عامل" کی آنکھوں نے نذیر احمد اور آزاد کی دو روحوں کو ایک قالب مین دیکھ لیا، اس نے بڑی سے بڑی داستانِ تنقید کو دو لفظوں مین اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ اُن کو پھیلایئے تو صفحے کے صفحے رنگ جائین، لیکن ان دو لفظوں کو دو جملوں مین پھیلانا چاہین تو یون کہہ سکتے ہین کہ آزاد کی ادبی نفاست و لطافت اور نذیر احمد کی چہل اور خوش طبعی اگر یک جا دیکھنا ہو تو مہدی مرحوم کی قلمی مخلوق کو دیکھئے،

آجکل کی رنگ و بو کی دنیا "ادبِ لطیف" پر مٹ رہی ہے، پیرس کی نازنین نے ایک عالم کو اپنی عشوہ گری سے مسحور کر رکھا ہے، مشرقی زبانون مین فرانسیسی نزاکت کا بار جس نے پہلے اٹھایا وہ مشرق کا وہ سپاہی ہے جس کا سینہ کم سے کم تین سو برس سے یورپ کے مشقِ ناز کا نشانہ ہے، یعنی ترک، ترکون نے جب بیداری کی نئی کروٹ لی تو پیرس ہی کی محبوبہ کو پہلو مین پایا، اس لئے فرانسیسی ہی کی تعلیم ان مین پھیلی اور اس سے نئی ترکی زبان پر فرانسیسی ادب کا بڑا گہرا اثر پڑا، ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر ایک علیگ طالب العلم کو ترکی پڑھوایا، اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت مین برطانوی سفارت کے لئے کار آمد ٹھہرایا، اس نے "زبانی قرب" کے ساتھ اس کو ترکون کا "مکانی قرب" بھی بخشا، نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم بنکر آج سے پینتیس برس پہلے ترکی مفتوحات کو ہندوستانی مقبوضات کی صورت مین بدلنا شروع کیا، اور یہ پہلا موقع ہے جس مین ہماری زبان نے اس "ادبِ لطیف" کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ

تصویرین آج ہزار دو رسالہ کے صفحون مین نظر آتی ہین،

مہدی مرحوم فرانسیسی نہین جانتے تھے اور ترکی کی نسبت تو وہ بے تامل کہہ سکتے تھے

ع زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

وہ انگریزی ادب کا علم بھی کچھ زیادہ نہین رکھتے تھے، یعنی انگریزی کی کوئی اعلیٰ ڈگری نہین پائی تھی لیکن جو دل و دماغ اوران سے بڑھ کر جو ذوقِ سلیم انھین ملا تھا وہ بڑا اعلیٰ تھا، اس لئے انگریزی اور عربی و فارسی کی جو تعلیم ان کو ملی تھی اس نے کمیت کا معاوضہ کیفیت مین کر دیا، پچاس برس کے تجربہ نے بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی برقی لہرون کے ملنے سے نکلتی ہے ان دونون بجلیون کو علیحدہ کر دیجیے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی، مہدی مرحوم مین یہ دونون بجلیان تھین اوران ہی کی رگڑ سے ان کے قلم کی بتی روشن تھی آپ آگے اُن کے خط پڑھین گے تو دیکھین گے کہ نئے معنون کے لئے پرانے لفظ اور انگریزی ترکیبون کے لئے مشرقی طرزِ ادا کی ٹوہ مین کتنے رہا کرتے تھے،

مہدی مرحوم کی جان پہچان اور خط و کتابت کا حلقہ بڑا نہ تھا، پھر بھی چونکہ وہ لطف ادا اور انشا پردازی کے پروانہ تھے اس لئے ان کو یہ شمع جہان بھی جلتی نظر آئی ان کا پہنچنا ضرور تھا، اپنے عصر کے بڑے بڑون سے لیکر چھوٹون تک اُنکی لپک یکسان تھی، حالی، شبلی، ناصر علی دہلوی (صلائے عام والے) عبد الرزاق کانپوری (البرامکہ والے) اور ریاض خیرآبادی وغیرہ جیسے پرانون سے لے کر دلگیر اکبرآبادی

(نقاد کے ایڈیٹر) ہوش بلگرامی (ایڈیٹر ذخیرہ حیدرآباد) عبدالماجد دریا بادی، عبدالباری ندوی اور سلیمان جیسے نوجوانون تک سے اُن کی مراسلت تھی تا ان نوجوانون کی نوجوانی کی یاد اب کاغذ مین رہ گئی، ان مین سے کتنے چل بسے اور جو ہین وہ "تیار بیٹھے ہین"،

غنیمت ہے کہ ہم صحبت ابھی دوچار بیٹھے ہین

ہمدمی مرحوم کی خط وکتابت جن جن سے تھی وہ ان کے خطون کے عاشق تھے جس دن ان کا خط ان مین سے کسی کے پاس پہنچتا وہ دن اس کے لئے بڑی مسرت کا ہوتا، وہ آپ پڑھتا دوسرون سے پڑھواتا، ایک ایک فقرہ سے لطف اٹھاتا، ان کے چھپے طعن وطنز کے تیرون سے جو زخم لگتا وہ بھی مزا دیتا، وہ میری "مولویت" سے خار کھاتے تھے، اگر ان کا بس چلتا تو اس "جامۂ عاریت" کو وہ تار تار کر ڈالتے، مگر آخر چل کر ان کو تسکین سی ہو گئی کہ اس "مولویت" کی گرانی ان کے دوشِ لطافت پر بار نہ ہو گی،

ہم نوجوانوں (اب کہان کے نوجوان!) مین ان کا سب سے زیادہ میل اور میلِ خاطر ہمارے دوست **مولوی عبدالماجد** صاحب دریا بادی کے ساتھ تھا، ان سے خط وکتابت بھی زیادہ رہتی تھی، مولوی صاحب موصوف نے مرحوم کی تعزیت مین جو مضمون "ہمدم" مین نومبر ۱۹۲۱ء مین لکھا تھا اس مین مرحوم کے خطوط کی نسبت اُن کی یہ قیمتی راے ہے،

"ارباب ذوق کے لئے ان کے مضامین سے بھی بڑھکر قیمتی ان کے خطوط

ہوتے تھے ایک ایک سطر ادب و انشا کی جان ہوتی تھی، اپنی بصیرت وعلم کے مطابق کہہ سکتا ہون کہ دور موجودہ کے ادیبون میں شاید بلا استثنا کسی کے بھی خطوط اس قدر دلچسپ و پر لطف نہیں ہوتے تھے، جن خوش نصیبوں سے سلسلۂ مراسلت قائم تھا وہ شوق و اشتیاق کے ساتھ جدید مکتوب کے منتظر رہتے اور پچھلے گرامی نامہ سے ہفتوں لطف اندوز ہوا کرتے۔"

یہ ہماری زبان کے ایک قابل ادیب نقاد کی رائے ہے،

خود ہمارے مرحوم اس صنف ادب کے بہت ہی قدردان تھے، وہ اکثر ادیبون کے خط بڑی حفاظت سے رکھتے تھے، اور ان کو "حرز جان" نہیں تو "حرز ادب" سمجھتے تھے، مکاتیب شبلی کے سلسلہ سے اپنے ایک دوست (ڈپٹی مولوی عبدالمجید صاحب برادر مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی) کو لکھتے ہین :-

خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہین ہوتا، یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اسکی اشاعت کی نوبت آئے گی، اس لئے سرسری خیال بھی اگر اس پایہ کا ہو کہ انشا پردازی اس کی بلائیں لیتی ہو، تو یہ بھی کمال کا ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہین کیجا سکتی"؛ (مکاتیب مہدی ص۱۸۵)

مکاتیب شبلی پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھون نے مجھے لکھا تھا جو مکاتیب شبلی کے مقدمہ مین شامل ہے،

"نجی کی تحریروں میں چونکہ اہتمام کو دخل نہین ہوتا، یعنی اظہار خیال مین صنعت گری طبع

کی جگہ صرف آمدِ جذبات ہوتی ہے، اس لئے لٹریچر کا یہ ایک ایسا اضطراری حصّہ ہے جو لکھنے والے کے مرتبۂ انشا پردازی کی صحیح غمازی کرتا ہے، اچھے اچھے بولنے والون، چوٹی کے شاعرون کو دیکھا کہ دو سطرین سیدھی سادی نہین لکھ سکتے۔"

ان فقرون مین مہدی مرحوم نے جس خیال کو بار بار دہرایا ہے، اگر اس کو ان ہی کی زبان مین کہون تو کہہ سکتا ہون، کہ حسنِ تحریر کی وہ صنف جو تالیف و تصنیف مین نظر آتی ہے، وہ سراپائے جمال ہے، جو اپنے جلوۂ سربام کا احساس رکھتی ہے، اور دیکھنے والون کے لئے اہتمامِ آرایش کرتی ہے، اور حسنِ تحریر کی وہ صنف جو کارڈ کی چلمنون اور لفافون کی نقابون مین چھپی ہوتی ہے، وہ اپنے جلوہ سے بے پروا اور تاک جھانک کرنے والون سے بے خبر رہتی ہے، اس لئے وہ تصنع اور تکلف کے غازہ اور پوڈر اور سعی و اہتمام کی زینت و آرایش سے پاک ہوتی ہے، وہ فطرت کے سانچے مین ڈھلی ہوئی ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی وہ ہے، سال و سن کے عاشق کہتے ہین:-

"سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے"

ادب و سخن کے شائق بھی ایک جزئی ترمیم کے ساتھ اس تجویز سے متفق ہین!

"سادگی گہنا ہے اس فن کے لئے"

اس "فن" سے مقصود خط و کتابت اور نجی تحریرون کا اسلوبِ نگارش ہے کہ اگر اس مین بھی اہتمام و تصنع اور کاوش و تکلف کی نمایش ہو تو پھر وہ حسن فطری نہ ہوگا، بلکہ اس "چراغ خانہ" پر "شمع بزم" کی پھبتی درست ہوگی، یعنی "حسن طبعی" "حسن کسبی" بنجائیگا

۱- مہدی مرحوم کے خطوں کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان میں مصوری کا کمال نہیں تصویر فطرت کا جمال ہے، ان کا حسین خیال اپنے پیکرِ ظہور کے لئے اپنی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروز ہے، وہ آسمان اسٹیج کے ستاروں کی طرح دوسروں کی پسند کا لباس پہن کر جلوہ فروش نہیں،

۲- مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا، نوکِ قلم پر جو بات آجاتی، وہ "ناگفتنی" بھی ہوتی، تو "گفتنی" ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقہ ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی، چنانچہ مرحوم کے اس قسم کے فقرے اپنی عریانی کے باوجود جس قدر مستور ہیں وہ زیر لب داد کے مستحق ہیں،

"دیکھئے پھولوں کی سیج پر "جوانی کی ورزش" کی شائقہ اپنے چاہنے والے سے کیا کہتی ہے" دوسرا تیسرا یہ حملہ ہے، یہ بھی کیا کوئی شہر شملہ ہے، (ص۲۹)

ایک "صاحب قلم" کے نکاحِ ثانی کی ضرورت اور تحسین میں یہ فقرے کچھ زیادہ کھولنے کے محتاج نہیں،

"دو آتشہ" اچھی کھنچی ہوئی ہو تو نشاطِ ہستی کچھ اور بڑھ جاتا ہے، میں اس نشہ کا اثر آپ کے لٹریچر پر دیکھنا چاہتا ہوں" (ص۴۳)

اس قسم کے بیسیوں فقرے خطوط میں ملیں گے، بالقصد ان کو ناظرین کے سامنے لانا چونکہ ناظرین کی "اتفاقی نظر" کے لطف کو برباد کرنا ہے، اس لئے انگلی کا اشارہ ادھر کر کے چپ ہو جاتا ہوں، اور اس چپ کی داد چاہتا ہوں،

۳۔ مرحوم کی تحریر کا ایک کمال یہ تھا کہ وہ تلمیحون سے اکثر کام لیتے تھے، تلمیح کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک خاص شخص یا واقعہ کے متعلق صدیون سے خیالات کی موروثی رفتار جو تفصیلات اور جزئیات کا ذخیرہ پیدا کرتی رہتی ہے، وہ پورا کا پورا اس ایک لفظ یا واقعہ کے اندر اس طرح سمٹا رہتا ہے، جیسے میلون تک پھیلنے والی خوشبو بند کلیون مین کھولئے تو سطرون کی سطرین اور صفحے کے صفحے درکار ہون، لکھتے ہین:۔

"شبلی کی طرح کہ ایک گود مین ایک پیٹ مین، کسی وقت فرزندان حرفی کی تخلیق سے خالی نہین" (ص۵۰)

"ایک گود مین ایک پیٹ مین" کی تلمیح کی تشریح کیجئے تو واقعہ کی تفصیل کے ساتھ کثرت تولید پر تنقید کا فرض بھی ادا ہو جاتا ہے،

صفحہ ۳۴ پر یہ فقرہ ہے جس مین اپنے انگریز افسر کی غلط رپوٹ سے جو تکلیف ان کو ایک دفعہ پہنچی تھی اس کی پوری تفصیل اسی ایک فقرہ مین ہے،

"گورے کے دل کی سیاہی جب قلم سے ٹپکتی ہے تو زیادہ پھیلتی ہے"

مسلمانون کی ترقی کے لئے جو کوششین ہو رہی تھین ان کے متعلق سرسید کے بعد مولانا شبلی کو لکھا تھا:۔

"جو آگ برف کے ٹکڑون پر سلگائی جائے وہ جل چکی" (ص۱۰۵)

مولوی عبد الماجد صاحب دار الترجمہ حیدرآباد کی خدمت کی کشاکش سے نجات پاتے ہین، جو لوگ نوکری اور حیدرآباد دونون کو جانتے ہین وہ ان مختصر فقرون کی بلاغت

کی داد دین،

"خوش ہوا قفس کی تیلیان ٹوٹین اور پرشکستہ طائر کو ہوائے وطن نصیب ہوئی" (ص۶۵)

معلوم ہوتا ہے کہ عارف نفس مہدی کو بھی اپنی انشا پردازی کا یہ راز معلوم تھا، اپنے قلم اور ایک "صاحبہ" کی زبان سے وہ ادا کرتے ہین :۔

"ایک صاحبہ جو پاس بیٹھی ہیں، اس خط کو دیکھکر فرماتی ہین تم سرسری خط مین جو کچھ لکھدیتے ہو بڑے مضمون مین بھی اس کی سمائی نہین ہوسکتی، کیا یہ سچ ہے؟" (ص۱۱۱)

۴۔ متین رنگینی اور سنجیدہ شوخی مہدی مرحوم کا حصہ ہے، ایک صاحب کو جو نکاح کی شب اول مین بیمار تھے لکھتے ہین :۔

جسے "بستر شکن" ہونا تھا وہ شاعری کی اصطلاح مین صرف "شکن بستر نکلا" (ص۵۹)

ایک صاحب قلم دوست کو جو نوکری کے جھمیلون سے چھوٹے ہین لکھتے ہین :۔

"آپ لکھتے ہیں، وقت اپنا ہے، قلم اپنا ہے، دماغ اپنا ہے، ایک صاحبہ فرماتی ہین صاف کیون نہین کہتے "بیگم اپنی ہیں" یہ نکتہ رہ گیا تھا کمی پوری کئے دیتا ہون" (ص۲۶)

"ہان جناب ماجد ہون یا آپ دونون صاحبون کی یہ "مدرسیت" میری سمجھ مین نہین آتی کہ عورت مرد بنا کر پیش کیجائے اور اس سے انشا پردازی کی سنجیدگی پر استدلال

"مین نے عورت کے "سینہ" کے لئے جس پر "سبزۂ خودرو" نہین ہوتا آپ لوگون سے ایک لفظ مانگا تھا، اسی طرح مجھ کو اصرار ہے کہ وہ کرتا نہین کرتی پہنتی ہے، کیا یہی حیا سوزی ہے، جسے با وصف لذت کشی آپ بے نقاب دیکھنا نہین چاہتے" (ص۱۰۲)

مہدی مرحوم کا یہ اسلوبِ تحریر جس قدر لطیف و نازک ہے اسی قدر پرخطر ہے، وہ اس راستہ میں غار کے منھ تک آجاتے ہیں، مگر قلم کا محتاط قدم اس طرح تل تل کر پڑتا ہے کہ لغزش نہیں ہونے پاتی،

۵- وہ نئی لطیف ترکیبوں کے پیدا کرنے کا شوق بیحد رکھتے تھے، اور جب کبھی وہ ایسی ترکیب پا جاتے تو رقص کرتے، اور اگر دوسروں کی تحریروں میں وہ ملتیں تو وجد میں آجاتے، گرہ شب، سمندر کے کف کی پری، آئینہ کا سبزۂ خودرو، خمیازۂ شباب، مقیاس الشباب، قدم مختون، تموج ہوائی، سحر کا آسیب، زہرۂ شب، محبت کا ثمرِ اولین وغیرہ بیسیوں لفظ اور ترکیبیں ہیں، یہ نگینے جہاں جڑ جاتے ہیں عبارت چمک جاتی ہے،

۶- نئے انگریزی خیالات اور اصطلاحوں کے لئے ان کو عربی و فارسی الفاظ کے بنانے کا خاص چسکا تھا، وہ اس کے ادھیڑبن میں رہتے تھے، اُن سے نہ بن پڑتا تو دوسرے اہل لوگوں سے پوچھتے، بلکہ فرمائش کرتے، ایسے خط مولوی عبدالماجد صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب کے خطوں میں ملیں گے، ٹیبل ٹاک کے لئے متفاکہات، انسٹی ٹیوشن کے لئے نظامات ادب، ماسٹرپیس کے لئے اختراعِ فائقہ، ایٹی کیٹ کیلئے عوائد رسمیہ، ان ڈیفنس کے لئے تبرّی، لپ سروس کے لئے وظیفۂ لب، ٹرننگ ٹائم کے لئے وقفۂ سبکدوشی، ہنی مون کے لئے عہد زفاف، موٹو کے لئے طرازِ نگی ایجاد ہے، وہ اردو میں انگریزی لفظوں کا بعینہٖ استعمال پسند نہیں کرتے تھے، مولوی عبدالباری صاحب ندوی (مبادی برکلے کے مترجم) کو لکھتے ہیں،

"مبادی کے دیباچہ مین اسٹائل اور اسٹوڈنٹ کی پیوندکاری کس ضرورت سے ہے، آپ کی انگریزی دانی مسلّم اچھا تو یہ کا "اسپند" ہوگا، (ص۱۰۴)

۷۔ ان کا ادبی ذوق اتنا لطیف تھا کہ جہان عربی اور فارسی کا بھی کوئی موٹا یا بھدا لفظ آجاتا طبع سلیم کی پیشانی پر بل پڑجاتے، ایک شذرہ مین جبکہ مین انہلال کے گھن سے نیا نیا چھوٹا تھا "لعنت کبریٰ" کا لفظ لکھ گیا تھا، انھون نے جوابی ڈاک سے ٹوکا (ص۲۲) ہمارے دوست مولوی عبدالسلام ندوی نے ایک مضمون مین "یا در ہوا" لکھا تو مذاق اڑایا۔ (ص۲۲)

"یاران باصفا" کی نہین اپنی کہتا ہون کہ مرحوم کی زندگی تک تو میرا یہ حال تھا کہ مضمون نکلنے کے بعد ان کے خط کا منتظر رہتا اور ڈرتا تھا کہ دیکھون کہان کورکسر نکلتی ہے، داد ملتی تو خوش ہوتا اور ٹوک دیتے تو جھینپ جاتا،

آخر مین مرحوم کے طرز انشا کی نسبت ہم اپنی زبان کے ایک ایسے ناقد سخن کی رائے نقل کرتے ہین جس کے قلم کی ہر تحریر ادب کی آنکھون کا سرمہ ہے، مہدی مرحوم کا ایک مضمون پڑھ کر انہی کو لکھتے ہین:۔

"مین نے سنگلاخ زندگی کے مرحلون مین آپ مین یونان کے سنگتراشوں کی سی نزاکت اور مصوری دیکھی تھی، اب جو معارف مین آپ کا مضمون دیکھا تو اس کے الفاظ مین وہی مصوری پائی، گویا بولتی چالتی تصویرین آنکھون کے سامنے تھین جو بزبان حال داستان عبرت سنا رہی تھین"

اس مصور کا نقشِ ہستی تو سترہ سال ہوئے کہ مٹ چکا، مگر پیشینگوئی کے مطابق اس کی بنائی ہوئی تصویرین اب بھی جیتی جاگتی ہین،

مرحوم کوئی پیشہ ور مصنف نہ تھے جو پچھلون کی زحمت کے لئے اپنی تصنیفات کا ذخیرہ چھوڑ جاتے،

ہمسفر ہمنظر! ذرا ٹھہرین، پائے نظر کی چاپ نہ ہو، عالمِ غیب سے مین ایک سریلی آواز سُن رہا ہون، مہدی مرحوم کی آواز ہے،

چند تصویرِ بتان چند حسینون کے خطوط بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سامان نکلا

ہان پتہ پایا، یہی دو چیزین مرحوم نے یادگار چھوڑی ہین، "چند تصویرِ بتان" یعنی چند مضامین جو **افاداتِ مہدی** کے آئینہ مین جڑی آپ نے دیکھی ہین اور "چند حسینون کے خطوط" یعنی یہ چند حسین خط جو ان اوراق مین اپنا جلوہ دکھا رہے ہین،

مرحوم کا قلم باغ و بہار تھا، باغبان تو رخصت ہوا مگر اس کی کھلائی ہوئی بہار اب بھی کھلی ہے، یارب جبتک ادب کی بہار رہے اس بہار پہ خزان نہ آئے،

۱۲ر اپریل ۱۹۳۸ء،

گلستانِ امجد

کہتے ہین کہ ہم سے پہلے دُو سعدی گذرے ہین، ایک سعدی شیرازی، اور ایک سعدی دکھنی، سعدی دکھنی کا حال اور مقال گو بعض تذکرون مین مذکور ہے، مگرانکی شخصیت کے تاریخی شواہد کی پوری تحقیق ابھی نہین ہوئی ہے،

بہرحال یہ تو زمانۂ ماضی کا بیان ہے،

زمانۂ حال نے ہمارے سامنے ایک تاریخی سعدی دکھنی کو پیش کردیا ہے، جس کی شخصیت مین کسی شک وشبہہ کی گنجایش نہین،

یہ دکھنی سعدی حکیم الشعرا امجد حیدرآبادی ہین،

دونون سعدیون مین عجیب مماثلت ہے، وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی، وہ بھی شاعر یہ بھی شاعر، وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقرون والی نثر کی پیالیون مین قندونبات گھولنے والے،

اور یہ بھی

وہ بھی نظم ونثر کو ترتیب دے کر شراب دو آتشہ تیار کرنے والے اور یہ بھی

اخلاق ونصیحت کی تلخی کو شہد وشکر مین ملاکر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے ہین، مجاز کو حقیقت کا پردہ وہ بھی بناتے تھے اور یہ بھی بناتے ہین،

اس مماثلت نے وحدت اتحاد کی صورت اختیار کی اور وہ گلستان جو سعدیِ شیراز کی تھی سعدیِ دکن کی بنکر نمودار ہوئی، اور گلستانِ امجد اپنا نام رکھا

کہنے کو تو یہ سعدی کی گلستان کا ترجمہ ہے مگر حقیقت مین امجد کی تصنیف ہے، اس مین امجد نے سعدی کے خزانۂ خیال پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ قابض کی ملک ہو گیا ہے،

سعدی کی نظم ونثر دونون کا ترجمہ مترجم نے نثر مین کر دیا ہے، اور سعدی کی نظم کی جگہ خود اپنی ہم معنی نظم فرد، قطعہ یا رباعی کی صورت مین درج کی ہے اور اس طرح گلستانِ سعدی گلستانِ امجد بن گئی ہے،

ترجمہ کی زبان آسان اور روان ہے، چھوٹے چھوٹے فقرے، مختصر جملے، ٹھیٹ محاورے، دلکش ترکیبین، موٹے موٹے اور بڑے بڑے لفظون سے پرہیز اس کتاب کی خاص خصوصیت ہے،

بوڑھے سعدی نے یہ کتاب خدا جانے کن کے لئے لکھی تھی، مگر یہ سب سے زیادہ بچون کو پسند آئی، اور اُن ہی کے نصابِ تعلیم مین داخل ہوئی، اور اُن ہی نے بچپن مین اس کا سبق لے کر جوانی مین نصیحت اور پیری مین عبرت حاصل کی،

امجد کی گلستان بھی عجب نہین کہ ان ہی نونہالون کے کام آئے،

زبان کی آسانی اور نصیحت کی شیرینی کی بنا پر امید ہے کہ مکتبون مین رواج پائے گی بچے اس کو مزے لے کر پڑھین گے، اور جوانی مین اس سے نصیحت اور بڑھاپے مین عبرت پکڑینگے،

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس مصنف کو اس نقلی گلستان کے صدقے مین اصلی گلستان نصیب کرے، جس کی کلیان کبھی افسردہ اور جس کے پھول کبھی پژمردہ نہ ہون گے،

۱۸ ربیع الثانی ۱۳۵۴ھ

کلامِ شاد

پر

مقدمہ

پٹنہ عظیم آباد ہندوستان کے اُن قدیم شہرون مین سے ہے جو کئی ہزار برس سے علم و ہنر کے مرکز ہین، تاریخ کے ابتدائی عہد کو چھوڑ کر صرف آخری صدیون کو لیجیے کہ ہر دور مین اس کی خاک سے سیکڑون ہزارون اربابِ کمال اٹھے، جن کی شہرت کا افسانہ اب تک تاریخِ کہن نہین بنا ہے، علم و ہنر کے لاتعداد انواع و صنوف مین سے اگر صرف ایک شعر و سخن ہی کے شعبہ کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ شہر ہندوستان کے ان شہرون مین سے ہے جن کی مردم خیزی پر ہمارے ادبیات کو ناز ہے،

صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ جلوۂ خضر مین غلط نہین لکھا ہے کہ دلّی اور لکھنؤ کے بعد یہ شہر اردو کا تیسرا مرکز ہے، خاص کر جب آخری زمانہ مین دلّی ویران ہوئی اور صوبون مین خود مختاریان پھیلین تو لکھنؤ کے بعد یہ دوسرا مرکز آباد ہوا، اور اس کے بعد تیسرا مرکز مرشدآباد تھا، جو اربابِ کمال قدردانیون کی تلاش مین دلّی سے نکلے تھے،

ان کی پہلی منزل لکھنؤ، دوسری عظیم آباد اور تیسری مرشد آباد ہوتی تھی، اس لئے اودھ کے پایۂ تخت سے لے کر بنگال کی مسندگاہ تک کملاے عہد اور فضلاے روزگار کا قافلہ ایک مدت تک آتا جاتا رہا،

دلی کی تباہی کے بعد جس طرح لکھنؤ مین نوابی قائم ہوگئی، بہار و بنگال مین الگ مسندین لگین، اور ان کا نام ناظم ہوا، آخر مین بنگال کی نظامت سے الگ ہوکر یہ صوبہ ایک مستقل نظامت کی صورت مین منتقل ہوگیا، گو انگریزون کے پرزور اقتدار کے باعث اس کا بہت جلد خاتمہ ہوگیا، اس خود مختارانہ عہد حکومت کا بانی راجہ شتاب راے کا خاندان تھا، راجہ اور اس کا تمام خاندان اس عہد کی مروجہ تعلیم و تربیت مین بے نظیر تھا، اور مذہب کو چھوڑ کر اس کا تمام طور و طریق اور طرز تمدن سب اسلامی تھا، درباروں مین اسی طرح مسندین بچھتی تھین، ارباب کمال آتے تھے اور اپنے اپنے کمال کی داد پاتے تھے، اس عہد کا سب سے بڑا علمی مشغلہ شاعری تھا، راجہ خود بھی شاعر تھا اور شتاب تخلص کرتا تھا، اور شعرا کا مربی اور سرپرست تھا،

راجہ شتاب راے کے علاوہ جو صوبہ دار آتے وہ بھی مرکزی کمزوری کے باعث اپنی ایک مستقل شان رکھتے تھے، اور اس عہد کے لوازم دربار کے مطابق شعر و سخن کی سرپرستی اور قدردانی مین بھی حوصلہ دکھاتے تھے، بہرام جنگ، مظفر جنگ، سید ہدایت علی خان وغیرہ صوبہ داران پٹنہ نے بھی اپنے بعد اپنی علمی قدردانی کے کارنامے یادگار چھوڑے ہین،

اس علمی مرکز کے قدیم سخنوروں میں ایسے بزرگوں کے نام ملتے ہیں جو ولی دکنی میر و سودا، اور مرزا مظہر و خواجہ میر درد کے ہم پہلو تھے، ملا محمد علیم تحقیق، عبدالقادر بیدل اشرف خان فغاں، سید محمد شاہ کرناجی، خواجہ امین الدین امین، جبار علی بسمل، محمد روشن جوشش، ہیبت علی خان حسرت، شیخ محمد عابد دل، میر غلام حسین شورش، مرزا مظہر علی جذب، شیخ غلام یحییٰ حضور، میر محمد تسلیم، اور شیخ غلام علی راسخ وغیرہ ایسے سخنور یہاں گذرے ہیں جن کی محنتوں اور کاوشوں سے اردو زبان نے ترقی پائی ہے، تحقیق اور ناجی ولی کے قریب العصر اور راسخ میر کے ہم عہد اور ان کے پیرو تھے، جوشش خواجہ میر درد کے پیرو تھے، اور حسرت کو مرزا مظہر سے تلمذ تھا، ان مسلمان شعرا کے پہلو بہ پہلو راجہ شتاب رائے شتاب، راجہ بہادر راجہ اور راجہ پیارے لعل الفتی کے نام لینے چاہئیں، جن کی سرپرستی، سخن سنجی اور سخن فہمی نے عظیم آباد کو لکھنؤ بنا دیا تھا،

اس کے بعد جو دور آیا، گو ہوا کا رخ بدل چکا تھا اور انقلاب حکومت کے طمانچہ نے زمانہ کا رخ پھیر دیا تھا، دلوں کے اگلے جوش اور ولولے سرد پڑ گئے تھے محفلیں برہم ہو گئی تھیں دربساطیں الٹ چکی تھیں، تاہم سیلاب کے تھمنے کے بعد بھی کچھ دیر تک دریا کی موجیں اچھلتی رہتی ہیں، بزرگوں کے فیض دیدار سے منور آنکھیں اس شہر میں موجود تھیں، مرزا احمد منشا، میر ذبیح، ملا احمد، راجہ پیارے لال الفتی، سید شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ نے نئی بزم آراستہ اور نئی شمع روشن کی

شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی اپنے عہد کے ایک باکمال صاحب ہنر تھے
گو وطن عظیم آباد تھا، مگر سرکاری توسل سے عمر کا بڑا حصہ مرشد آباد اور کلکتہ مین گذرا،
نظامت بنگالہ کی طرف سے سفارت و نیابت کے عہدہ پر ممتاز تھے، غرض علم و اقبال
دونون دربارون مین ان کی کرسی بچھتی تھی، عہد کے مذاق کے مطابق فارسی اور
اردو دونون مین داد سخن دیتے تھے،

شاہ صاحب کی آغوش تربیت مین بہار و بنگال کے سیکڑون سخنور پلکر جوان
ہوئے، مثلاً خواجہ شہرت، اصغر حسن کامل، عبد الرؤف وحید، معین الدین ازلی،
میر رحیم وغیرہ، مگر خاص شہر عظیم آباد مین جو دو نونہال اس بہار سخن کے فیض سے بارگ
بار ہوئے، اور جو بحمد اللہ کہ اب تک یادگار سلف باقی ہین، وہ نواب سید امداد امام
صاحب اثر، اور سید علی محمد صاحب شاد ہین، یہ دونون باکمال آج ملک مین بزرگون
کے نام روشن رکھنے والے نیز عہد ماضی کے چراغ ہین، مولانا شاد کی عمر اب اسی
کے قریب ہے، عمر کے بیسوین مرحلہ سے ان کی شاعری کا آغاز ہوتا ہے، گویا ساٹھ
برس ان کی شاعری کی عمر ہے، آج ہندوستان کے کسی گوشہ مین کسی ایسے باکمال
سخنور کا نشان دو جس نے ساٹھ برس کا ریاض کیا ہو، اور کہنہ مشقی کا یہ نمونہ پیش کر سکتا ہو،
شصت سالہ عہد سخنوری مین اس باکمال نے کیا کیا خون جگر نہ پیا ہوگا، کہ شعر و
سخن کے یہ لعل و عقیق اس نے اُگلے، اور کیا کیا آنسو نہ بہائے ہونگے، جب اس فضل
و کمال کے در و گوہر ہاتھ آسکے، اس وقت تک جو سرمایۂ سخن منتشر اوراق کی صورت

مین ہے، اس کا اندازہ ایک لاکھ سے کم نہین، پھر اس مین بھی قصائد، مثنویات، غزلیات
قطعے، رباعیات اور افراد سب کچھ ہین، ایسے وسیع سرمایہ کو پیش نظر رکھکر یہ پونے
دو سو صفحون کا غیر منتخب دیوان غزلیات کو دیکھکر افسوس آتا ہے کہ جواہر سخن کے
بیشمار انبار مین سے صرف یہ چند دانے قدر دانان شاد کے دامن شوق مین آسکے،
بہرحال ان چند دانون سے شاد کی اصلی دولت کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے،
موجودہ استادون مین شاید حضرت شاد کا ہمعصر کوئی دوسرا نہ نکل سکے، جس نے
ہماری محفل ادب کا پچھلا سمان دیکھا ہو، استادان کہن کی صحبت اٹھائی ہو، اور ایک
ایک شعر اور ایک ایک مصرع کی بندش اور ایک ایک لفظ اور محاورہ کی تلاش
مین خواب و خور اپنے اوپر حرام کر لیا ہو،

شاد کا خاندان دلی سے عظیم آباد آیا تھا، لیکن ان کی صحبت اور ان کا تعلق
زیادہ تر لکھنؤ کے ارباب کمال سے رہا، تاہم یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ان کی شاعری
پر لکھنؤ سے بہت زیادہ دلی کا رنگ نمایان ہے، ان کے کلام مین کہین کہین لکھنؤ
والون کے صنائع بدائع کا نمونہ بھی مل جاتا ہے، مگر شاعری کا مذاق، مضامین، معانی،
خیالات، سنجیدگی، متانت ہر چیز دلی کا پتہ دیتی ہے، اس کے ساتھ جو چیز شعرائے
لکھنؤ کی ان مین نظر آتی ہے، وہ الفاظ کی صحت، محاورون کا تتبع اور فارسی ترکیبون
کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہے، اس طرح ہم عظیم آباد کے حضرت شاد کو لفظی حیثیت
سے لکھنؤ کا اور معنوی حیثیت سے دلی کا کہین گے،

شاد کی شاعری حسن و عشق کے عامیانہ اور سوقیانہ انداز بیان سے تمام تر پاک ہے، پاکبازانہ حسن و عشق، اور رزم و بزم کی دلکش روداد کے علاوہ ان کی شاعری میں اخلاق، فلسفہ، تصوف اور توحید کا عنصر بہت زیادہ ہے، غزل گوئی کے لحاظ سے شاد میں میر کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں، حسن و عشق کی داستان سرائی میں وہی سادگی اور متانت ہے، چھوٹے چھوٹے الفاظ میں سادہ ترکیبیں ہیں، بیان میں وہی رقت ہے، میر ہی کے اوزان و بحور ہیں، وہی انداز کلام ہے، وہی فقیرانہ صدا ہے، اس لئے شاد کو اس دور کا میر کہا جائے تو بالکل بجا ہے، افسوس کہ فرصت مفقود ہے ورنہ شاد کے پورے دیوان پر ایک نظر ڈال کر بہ تفصیل مثالوں سے اپنے دعووں کو روشن کرتا،

جناب شاد کا یہ دیوان درحقیقت ان کے بلا انتخاب، اور نا مرتب کلام کا ایک مختصر مجموعہ ہے، یہ ان کی شاعری کا کامل نمونہ نہیں ہے، مصنف نے اپنے ایک مفصل گرامی نامہ میں جو راقم حروف کے نام تھا، ان تمام نقائص اور مصیبتوں کی داستان لکھی تھی جو اس مجموعہ کی ترتیب میں پیش آئیں، جن میں سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ مصنف سے نظر ثانی کرانے اور نیز حک و اصلاح کے ان اشارات سے جو مصنف نے نظر در نظر کے بعد کاغذوں کے حواشی اور اطراف میں وقتاً فوقتاً بنائے تھے، جامع اور مرتب اصحاب نے پہلوتہی کی اور یہ اصحاب اسکی یہ معذرت پیش کرتے ہیں کہ اگر نظر ثانی اور اشارات و اصلاحات کے سمجھنے کے لئے

یہ مجموعہ مصنف کے سپرد کیا جاتا تو ہماری محنت بھی اسی طرح دریا برد ہو جاتی جس طرح اس سے پہلے خود مصنف کی کئی محنتین اس باب مین غایت احتیاط کی بنا پر غارت ہو چکی ہین،

بہرحال اس مجموعہ سے پہلے سید حسرت موہانی نے دیوان شاد کا جو مختصر انتخاب شائع کیا ہے اس سے تو بہت زیادہ سرمایہ اس کاغذی خزانہ کے اندر ہے خدا وہ دن لائے کہ جب حضرت شاد اپنا ضخیم کلیات خود مرتب کرکے قدر دانون کے ہاتھون مین دین، اس وقت اس پوربی شاعر کے فضل وکمال کا چراغ پورب سے پچھم تک کی دنیاے ہند کو منور اور روشن کر دے گا،

دارالمصنفین اعظم گڈہ

۱۰ شوال المکرم ۱۳۴۱ھ

کلیاتِ عشق

بہار کی سرزمین مین ہمیشہ دو متضاد صفتین جمع رہی ہین، وہ جیسی مردم خیز ہے ویسی ہی مردم خوار بھی ہے، یہان کی مٹی مین جتنی صلاحیت اور استعداد ہے، افسوس ہے کہ اس کی آب و ہوا مین نشو و نما کی اتنی قدرت نہین، یہان ہر دور مین بیسیون اہلِ کمال پیدا ہوئے مگر وہ اہلِ وطن کی ناقدری کے ہمیشہ شاکی رہے، بختیار خلجی کے فتوحات کے بعد سے پورب کا یہ قطعہ ملک کے دوسرے حصّون سے کسی امتیاز اور خصوصیّت مین کم نہیں رہا، تاہم ان کے ہموطن معاصرون کی ناقدری کے سبب سے تاریخ کے صفحے ان کے نامون اور کارنامون سے خالی نظر آتے ہین،

ہندوستان نے اربابِ کمال کے تمام اصناف مین سے صرف دو کے نام زندہ رکھے ہین، مشائخ اولیا، اور شعرا، کہ وقتاً فوقتاً ان کے با اخلاص مریدون اور معتقدون نے ان کے ملفوظات و مکتوبات اور تذکرے لکھ کر ان کے فیوض و برکات اور زبانی و ذہنی الہامات کو قائم و باقی رکھا، مگر اس صوبہ نے ایک

حضرت مخدوم الملک بہاری رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے رفقا کو چھوڑ کر ہندوستان کی اس رسمِ کہن کو بھی تازہ نہ رکھا، "نیکی کن و بدریا انداز" کے اصول پر" بزی و گمنام باش" یہان کے ارباب کمال کی دستارِ فضیلت کا طرۂ امتیاز رہا،

سلطان سلیم شاہ لودی کے زمانہ مین شیخ بڑھ یا شیخ بڈھ بہار مینؒ ایک نامور طبیب اور ممتاز شیخ تھے، شیر شاہ سوری کو ان سے ایسی عقیدت تھی کہ خود اپنے ہاتھ سے وہ ان کی جوتیان سیدھی کرتا تھا، شیخ علائی کے مشہور ہنگامہ مین دار السلطنت آگرہ کے علما کی باہمی کشاکش سے گھبرا کر ان ہی شیخ بڑھ کو اس نے حکم مقرر کیا تھا اور اسی ضمنی حیثیت سے تاریخون مین ان کا تذکرہ ہے اور اسی ضمنی تذکرہ سے معلوم ہوا کہ انھون نے ملک العلما، دولت آبادی کی تصنیف ارشاد کی ایک شرح لکھی تھی جیساکہ بدایونی مین ہے،

اکبری دور مین بہار مین محدثین کے ایک خانوادہ کا پتہ لگا ہے جس نے مولانا یسین گجراتی اور شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ سے فیض پایا تھا اس کے بعض ارکان کے نام یہ ہین،" حافظ الوقت مولانا شیخ عبد الرزاق بہاری

سلہ تاریخ فرشتہ کے جامعہ عثمانیہ کے مترجم (ترجمہ تاریخ فرشتہ اردو جلد دوم) اس پر حاشیہ صفحہ ۱۹۰ مین لکھتے ہیں کہ بہار کی جگہ بیانہ چاہیئے، اور بڑھ کی جگہ بہودہ، لیکن اس تصیح کی سند معلوم نہین، شاید مترجم کو ان بہودہ خاں طبیب کا خیال ہے جنھون نے سکندر شاہ لودی کے لیئے ہندی طب پر ایک کتاب لکھی ہے، حالانکہ تاریخ فرشتہ (احوال سلطنت سلیم شاہ سوری) اور منتخب التواریخ بدایونی (مطبوعہ کلکتہ) جلد ا صفحہ ۴۱۰ مین بتصریح بہار لکھا ہے،

شیخ الوقت مولانا عبدالنبی، مولانا عبدالمقتدر محدث، مولانا محمد عتیق بن عبدالسمیع بہاری، مگر یہ نام اس طرح محفوظ ہین کہ ان کی دی ہوئی حدیث کی ایک سند پھلواری مین قلمی ملی ہے،

عالمگیر کے عہد مین فتاوی عالمگیری نام جو مستند و معتبر کتاب علما کی ایک جماعت نے مل کر بادشاہ کے حکم سے لکھی تھی، اس مین بہار کے علما بھی شریک تھے، مگر اس کا ثبوت اب صرف اسی قدر رہ گیا ہے کہ ان کے خاندان مین یہ روایت چلی آتی ہے کہ ان کے اسلاف کو یہ عزت حاصل ہوئی تھی،

آخر زمانہ کے علما مین ملا محب اللہ بہاری جو سلّم اور مسلّم کے مصنف ہین، اور جو عالمگیر کے عہد مین کابل کے قاضی اور بہادر شاہ اوّل کی حکومت مین کل ہندوستان کے قاضی القضاۃ تھے، ان کے حالات کی چند سطرین صرف آزاد بلگرامی کے صدقہ مین آج ہمارے سفینۂ علم مین ہین، حالانکہ یہی وہ ہستی ہے جس کی یہ دونون کتابین پوری ایک صدی تک اودھ کے مشہور علمی خاندان فرنگی محل کی ذہنی تگ و دو کا میدان رہی ہین، یہ چند سطرین آزاد کے صحیفہ (سبحۃ المرجان اور مآثر الکرام) مین صرف اس تعلق سے باقی رہ گئین کہ ملا محب اللہ، ملا قطب الدین سہالوی کے ہمدرس اور یہ دونون ملا قطب الدین شمس آبادی کے شاگرد تھے، اور ملا محب اللہ لکھنؤ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے،

ملا غلام یحیٰی بہاری جن کے حاشیہ کا پڑھنا اور پڑھانا آج سو برس سے ہندوستان

کے نصابِ فلسفہ کا منتہاے کمال سمجھا جاتا ہے، ان کی پوری سوانح عمری کا اتنا ہی حصہ معلوم ہے کہ وہ حضرت میرزا جانجانان کے مرید تھے، اور شمس العلما آزاد نے آبِ حیات مین میرزا جانجانان کی لطافتِ طبع، اور ملا غلام یحییٰ کی لمبی گھنی داڑھی کا لطیفہ سنایا ہے، گذشتہ صدی کے واقعات کو جانے دیجئے، اس صدی کے بزرگون کے نام لیجئے جن کے فضل و کمال کے آوازہ سے ان کی زندگی مین پورا ہندوستان گونج رہا تھا، مگر اب تاریخ کے نقارخانہ مین ان کے نام کی بھنک بھی سنائی نہین دیتی، مولانا ابراہیم صاحب آروی شمس العلما مولانا محمد سعید عظیم آبادی مولانا محمد کمال صاحب، مولانا حکیم عبد الباری صاحب، مولانا حکیم محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی حکیم محمد نصیر صاحب، مولانا حکیم عبد الحمید صاحب مولانا شاہ عین الحق صاحب پھلواروی، مولانا شمس الحق صاحب محدث اور صوبہ کے مشرقی دیہاتون مین مولانا وحید الحق صاحب (استھانوان) مولانا یعقوب صاحب اور مولانا مصطفیٰ شیر صاحب (دلینہ) مولانا احسن صاحب (گیلانی) مولانا سعادت حسین صاحب (کھٹہ) مولانا بشارت کریم صاحب (پڑھوکہ) مولانا محمد رفیع صاحب (شکرانوان) مولانا قاری عبد اللہ صاحب (شاہ پور بازید پور) وغیرہ وہ نادرۂ روزگار ہستیان تھین جن کے دامن تربیت مین سیکڑون باکمال پلکر جوان ہوئے، مگر افسوس کہ ان کے سوانحِ حیات کا ایک صفحہ بھی ہمارے پاس محفوظ نہین، آج کتنون کو معلوم ہے کہ دہلی اور ٹونک کے وہ نغمہ طراز بلبل جن کی نغمہ سنجیون سے باغِ ہند کا گوشہ گوشہ معمور ہے ان کا

آشیانہ اسی سرزمین کا ویرانہ تھا، محدثِ عالم مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کا آفتاب سورج گڈھ سے طلوع ہوا تھا مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکی کا مرزبوم میرنگر کا قریہ ہے، اور مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی بختیار پور کے قریب کسی دیہات سے تعلق رکھتے تھے،

الغرض یہ اس شیرازِ ہندپور کے آخری خطہ کی یہ طبعی و فطری خصوصیت ہے جسکی فرسودہ شکایت آج بے سود ہے،

اس سرزمین میں علما، اور فضلا، کا جو حال ہوا، وہی شعرا کا بھی ہوا، حالانکہ میر کی نکات الشعراء (۱۱۶۵ھ) اور تذکرۂ حیرت (۱۱۷۴ھ) کے بعد سخن گویانِ اردو کے ابتدائی تذکرے پہلے یہیں مدون ہوئے، شورش نے ۱۱۹۴ھ اور عشقی نے ۱۲۱۵ھ[ل] کے لگ بھگ یہیں شعرائے اردو کے تذکرے لکھے، یہ دونوں تذکرے عظیم آباد ہی میں لکھے گئے، ان کے علاوہ گلزارِ خلیل اور اس کا ترجمہ گلشنِ ہند بھی اسی چمن زار کے پروردہ ہیں، لیکن ان پرانے تذکروں کا حاصل بھی نام و تخلص اور چند منتخب اشعار کے سوا اور کیا ہے؟

خاص عظیم آباد میں پیدا ہونے والے، اور دہلی سے آکر یہاں بسنے والے شعراء کی بڑی تعداد ہے، خواجہ امین الدین امین، سید جبار علی تسلّی، عبدالقادر بیدل،

ل شعرالہند کے مقدمہ میں بحوالہ معارف جو اس کا ۱۱۱۵ھ میں تالیف پانا لکھا ہے، وہ غلط ہے اسلئے اس کتاب کے مصنف کو بھی دھوکا ہوا ہے (صفحہ ۲۷)

ملا محمد علیم تحقیق، شیخ محمد روشن جوشش، میر باقر حزین، ہیبت علی خان حسرت، میر غلام حسین شورش، رحمت اللہ عشقی، شاہ رکن الدین عشق، غلام حسین محرم، آغا حسین قلی خان عاشق، ظریف الملک کوکہ خان، اشرف علی خان فغان، میرزا محمد علی فدوی، محمد شاکر ناجی، شیخ غلام علی راسخ، مرزا مظہر علی جذب، شیخ غلام یحییٰ حضور، میر محمد تسلیم، راجہ پیارے لال الفتی، شیخ محمد عابد دل، شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ نامورانِ سخن کے حالات و واقعات اور ان کے شعر و سخن اور فضل و کمال کی تصویرین اگر کاغذ پہ کھینچی جائین تو آبحیات کا ایک نیا مرقع تیار ہو سکتا ہے،

شکر کا مقام ہے کہ ملک کی نئی نسل کو اپنے پرانے بزرگون کی یادگارون کو زندہ کرنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے، اسی شوق کا ایک نتیجہ یہ کتاب یادگار عشق ہے، مولوی حسن رضا صاحب عظیم آبادی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہین کہ انھون نے ان پرانے بزرگون مین حضرت شاہ رکن الدین ابو العلائی المعروف بہ شاہ گھسیٹا المتخلص بہ عشق شاہ جہان آبادی عظیم آبادی کے کارنامۂ حیات کو اس نئے زمانہ مین نئے آب و رنگ سے پیش کیا ہے،

سب کو معلوم ہے کہ شیراز سے لے کر دلی تک تصوف اور شاعری نے دوش بدوش نشو و نما پائی ہے، سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ اور خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے جب سے شاعری کو تصوف کی زبان قرار دیا، اس وقت سے لے کر آج تک معرفتِ ربانی اور معاملاتِ دل کے رموز و حقائق اسی زبان مین ادا ہو رہے ہین،

اور جب تک لکھنؤ نے اس خانقاہ کی بولی کو کوچہ و بازار کی زبان نہیں بنا دیا تھا یہ معرفت کا گنجینہ اور حقیقت گوئی کا مرقع رہی، لیکن لکھنؤ کے بازار میں اگر اس یوسف کا وقار قائم نہ رہا اور جمالِ لن ترانی کے بجائے "حسن ہزار رقیب" اس کا موضوع قرار پاگیا، شاہ گلشن، میرزا مظہر، خواجہ میر درد، میر محمد اثر اور شاہ رکن الدین عشق کے اسرار، ہر بوالہوس حسن پرست کا ترانۂ شوق بن گیا، خانقاہوں میں اترنے والی حورِ بازاروں کی ہرجائی بن گئی، صدائے غیبِ الہام کی زبان جنون و سودا کی بڑ ہو گئی طور کا مقدس افسانہ اصرار و انکار، ہر لبِ بام اور ہر رہ گذر کے ہجر و وصال کی حکایت ہو گئی،

شاہ رکن الدین عشق بھی اسی اگلی دو آتشہ کے متوالے تھے، جو ہمیشہ پرانے بزرگون کی شراب الصالحین رہی ہے، عشق کے پیالہ مین گلاب معرفت اور بادۂ سخن دونون کی آمیزش تھی، اسی لئے ان کا کلام دونون حلقون مین مقبول ہوا اور دونون دربارو سے ان کو حسنِ قبول کی سند ملی، ان کے سوانح نگارون نے بھی ان کے تذکرہ مین ان کی ان دوگونہ کیفیتون کا ذکر کیا ہے،

میرزا علی لطف اپنی گلشن ہند مین علی ابراہیم خان خلیل عظیم آبادی کے گلزار ابراہیم کے حوالے سے جو ۱۱۹۸ھ مین تالیف پائی، لکھتے ہین، یہ وہ وقت تھا جب حضرت عشق مسندِ حیات پر جلوہ آرا تھے،

"عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام، شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے، شاہجہان آبادی

نواسہ شاہ فرہاد کے، عمدہ مشائخون مین سے دلی کے۔ جہان بیان ہوتی شاہ فرہاد کی حالت سکر ومستی ہے تو کہتے ہین کہ اس عالم مین تعظیم بادشاہ کی نہین کی ہے، غرض عشق ایام شباب میں شاہجہان آباد سے مرشد آباد میں آئے اور خواجہ محمدی خان مرحوم کے ساتھ ایک مدت ایام حیات بعزت تمام بسر لائے اگرچہ کچھ نہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے لیکن آنکھون مین امرایانِ مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے، بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگون کے طور پر مزاج **فقر و درویشی** کی طرف آیا اور تکیہ فضل ایزدی پر کرکے طور استقامت کا **عظیم آباد** مین ٹھہرایا، پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی اور معتقدون کے ہجوم سے عالم درویشی مین شاہی کی، طالبانِ راہِ حق کو تدات مطلب سے خالی نہ چھوڑا، بقول علی ابراہیم خان مرحوم سنہ ۱۱۹۵ھ سو پنچانوے[۱] ہجری تک دادِ حال و قال کی دی آخر بلدۂ عظیم آباد مین مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت بآواز بلند کہی، دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ مین مرتب ہے، یہ اس کا منتخب ہے،

میر حسن دہلوی مرحوم (المتوفی سنہ ۱۲۰۱ھ) جو حضرت عشق کے ایک دوسرے ہمعصر تذکرہ نویس لکھتے ہین،

---

[۱] اس کتاب یادگار عشق کے صفحہ ۵ میں علی ابراہیم کے فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم سے یہ سنہ یکہزار و یک صد و پنج نقل کیا گیا ہے، یا سہواً چھپ گیا ہے سنہ ۱۱۰۵ھ اس کو یکہزار و یک صد و نود و پنج سنہ ۱۱۹۵ھ ہونا چاہیئے، "سلیمان"

"خورشید[1] سپہر حال و سپہر خورشید کمال، مالک کنوز دقائق و کاشف رموز حقائق، کلامش بمذاق تصوف آشنا، و نور صفائے باطنش چون آئینۂ صبح دل کشا درین صفا، عارف صاحب کمال، و درویش بے مثال شاہ رکن الدین عرف مرزا گھسیٹا المتخلص بہ **عشق**، مرد صوفی است کہ خیل مریدان و معتقدان حلقۂ غلامی دارند، در سلسلۂ نقشبندیہ نقش زدہ، اصلش از شاہجہان آباد است، پیشتر نوکری پیشہ بود، الحال از مدتے ترک روزگار نمودہ بہ عظیم آباد مقیم است، مرزا فدوی از شاگردان و معتقدان اوست، شعر عارفانہ در کلامش بسیار است، اگاہے در ذوق و شوق یا بعالم وجد دو سہ شعر می فرماید، دام افضالہ"

عشق کے چمن میں فیوض و برکات کی یہ بہار جس گلستان بے خزان سے آئی ہے اس کا نام "سلسلۂ ابوالعلائیہ منعمیہ" ہے، ضرورت ہے کہ اس سلسلہ کی تھوڑی تشریح کر دی جائے، یہ سلسلہ سیدنا ابوالعلا، اکبرآبادی اور حضرت مخدوم منعم پاک قدس سرہما کی طرف منسوب ہے، حضرت عشق کا تعلق اس سلسلہ سے خاندانی اور موروثی تھا، اس سلسلہ کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے، کہ اس کے اکثر بزرگ اوائل میں شاہی

[1] اس فقرہ سے یہ سمجھنا کہ یہ تاریخ وفات ہے (یادگار عشق صفحہ ۱۴) صحیح نہیں بلکہ علی ابراہیم خان کے تذکرہ کی ان سطرون کی تحریر کا سنہ ہی، چنانچہ خود مصنف یادگار عشق نے اصل گلزار ابراہیم سے گلشن ہند کی اس اردو عبارت کا اصل فارسی فقرہ جو نقل کیا ہی اس میں یہ مطلب صاف ہی، "تا حال سنہ یکہزار و یکصد و نود و پنج ۱۱۹۵ھ است کہ آں صاحب حال و مرجع کمال در ارشاد طالبان حق اشتغال دارد"، مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں اس فقرہ کا جو ترجمہ کیا ہے وہ مشتبہ ہوگیا ہے، "سلیمان"

درباروں سے اٹھ کر شہنشاہ علی الاطلاق کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں،

سیدنا ابو العلاء | سیدنا امیر ابو العلاء خاندانی امراے شاہی میں تھے، آپکے دادا امیر عبد السلام اور آپکے والد ماجد امیر ابو الوفا ترکستان کے شہر سمرقند سے جلال الدین اکبر کے عہد میں فتحپور سیکری آکر مقیم ہوئے، سیدنا ابو العلاء مضافات دہلی میں سے نریلہ نام مقام میں پیدا ہوئے، آپکے والد نے آپ کو کمسن چھوڑ کر انتقال کیا، اس لئے یہ دُرِ یتیم اپنے نانا کے دامنِ تربیت میں آیا، آپکے نانا خواجہ فیضی بنگالہ میں بردوان کے ناظم تھے، اس تعلق سے آپ بردوان گئے، نانا کے مرنے پر آپ امراے شاہی میں داخل ہوئے، مگر توفیقِ ازل کی دعوت پر بہت جلد امیر نواز شہنشاہِ ہند کی بارگاہ معلّٰی سے الگ ہو کر سلطان الہند غریب نواز کی درگاہِ اقدس میں حاضر ہوئے اور مدتوں وہیں اجمیر میں معتکف رہے، اور اس روحانی درسگاہ سے بے واسطہ کسبِ کمال کے بعد اکبرآباد گئے، جہاں اپنے چچا حضرت عبد اللہ اکبرآبادی سے طریقۂ نقشبندیہ میں مرید ہوئے، مگر اجمیر شریف کے کیف واثر نے فیضِ چشت سے بھی مالامال کردیا تھا،

ابو العلائی سلسلہ کے بانی آپ ہی ہیں، یہ سلسلہ دراصل نقشبندی اصولِ تعلیم کا مختصر نصاب ہے، جس کو حضرت سیدنا ابو العلاء نے ابناے زمانہ کی پست ہمتی کو ملحوظ رکھکر مرتب فرمایا، عشق و توحید اس اصول کی اصل اصیل ہیں، ۹ صفر ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی، مزار پر انوار اکبرآباد میں ہے، آپکے خلفا میں شمس العلماء میر سیّد دوست محمد قدس سرہ

مشہور وممتاز ہوئے، امیر ابو العلا، کی یادگار ایک مختصر سا دیوان ہے جس کا ایک نسخہ خانقاہ اسلام پور (پٹنہ) مین موجود ہے،

شمس العلما میر سید دوست محمد

شمس العلما میر سید دوست محمد برہان پور دکن کے رہنے والے تھے، سیدنا ابو العلا، کی صحبت مین کامل ہوئے، اور اجازت کے بعد اپنے وطن جا کر تشنگانِ حق کو سیراب کیا، اورنگ آباد دکن جا کر اقامت کی ۱۰۹۰ھ مین وفات پائی، یہ ہندی کے شاعر تھے، اپنے پیر سے جدائی کے بعد پیم کہانی ایک مثنوی لکھی جو صوفیہ مین مشہور ہے،

شاہ محمد فرہاد دہلوی

حضرت رکن الدین عشق ان ہی حضرت شاہ محمد فرہاد دہلوی کے نواسہ تھے، شاہ محمد فرہاد کے والد ماجد دکن کے صوبہ دار ہو کر اورنگ آباد گئے تھے اس تعلق سے شاہ فرہاد کا بھی اورنگ آباد جانا ہوا، اور اس زمانہ سے جبکہ ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی، آپ میر سید دوست محمد شمس العلما، کے حلقہ مین آنے جانے لگے، پھر کچھ دنون کے بعد ان سے مرید ہو گئے، اور اپنے پیر کے حکم سے دہلی آکر اپنے فیض کا چشمہ جاری کیا، محو واستغراق کا یہ عالم تھا کہ حق سے آشنا ہو کر خلق سے بیگانہ ہو گئے تھے، اور ماسوا کی خبر نہ رہی تھی ۱۱۲۵ھ مین دہلی مین وفات پائی، خلفا مین حضرت برہان الدین خدا نما اور میر اسد اللہ بزرگ ہوئے،

امیر اسد اللہؒ

سید اسد اللہ ارکان شاہی مین تھے، خوابگاہ خاص کا اہتمام آپ کے سپرد تھا، اسی خوابگاہ مین آپ کے باطن کی آنکھین کھلین، جب یہ راز فاش ہوا تو منصب شاہی

شاہی سے کنارہ کش ہو کر حضرت شاہ فرہاد کے حلقہ مین آکر بیٹھ گئے، اور آخر وہان سے مرد کامل بنکر اٹھے، ۱۱۴۷ھ مین وفات پائی،

آپکے خلفا مین حضرت مخدوم شاہ محمد منعم قدس سرہ العزیز نہایت ممتاز ہوئے اور جن کی نسبت سے ابو العلائی سلسلہ کی ایک نئی شاخ منعمی پھوٹی،

مخدوم شاہ محمد منعمؒ آپ شیخو پورہ ضلع مونگیر (بہار) کے ایک قریہ بچنا کے باشندہ تھے، ظاہری اور باطنی دونون تعلیمی سلسلے دار العلوم دہلی مین مکمل ہوئے، ظاہری تعلیم کے بعد حضرت شاہ فرہاد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ مین بیٹھے اور ان کی وفات کے بعد میر سید اسد اللہ کی صحبت مین مدارج سلوک کی تکمیل کی کہتے ہین کہ جامع مسجد دہلی کے ملحقہ مدرسہ مین پچاس برس قیام پذیر رہے، اور پھر پٹنہ عظیم آباد آکر تکیہ کی مسجد مین اپنا سجادہ بچھایا، یہی حضرت شاہ محمد منعمؒ ہین جن کے حلقۂ ارادت مین حضرت شاہ رکن الدین عشق عظیم آباد آکر داخل ہوئے، سلسلہ یہ تھا کہ حضرت شاہ محمد منعم حضرت عشق کے نانا شاہ فرہاد کے صحبت یافتہ یعنی ان کی خاندانی وراثت کے امین تھے، اس بنا پر حضرت مخدوم منعم پاک سے بڑھکر حضرت عشق کی رہنمائی کا کوئی دوسرا حقدار نہ تھا، اور یہی وہ مسجد تھی جس کو حضرت عشق کے لئے چھوڑ کر مخدوم منعم پاک ملا متین کی مسجد مین چلے گئے تھے،

حضرت مخدوم محمد منعم نے ۱۱۸۵ھ مین وفات پائی، خلفا مین مخدوم شاہ حسن علی عظیم آبادی، حضرت مولانا حسن رضا متوطن رائے پورہ (ضلع پٹنہ) صوفی شاہ محمد دائم

(ڈھاکہ) حضرت شاہ رکن الدین عشق نامور ہوے،

شاہ رکن الدین عشق اور ان کے ہم سلسلہ

حضرت عشق نے حضرت مخدوم منعم پاک سے ابوالعلائی طریقہ کی تعلیم اور فیض حاصل کیا اور ایک عالم کو اس سے سیراب کیا اور بقول تذکرہ نویسون کے معتقدون کے ہجوم اور مریدون کی کثرت سے فقیری مین بادشاہی کی، آپکے ہم پیر مخدوم شاہ حسن علی سے بھی جنھون نے سنہ ۱۲۲۴ھ مین وفات پائی اور جن کا مزار عظیم آباد محلہ خواجہ کلان گھاٹ مین ہے، یہ فیض عام ہوا، ان کے خلیفہ اور جانشین مخدوم سید مظہر ولی عرف شاہ یحییٰ علی ہین جن کے بزرگون کا وطن تاربیگہ (بہار سے چار کوس شمال کی طرف دیہہ تھا نو ان کے پاس بہ یادگار سلف آبادی (اب ویرانہ ہے) تھا اور نانہال بہار محلہ چاند پورہ تھا، اور مدفن صفی پور خسرو پور اسٹیشن کے پاس دریا کے کنارے ہے ۱۲۶۴ھ مین وفات پائی،

مخدوم شاہ یحییٰ کے خلفا شاہ اشرف علی واسطی زیدی (نوادہ) شاہ جمال علی نجفی (شیخپورہ) مولانا شاہ ولایت علی (اسلام پور) اور مولانا امیر الحسن (محلہ دوندی بازار پٹنہ) ہوے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس سلسلۂ عالیہ کا دائرہ کس طرح اس صوبہ کے گاؤن گاؤن کو گھیرے ہے،

شاہ رکن الدین عشق کا اردو کلیات اور اس کا خلاصہ

اوپر کی سطرون سے ظاہر ہے کہ حضرت عشق محض شاعر نہ تھے بلکہ حضرت مرزا مظہر جانجانان اور حضرت خواجہ میر درد کی طرح وہ ظاہر و باطن اور حال وقال کے جامع تھے، ددہر

سخنور بزرگون کی طرح ان کی نسبت بھی کہنا چاہئیے کہ "شاعری دون مرتبہ اوست"

حضرت عشق کا اردو کلیات ۰۰، صفحون کو محیط ہے، اس انتخاب مین مؤلف نے یہ کوشش کی ہے کہ اس سمندر کو ساٹھ صفحون کے کوزہ مین بند کر دین، یہ کام جتنا مشکل ہے ظاہر ہے، اس ناقدری کے زمانہ مین سات سو صفحون کی اشاعت کیلئے ایک بڑا سرمایہ چاہئیے، اور دنیا کا حال کم وبیش اب بھی وہی ہے جو حضرت سعدی کے زمانہ مین تھا، ؎

کریمان را بدست اندر درم نیست

خداوندانِ نعمت را کرم نیست

ایسی حالت مین سات سو صفحون کا یہ ساٹھ صفحون مین انتخاب شائع کرنا بھی اردو پر احسان ہے، اور قدیم اردو کے ذخیرہ مین ایک قابلِ قدر اضافہ ہے، شاید اس انتخاب کو پڑھ کر کوئی قدردان پورے کلیات کی اشاعت کی ہمت کر جائے

اس انتخاب کے مقدمہ مین مؤلف نے شرح وبسط کے ساتھ حضرت عشق کے کلام پر ہر حیثیت سے بحث کی ہے، اور جہان تک مواد اور مضامین نے اجازت دی ہے بحث کے ہر گوشہ کے احاطہ کی کوشش کی ہی، حضرت عشق کے کلام کا عام انداز وہی ہے جو حضرت مظہر اور خواجہ درد کا ہے، کہین کہین زمین، بحر اور قافیہ کا بھی اتحاد ہے، حضرت خواجہ درد کی مشہور غزل ؎

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

پر عشق کی غزل ہے، ع

چین ہی اس دلِ بیتاب کا منظور نہ تھا　　ورنہ آنا ترا مجھ پاس تو کچھ دور نہ تھا
کچھ نئی طرز ملاقات نکالی اب تو　　ورنہ آگے ترے ملنے کا یہ دستور نہ تھا
دیر و کعبہ مین سنا گوش سے دل کے ہم نے　　عشق کے ذکر سوا اور تو مذکور نہ تھا

صوفیانہ مضامین کی آمد وہی ہے جو درد مین ہے، مگر درد کا مختصر سا بیانِ غم یعنی ان کا دو جزو کا مختصر دیوان، عشق کے ۵۰ جزو کی شرحِ الم یعنی ان کے کلیات کیساتھ سمندر اور قطرہ کی نسبت رکھتا ہے،

صوفیانہ کلام | حضرت عشق کے صوفیانہ کلام کا نمونہ اس انتخاب (یادگارِ عشق) اور میر حسن اور گلشن ہند سے ناظرین کے پیش کش ہے،

دیدۂ دل جو کرکے وا دیکھا　　حرم و دیر مین خدا دیکھا
اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم　　خاک مین آپ کو ملا دیکھا
آشنا تجھ سے ہو نہ ہو کوئی　　پہ تجھے سب سے آشنا دیکھا

میری آنکھون سے وہ جدا بھی نہین　　گو وہ مجھ پہ نظر نہین رکھتا

خانمان کرچکا ہون مین برباد　　اس پہ وہ میرے گھر نہین آتا

حرم مین نام سنا، دیر مین نشان دیکھا — سوائے تیرے نہ دیکھا غرض جہان دیکھا
اسی کا آئینہ ہژدہ ہزار عالم ہے — دوانے کیا کہون تجھ سے کہان کہان دیکھا
نہ عزم وادیِ ایمن نہ طور کا ہے قصد — جو کچھ کہ دیکھنا تھا دل مین سب عیان دیکھا

عرش تا فرش سیر کر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
چشمِ تحقیق سے جہان دیکھا — کافر ہون تجھ سوا اگر دیکھا

کونین مین جو کچھ ہے سو اس مین سمایا ہے — کب عرش سے چھوٹا ہے کاشانہ محبت کا
اس کافر بے دین کی کیا بات کہے کوئی — کعبہ کو بنا ڈالا بتخانہ محبت کا

وہ دل جو بو علی کو بتاتا تھا درسِ عقل — شرحِ کتابِ عشق سے ناچار ہو گیا

آزادگی کا قیدی محتاج ہے نفس کا — سو دام اس کی خاطر ہے کشمکش نفس کا

کونین سے کب کام ہے دیوانے کو تیرے — آرام نہ ہوا اسکو تجھے دیکھے نہ جبتک

کہنے کو ادھر اودھر گئے ہم — تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

مدت سے ہین اپنی جستجو مین ہین آپسے اس قدر گئے ہم
تب سمجھے کہ کیا ہے کفر و اسلام ان دونون سی جب گذر گئے ہم
تھا کعبہ و دیر سے کسے کام مقصود تھا تو جدھر گئے ہم
جز عشق نہ سمجھے کفر و دین کو طرفین سے بے خبر گئے ہم

نہ تبخانہ کو جاتے ہین نہ کعبہ مین بھٹکتے ہین جہان تم پانون رکھتے ہو وہان ہم سر ٹیکتے ہین

ہستی چھپی عدم مین ہوئی نیستی نمود دھوکا نہ کھا کہ مخفی ہے دریا سحاب مین

یار چارون طرف نمایان ہے عشق تو اب کدھر بھٹکتا ہے

ہستی ہے ایک عشق کی پیدا ہو یا نہان ہم تم کا ذکر کیا ہے، وجود و عدم غلط

وابستہ تری ذات سے بستی ہی جہان کی جب تو نہ ہوا خلق مین ویرانہ کہین گے

کیونکر ملین گے تجھ سی جبتک عدم نہ ہونگے اس وقت تم ہی تم ہو جسوقت ہم نہ ہونگے

دل ساجگر جو رکھے سواس سی دو دیدہ ہو | منھ دیکھو آئینے کا جب اُسکے روبرو ہو

عالم مین اگر طرۂ محبوب نہ ہوتا | یہ سلسلۂ نظم جہان خوب نہ ہوتا

عاشقانہ کلام | حضرت عشق کے عاشقانہ کلام کی اصلی خوبی، سادگی، لطافت، جوشِ بیان اور روانی ہے، مصرعون مین اتنی برجستگی ہوتی ہے کہ ہر شعر خوبی وفصاحت کی ایک صاف ومصفا سلسبیل ہے، نہ پیچیدگی ہے، نہ اشکال ہے، نہ ثقلِ ترکیب ہے، ساتھ ہی فصاحت و بلاغت کی یہ جوئے روان، ابتذال، اور مضامینِ پامال کے خس و خاشاک سے پاک ہے، ے

کچھ دلِ سنگ مین اثر نہ کیا | تجھ کو اے آہ ہم نے دیکھ لیا

کیا پوچھتے ہو مجھ سی کہ کیون تو نے رُو دیا | دل نے کیا تھا جمع سو آنکھون نے کھو دیا

آگے میان نصیب ہے سرسبز ہو نہ ہو | دل کی زمین مین تخمِ محبت تو بو دیا

دل اور جان دینے مین تقصیر کچھ نہ کی | عشق اس نے جو طلب کیا نا چاسو دیا

ایک دن بھی خیالِ دلداری | نہ کیا آہ تو نے پر نہ کیا

کونسی رات خونِ دل سے عشق | دامن و آستین کو تر نہ کیا

عشق یا وحشی بچیرا اے یارو — آگے آتا تھا اب نہین آتا

***

جستجو مین مری نہ حیران ہو — مثل عنقا مین گھر نہین رکھتا
کون ہون مین کہان ہون کیسا ہون — اتنی بھی مین خبر نہین رکھتا

***

جو کیا سو خیال خام پڑا — آہ دل تجھ کو کس سے کام پڑا

***

بیمار تیری چشم کا اچھا ابھی تو تھا — کچھ دیکھتے ہی دیکھتے آنکھین بدل گیا
دیکھا نہ آفتاب کبھی تیرے روبرو — جب ہو گیا وہ سامنے سایہ سا ڈھل گیا

***

دل کو ناحق بھی جو دکھائے گا — اس کا بدلہ خدا سے پائے گا

***

جاتا ہے فلک کے پار نالہ — یہ تیر بھی کارگر نہ ہو گا
فریاد سنی نہ عشق کی رات — شاید کہ وہ اپنے گھر نہ ہو گا

***

دل کے ہاتھون خراب پھرتا ہون — اس مین کچھ اختیار ہے میرا
جس سے ہوتی ہے آئینے کو جلا — اے صبا وہ غبار ہے میرا

اس نے رو رو کے اس کو رام کیا — واہ آنکھون نے ایک کام کیا

بلا سے شاد یا ناشاد رکھنا — بہر صورت ہمین تو شاد رکھنا
بسا ہے دل مین آ وہ خانہ ویران — خداوندا اُسے آباد رکھنا

شام سے صبح، صبح سے تا شام — راہ پر بیٹھ انتظار کیا
جب نہ آیا وہ رشکِ مہر و ماہ — اور دل نے بھی بیقرار کیا

اپنی آنکھون سے پوچھ اے خوش چشم — مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا

حشر برپا کرین گے دیوانے — ان کی زنجیر مت ہلائیگا

دیا جو آخری دیدار تو نے — جزاک اللہ فی الدارین خیرا

تم عبث اب ڈھونڈتے ہو آشیانِ عندلیب
مشتِ پر گلشن مین باقی ہے نشانِ عندلیب

ممکن نہین جی بچے سحر تک　　　باقی ہے ابھی تو دو پہر رات

دیکھ اس گلعذار کی صورت　　　آئینہ ہے بہار کی صورت

جاتے ہوے دم کو کوئی روکے رہے کب تک
آنا ہے تو آجا کہ نفس باقی ہے اب تک

اسی حسرت مین نکلیگا یہ دم تک　　　نہ پہنچا سر مرا تیرے قدم تک

لکھون کس طرح جو گذرے ہے دل پر　　　وہ مضمون آبھی سکتا ہے قلم تک

دن کو دیکھی تھی اس پری کی جھلک　　　نہ لگی رات کو پلک سے پلک

ملتے ہین نیک و بد سے پہ آلودگی نہین　　　مانند نور اٹھتے ہین ہر شی سے پاک ہم

زلف نے جس تئین دکھائی شام　　　پھر اسے دوسری نہ آئی شام

جان کو بے قرار پاتے ہین
دل کو بے اختیار پاتے ہین

چشم وحدت سی دیکھتے ہین جو
ایک ہی کو ہزار پاتے ہین

تجھے کیا کہین کیا صنم جانتے ہین
خدا جانتا ہے جو ہم جانتے ہین

شکوہ نہ کچھ رقیب سے مجھ کو نہ یار سے
مین اپنے دل کے ہاتھ سی آفت رسیدہ ہون

ازبسکہ اشتیاق ہی دیدار کا مجھے
مانند آئینہ کے سراپا مین دیدہ ہون

نام پر تیرے جی کو کھوتے ہین
ایسے عاشق بھی اور ہوتے ہین

ابتدا ہی سے یون چلی آئی
ایک ہنستے ہین ایک روتے ہین

دل کا آئینہ سامنے رکھ کر
یار کو بے حجاب کرتا ہون

ایک ہی وہ نظر مین آتا ہے
سو طرح سے حساب کرتا ہون

دل سے نکل گئے تھے درِ چشم تک جو اشک
پھر آ گئے جس سی پوچھا کہا کچھ خبر نہین

تم دیکھتے عبث ہو مرے جیب و آستین
وہ کونسی زمین ہی جو آنسو سے تر نہین

یہ حسن یہ ادا یہ نگاہیں، یہ گرمیان — نامِ خدا کہان ہین کسی طرح وارین

نایاب آنسوؤن کے ہین موتی جہان مین — وہ دُر نہین ہین یہ جو ملین ہر دکان مین

نذر کو اور کچھ نہ تھا مجھ پاس — دلِ بے اختیار لایا ہون

ایک دو باتین جو ہون کوئی سنے — دل کی خواہش دم بدم کس سے کہین

دمبدم تجھکو یاد کرتے ہین — دلِ غمگین کو شاد کرتے ہین

ناشاد جو گئے ہین انھین شاد کیجیو — یعنی کہ بعد مرگ ہمین یاد کیجیو

وہ سوارِ سمند ہوتا ہے — پھر یہ فتنہ بلند ہوتا ہے
عشق کا شعر اس کو خوش آئے — جو کوئی دردمند ہوتا ہے

کس کی بستی ہے کون بستا ہی — کربلا جس کے گھر کا رستا ہی

لختِ دل سوئے دیدہ آتا ہے
ٹک کو مت! نورِ دیدہ آتا ہے
دل دھڑکتا ہے آج کچھ لیٹے
کوئی خنجر کشیدہ آتا ہے

(۸)

اوروں کا جگر یار جو تیروں سے سئے ہے
یہ عاشقِ جان باختہ کس دن کیلئے ہے

(۹)

بولئے تو زبان جل جائے
چپکے رہئے تو جان جل جائے

(۱۰)

تصور سے ترے دل شاد رکھے
خدا اس گھر کے تئیں آباد رکھے

کلّیات کا زیرِ نظر نسخہ

معلوم ہوتا ہے کہ کلّیات کا یہ زیرِ نظر نسخہ بار بار کا اصلاح پایا ہوا ہے یہی سبب ہے کہ حضرت عشق کے کلام کا جو انتخاب میر حسن اور گلشنِ ہند میں ہے، اُن میں اور کلیات کے نسخہ میں تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے، مثلاً پہلا ہی شعر میر حسن کے تذکرہ میں اس طرح ہے، ؎

آہِ جانسوز کو بسم اللہِ دیوان کیا
عشق نے دیکھیو پہلے ہی طوفان کیا

کلیات میں یہ شعر یوں ہے، ؎

آہِ جانسوز کو سرِ دفترِ دیوان کیا
عشق نے دیکھیو پہلے ہی طوفان کیا

کہیں کلیات کا نسخہ یا اس کی یہ نقل غلط معلوم ہوتی ہے اس انتخاب میں (صفحہ ۱۲) ایک شعر ہے، ؎

تا جان نہو عدول حکمی   تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

گلشنِ ہند مین یہ شعر اس طرح ہے، ؎

تا جان نہوئی عدول حکمی   تو نے کہا مر تو مر گئے ہم

یہی صحیح ہے، جان جانے کا صیغہ امر نہین ہے، بلکہ جان فارسی لفظ بمعنی روح اور زندگی ہے یعنی جان تک کے معاملہ مین تیرے حکم سے سرتابی نہ کی، یا یہ کہ جبتک جان مین جان رہی عدول حکمی نہ ہوئی، تو نے مرنے کا حکم دیا تو ہم مر گئے،

کتبخانۂ الاصلاح، دیسنہ، پٹنہ،

۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء

شعلۂ طور

تعارف

"نو وارد شاعر"

اللہ اکبر! بارہ چودہ برس گذرتے بھی کچھ دیر لگتی ہے، بڑی لڑائی کی ہولناکیان ختم ہو چکی تھین مگر اس کے آثار اس وقت تک نمایان تھے،

ایک صاحب عینکون کے ایجنٹ کی حیثیت سے اکثر سیاسی قیدیون اور نظربندون سے ملنے جایا کرتے تھے، اور ان مین سے ایک کی خبرین دوسرے کو پہنچایا کرتے تھے، اسی سلسلہ مین وہ ایک طرف ایک قیدی کے پاس رانچی اور دوسری طرف ایک آزاد کے پاس اعظم گڈہ آیا کرتے تھے، اور ایک کو دوسرے کی نسبت معلومات دیا کرتے تھے اور اس حیثیت سے غالبًا کسی سیاسی حسن ظن کی بنا پر وہ اکثر آمد و رفت کی نوازش فرمایا کرتے تھے، ایک دفعہ جب وہ آئے تو اپنے ساتھ ایک نیا تحفہ لائے یعنی ایک شاعر!

اعظم گڈہ ہے تو ایک چھوٹا سا شہر اور دور افتادہ بھی مگر لوگ کبھی کبھی افتان و خیزان یہان پہنچ ہی جاتے ہین، اور کچھ قدردان بھی ان کو یہان مل جاتے ہین،

خصوصًا مولانا سہیل اور مرزا احسان احمد جیسے قدر شناس جوہری بھی پورب کے اس اجڑے دیار مین آباد ہین، اور ساکنانِ شبلی منزل کا کیا کہنا کہ وہ تو یہان کے اندھون مین راجہ بنے بیٹھے ہین،

یہ نیا تحفہ ایک نوجوان شاعر تھا، ہمہ صفت شاعر، پریشان مو، پریشان حال، پریشان دل، ہمارے قدیمی عنایت فرمانے اپنے دوست کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ یہ شاعر بھی ہین، اس وقت حاضرین مین مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، اور دوسرے کمرے مین جہان آواز جا سکتی تھی، پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی تھے، اوران مین سے ہرایک اپنی اپنی جگہ پر سخن فہمی کا مدعی اور موجودہ شعرار کے ہرعیب وہنر سے واقف، ان عنایت فرماکے اس تعارف نے گدگدی پیدا کی اور جی چاہا کہ شاعر سے کچھ سنا جائے اوران کے اس دعوائے سخنوری کا امتحان لیا جائے سب کی نظرین ایک خاص نگاہِ تبسم کے ساتھ شاعر کے چہرے کی طرف اٹھین، مگر اس نے اس ماحول سے بے پروا ہوکر ایک عجیب درد انگیز ترنم، مست لہجے اور سرشار انداز مین ایک غزل کا ترانہ چھیڑا، ایک دو شعر پڑھے تھے کہ سب کو سنبھل جانا پڑا، ذہن کی رَو کو ظرافت سے متانت کی طرف پھیرنا پڑا، تبسم کی نگاہ مین تحیر پیدا ہوا، سامعین کے لبون مین لرزش پیدا ہوئی، لرزش آوازین، اور آواز احسنت و مرحبا کی صدائے تحسین مین بدل گئی، اب تو شاعر کی نسبت جلدی جلدی اپنی رائین بدلنی پڑین اور

انکار رفتہ رفتہ مگر تیزی کے ساتھ اعتراف کی صورت مین بدلنے لگا، اور تھوڑی دیر مین "شبلی منزل" کے چھوٹے سے ہال مین شاعر کے توجہ آفرین ترنم کے سوا ہر آواز ساکت اور ہر جنبش ساکن تھی،

اختتام محفل پر یہ صاحب اٹھ کر گئے تو ہر ایک نے اپنی اپنی حیرت کا اظہار کیا، جو لوگ ہمارے پروفیسر عبدالباری (عثمانیہ یونیورسٹی) کو جانتے ہین، وہ جانتے ہین کہ وہ کس قدر مشکل پسند اور کس دشواری سے کسی پر ایمان لانے والے ہین، انھون نے فرمایا کہ "صاحب اس نے کمال کیا ہے" اب شہر مین اس شاعر کی شہرت ہوئی کسی کو اس صاحب کمال کے کمال پر یقین آگیا تھا، اور کوئی اب تک منکر تھا، اس پر تو بہرحال سب کو یقین تھا کہ یہ جو کچھ پیش کرتا ہے وہ یقیناً انمول موتی ہین، مگر ان گوہر ہاے شاہوار کا مالک بھی یہی فقیر دلق مرقع ہے، اس مین بہتون کو شک تھا،

آخر اس کے امتحان کا وقت آگیا، ایک مشاعرہ کا میدان ترتیب پایا، بڑے بڑے پہلوانانِ سخن جو بارہا علی گڑھ کے معرکے جیتے ہوئے تھے، پنجہ کشی اور زور آزمائی کیلیے قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھے اور زورِ سخن کے نئے نئے کرتب دکھائے آخر مین وہ لاغر اندام تو وارد پہلوانی کے ہر گر سے ناواقف، نمایش اور داد طلبی کی ہر ادا سے بے نیاز، دوسرون کو متاثر کرنے کے لئے نہین، بلکہ خود سراپا اثر بنکر جب سامنے آیا تو مصرِ سخن کے سب جادوگر بیک دفعہ چلا اٹھے کہ آمنّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسیٰ یہ کلیمِ سخن کون تھا؟ جگر مرادآبادی، پھر کیا تھا حریفون

نے دوست سے بڑھ کر دوست اس کو بنایا، مشاعرے پر مشاعرے ہونے لگے،
شاعر ایک تھا مگر اس کے اثر نے ہر خاموش کو شاعر اور ہر شاعر کو خاموش ہو جانے
پر مجبور کر دیا، آخر اعظم گڈھ اور شبلی منزل کی یہی تحسین و آفرین تھی جو داغِ جگر کی دلپذیر
شکل مین ملک کے سامنے آئی اور سب نے جگر کو جگر جانا،

جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر، ان کا طرز ابناے زمانہ کے
طرز سے الگ، لکھنؤ اور دہلی دونون حکومتون سے آزاد، موزون الفاظ اور دلکش
ترکیبون کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آورد سے پاک،
طلسم الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا، موجودہ شعرا مین
اس کے اس وصف مین اگر کوئی شریک ہے تو وہ فانی ہے، سادگی اور بے تکلفی
حسرت کی بھی خصوصیت ہے، مگر اس کی سادگی مین کشش ہو، بناؤ نہین، جگر کا
کمال یہ ہے کہ سادگی اور تکلف کی ہر شان سے بے نیازی کے باوجود، اس مین
بیحد فطری آرایش اور از خود نمایشِ حسن ہے،

معنوی لحاظ سے جگر جہان کھڑا ہے، تنہا کھڑا ہے، سرمستی اور سرشاری تاثر اور
دل گدازی اس کے ہر مصرع کی جان ہے، اس کا یہ اثر اس لئے نہین کہ واعظین
خوش مقال کی طرح وہ مجلس کو رولانے کے لئے شہداے کربلا کے دامن مین
پناہ لے، یا آجکل کے بعض طالبِ اثر شاعرون کی طرح نہین، جو لاش و مدفن و
سورۂ یسین و نوحہ بین و میت و نزع وغیرہ کا ایک تیر کمند صفت پھینک کر بالقصد

مرغِ اثر کو شکار کرنا چاہتے ہین اور آخر لسان الغیب حافظ کا طعنہ سنتے ہین،

برو این دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جگر کی شاعری کے معنوی خیالات بہت مختصر ہین وہ اُنھین الٹ پلٹ کر دہراتے رہتے ہین، مگر وہ جب کہتے ہین تو سننے والون کو وہ بات نئی معلوم ہوتی ہے، ہر فطری شاعر کا رنگِ مذاق یہی ہوتا ہے کیونکہ وہ وہی کہتا ہے جو محسوس کرتا ہے، وہ نہین کہتا جو دوسرے محسوس کرتے ہین اور جس طرح ہر شخص کا فطری رنگِ طبیعت خاص ہوتا ہے کہ وہی اس سے تراوش کرتا ہے اسی طرح شاعر کا فطری رنگ بھی ایک ہوگا جو ہر جگہ وہ یکسان ہی ظاہر ہوگا، البتہ وہ لوگ جو اپنے دل کی نہین، دوسرون کی کہتے ہین، وہ ہر رنگِ محفل اور ہر ذوقِ دل کی نمایندگی کرتے ہین، مگر وہ اس لحاظ سے شاعر نہین بلکہ ایک پیشہ ور خطیب و واعظ ہین،

فارسی غزل کا بہترین نمونہ حافظ کا کلام ہے مگر اس کو ہر صاحبِ نظر محسوس کرتا ہوگا کہ حافظ کے خیالات مین نیرنگی نہین طرزِ بیان مین نیرنگی ہے، وہی چند بندھے ہوئے خیال ہین جو حافظ کی ہر غزل مین ظاہر ہوتے ہین، مگر ہر غزل اپنے طریقِ اظہار، اور طرزِ تعبیر مین الگ ہے، ایک ہی خیال سو سو طرح اس مین ادا ہوتا ہے، مگر ہر جگہ اس کی شان نرالی اور طرز نئی ہے یہی حال خیام کی رباعیون کا ہے، چند خیالات ہین جو ہر دفعہ نیا قالب بدل کر اور نئی شکل مین جلوہ گر ہو کر سامنے آتے ہین

بات یہ ہے کہ یہ وہ شاعر ہین جو الفاظ و تراکیب کے حسن کے باوجود صرف ان چیزون کو کمال نہین جانتے، بلکہ ان کے اندر چند حقیقتین مرکوز رہتی ہین، وہی رہ رہ کر ابھرتی، اور نالۂ موزون کی صورت اختیار کرتی ہین، جگر کی شاعری مین نہ زلف و شانہ ہے، نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالاے بام، نہ شکایت منظر عام، نہ اسکے کاشانۂ خیال مین چشمہاے بسمل کی آئینہ بندی ہے، نہ اس کے محبوب کے ہاتھون مین قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ مین شہدا کے دل و جگر کی گلکاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی مین کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر ہے، وہ اس کے حجابات کو اپنے رعشہ دار ہاتھون سے بار بار اٹھا دینا چاہتا ہے مگر نہین اٹھا سکتا، وہ جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے، مگر نہین دیکھ سکتا، اس کی تمنا کی نگھین اسکو کبھی بے حجاب دکھا دیتی ہین تو وہ ہاتھ بڑھا کر چھونا چاہتا ہے مگر وہ تصویر نگاہون سے غائب ہوجاتی ہے،

جگر مست ازل ہے، اس کا دل سرشار الست ہے، وہ محبت کا متوالا ہے، اور عشق حقیقی کا جویا، وہ مجاز کی راہ سے حقیقت کی منزل تک اور بتخانہ کی گلی سے کعبہ کی شاہراہ کو اور خمخانہ کے بادۂ کیف سے خود فراموش ہو کر بزم ساقی کوثر تک پہنچنا چاہتا ہے،

جگر بہ ظاہر سرشار، مگر درحقیقت بیدار ہے، اس کی آنکھین پرخمار، مگر اس کا دل ہشیار ہے، اور کیا عجب کہ خود جگر کو بھی اپنے دل کی خبر نہ ہو، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے کلام مین اثر نہ ہو،

دوستان عیب نظر بازی حافظ مکنید　　　　که من او را ز محبان خدا می بینم

شبلی منزل اعظم گڈھ، ۷ مئی ۱۹۳۲ء

خمستان

کشمیر کے دستِ فیض نے نہ صرف خطۂ کشمیر کو رشکِ گلزار بنایا ہے، بلکہ جہان جہان بہار و خزان کے انقلابات نے اس کی شاخون اور ڈالیون کو اڑا کر پہنچا دیا، ہر جگہ ایک نیا چمن لگا دیا، اور نیا گلشن کھلا دیا، پنجاب کی ہمسایہ زمین قدرۃً اس کا زیادہ حق رکھتی تھی، اور اسی لئے وہین کے سرسبز و شاداب قطعون نے سب سے زیادہ ان "خانہ برانداز ان چمن" کو اپنے آغوش مین لے کر ان کی آبیاری کی، اور پورے پنجاب کو اپنی نکہت بیزیون سے گلکدہ بنا دیا،

پنجاب مین سیالکوٹ کشمیر سے قریب تر ہے، اور یون بھی علم و ادب اور فضل و کمال کا ہمیشہ سے گہوارہ ہے، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی جن کو دو دفعہ شاہجہان کی قدردانیون نے چاندی مین تلوایا اور ہند سے لے کر روم تک ان کی تصنیفات نے اپنا سکہ بٹھایا، وہ اسی خوش سواد شہر کی خاک سے اٹھے تھے، اور اس عصر جدید مین اقبال سا فلسفی اور شاعر پیدا کرنے پر اس کو بجا طور سے فخر و ناز ہے، اور یہ مرغ خوشنوا ان بھی اسی "ملک جنت نظیر" کے باغون سے اڑ کر یہان تک پہنچا ہے،

اس "خمستان" کا ساقی بھی اسی میکدہ کا "صہبائی" ہے۔ ان کے والد ماجد مولوی احمد دین صاحب پال جماعت اہل حدیث مین ایک ممتاز اور فاضل بزرگ ہین ان ہی کی مذہبی آغوش مین عبدالسمیع پال اثر صہبائی نے ۲۸ دسمبر ۱۹۰۱ئہ کو آنکھین کھولین تعلیم کی ابتدائی منزلین درجہ بدرجہ طے ہوکر ایم اے پر جاکر ختم ہوئین اور فلسفہ کی سند یونیورسٹی سے حاصل کی،

صہبائی نے گو اہلحدیث گھرانے مین ولادت پائی، تاہم شاعری کی دولت سے ان کو محرومی نہین ہوئی، خدا جانے ان دو واقعون نے کیونکر شہرت پائی ہے کہ شیعہ حافظ، اور اہلحدیث شاعر نہین ہوتے، اتنا تو سچ ہے کہ اہلحدیث مین حکیم مومن کے سوا کوئی دوسرا مشہور اردو شاعر نہین ہوا، حکیم مومن اعلانی غیر مقلد اور اہلحدیث مین ہین، صاف کہتے ہین، ؎

ارباب حدیث کا مین فرمانبر ہون	تقلید کے منکرون کا سرِ دفتر ہون
مقبول ہے روایت ائمہ نہ قیاس	یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہون

خالص ہون محمدی مرا دین اسلام	گو رائے صواب ہو، نہین مجھ کو کام
تقلید کی ٹھہری تو بنون گا شیعہ	کس واسطے چھوڑ دیجے افضل ترا امام

کہتے ہین ہمارے مخدوم مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری ایڈیٹر اہلحدیث نے بھی اس شہرت کو ترقی دینے مین عملاً پوری کوشش کی ہے لیکن میرا جواب یہ ہے کہ

چونکہ وہ متبع سنّت ہین اس لئے صحیح شعر کے نہ پڑھنے مین بھی سنت سنیہ کی تقلید کرتے ہین۔ ما علّمناہ الشعر وما ینبغی لہ،

بہر حال پدر اگر نتواند پسر تمام کند، نوجوان صہبائی نے بڑے بوڑھون کی عزت رکھی ہے، اور اپنی شاعرانہ خداداد طبیعت سے بے بنیاد شہرت کی بیخ کنی کی ہے،

صہبائی کے فطری شاعر ہونے مین کلام نہین، ان کا دل عشق و محبت سے لبریز اور نالہ و شیون سے معمور ہے، چند سال ہوے کہ ان کی رفیقۂ حیات نے انکو والئی الوداع کہا، اس حادثہ نے ان کو اور نازک دل شاعر بنا دیا ہے، جہان ذرا ٹھیس لگی اور بلبلا اٹھے، اسی لئے ان کی شاعری مین سرور و شادمانی نہین، بلکہ حزن و ملال ہے، اور اس پر مزید یہ کہ ان کے غم و افسوس کی آنکھون مین آنسو نہین، بلکہ صبر و سکون اور تسلی و تعزیت کے غمگین فلسفیانہ اشارات ہین، اور ان کی غزلون مین محبت کے اثرات اور عشق کے جذبات کے بجائے عشق و محبت کے حکیمانہ رموز و اسرار فاش ہوتے ہین،

صہبائی کا یہ مجموعۂ کلام تجلیات، سمن زار، جام صہبائی، راحت کدہ اور ستارے پانچ عنوانون پر منقسم ہے، تجلیات مین غزلین، سمن زار مین مختلف عنوانون پر نظمین، جام صہبائی مین رباعیات، راحت کدہ مین مرثیہ، سوز و گداز اور فناے عالم کے تاثرات ہین، اور ستارے مین ایک ایک شعر کی مختلف فردین ہین،

شاعر کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اس کے دل کے ٹکڑے ہوتے ہین اور

بوڑھے سعدی کے بقول "ہرکس را فرزند خویش بجمال و عقل خویش بکمال می نماید" ہر شاعر کو اپنے معنوی فرزندون سے اس قدر الفت و محبت ہوتی ہے کہ وہ ان مین سے ایک کو بھی اپنے قلم سے مٹانے مین ایک فرزند کے قتل سے کم غم محسوس نہین کرتا، تاہم ایک دانشمند باپ کا فرض یہ ہے کہ اپنی اولاد کے حسن و قبح سے کما حقہ واقف ہو، چنانچہ دانشمند صہبائی نے اپنے کلام کے وافر ذخیرہ سے انتخاب مین اپنے جانتے پوری "بیدردی" سے کام لیا ہے، اور ان ہی چیزون کو اس مین جگہ دی ہے، جو ان کے معیار تنقید پر پوری اتری ہین،

معلوم ہوگا کہ غالب نے اس سے بھی زیادہ "بیدردی" کا ثبوت دیا ہے اور اپنے پورے ضخیم اردو دیوان سے صرف چند جزو پر قناعت کی ہے اور پھر سنا ہے کہ اس قتل عام کے لئے انھون نے اپنے سنگدل دوستون کو متعین کیا تھا، اور خود دور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھتے رہے لیکن آخر ان ہی چند اوراق نے وہ مقبولیت پائی جو سات سات آٹھ آٹھ دیوانون کے مالکون کو بھی نصیب نہین،

میری رائے ہے کہ ہمارے نوجوان شاعرون کو اپنے کلام و دواوین کی اشاعت مین اس وقت تک تاخیر کرنی چاہئے جبتک کلام کی صحت کا ہر طرح یقین نہ ہو جائے، شراب جس قدر پرانی ہوتی ہے اتنی ہی پرجوش اور باکیف ہوتی ہے

پنجاب کے بہترین فارسی شاعر گرامی کا کلام ان کے مرنے کے بعد مرتب ہوا، پنجاب کے بہترین شاعر بلکہ استاد فن شاعر ظفر علیخان کا مجموعۂ کلام ہنوز منتشر و

پراگندہ ہے پنجاب بلکہ ہندوستان کے حکیم شاعر اقبال کا کلام ان کی کتنی عمرین جا کر مرتب ہوا، شاد عظیم آبادی کا پورا دیوان ان کے دوستون اور شاگردون کے پورے اصرار کے باوجود ان کے مرتے دم تک مرتب نہ ہو سکا، ہمارے کہنہ مشق استاد شاعر ریاض کا خمکدہ ابھی تک رندانِ سخن کی محفل مین نہین پہنچ سکا، مقصود یہ ہے کہ کلام کا فن کے معیار پر پورا اترنا اور بار بار کے حک و اصلاح کے بعد اس کا اغلاط سے پاک ہونا اس کے بغیر ممکن نہین کہ ہمارے نوجوان شاعر تھوڑا صبر و انتظار سے کام لین کہ اصل کمال استعجال شہرت نہین، بلکہ دوامِ شہرت ہے،

صہبائی کی عمر اس وقت ۳۲ برس کی ہے، بچپن سے شعر کہتے ہین، اور اپنے ہم وطن شاعر اقبال کے کلام کو ہمیشہ غور سے پڑھتے رہے ہین، اور خیام و حافظ کا کلام بھی ان کے مطالعہ مین رہا ہے، اور میر و غالب کی زبان اور طرز بیان سے بھی متاثر ہوئے ہین، میری رائے مین صہبائی مین استاد شاعر ہونے کے بجائے حکیم شاعر ہونے کی صلاحیت زیادہ موجود ہے، ان کے الفاظ مین شیرینی اور ترکیبون مین فارسیت کی پوری چاشنی اور ساتھ ہی ان کے خیالات کے بازوون مین معانی بلند تک پرواز کی پوری قوت ہے، اور ان کے تخیل کے پردہ مین فلسفہ کی حقیقت ہمیشہ مستور رہتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان کی غزلون سے ان کی رباعیان اور قطعات زیادہ باکیفیت، زیادہ پرمعنی اور زیادہ مؤثر ہین،

ہندوستان کے نوجوان شاعرون مین ایک عجیب بات یہ ہے کہ اُن کے

نزدیک شاعری صرف غزل گوئی کا نام ہے، جس شاعر کو دیکھئے کسی فرضی معشوق کے وہمی عشق مین مبتلا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ شاعری کے دیگر اصناف گویا ہماری نئی شاعری سے فنا ہو رہے ہین، پنجاب مین پورا استاد اور کامل الفن شاعر جس کی شاعرانہ پختگی، قدرتِ کلام اور بدیہہ گوئی کی مثال اس وقت نہ صرف پنجاب مین بلکہ ہندوستان مین نہین مل سکتی، وہ ظفر علی خان ہین، وہ ہر صنف پر یکسان قادر اور سخنوری کے ہر فن مین کامل ماہر ہین، ان کے سوا پنجاب کے صرف ایک نوجوان شاعر کا نام ہم کو معلوم ہے جس نے غزل گوئی کے کوچہ سے الگ اپنی شاہراہ نکالی ہے، اور وہ حفیظ جالندھری ہین، مثنوی کی بحر انھون نے اپنے شاہنامہ کے لئے اختیار کی ہے وہ گو قدما کی تقلید سے آزاد ہے مگر واقعات کے نظم کے لئے ان کو ایسی ہی لمبی بحر کی ضرورت تھی، اغلاط سے گو وہ خالی نہین، تاہم مین ان کے جوشِ بیان اور شاعری مین واقعہ نگاری کی قوت کا قائل ہون، اور مثنوی گوئی کے لئے اسی ملکۂ تامہ کی ضرورت ہے،

صہبائی کا امتیاز یہ ہے کہ انھون نے غزلین، قطعات، رباعیات، مثنویان سب کچھ کہی ہین، اور صرف غزل گوئی کے تنگ کوچہ مین مقید نہین، تاہم ہر شخص ہر صنفِ کلام پر یکسان قادر نہین ہوتا الا ماشاء اللہ، جیسے فارسی مین سعدی اور اردو مین سودا، حالی، اور ظفر علی خان، میرے خیال مین صہبائی کی فطری شاعرانہ استعداد کا اصل جلوہ گاہ ان کی رباعیات ہین، اور ان کو اسی حیثیت سے شاعرون

کی صف مین ممتاز جگہ دی جا سکتی ہے، رباعی گوئی کے لئے ضرورت ہے کہ زبان صاف اور شیرین ہو، ترکیبین چست اور روان ہون، اور پہلے مصرعہ سے بتدریج ترقی کر کے چوتھے مصرعہ مین پورا زور نمایان ہو جائے، یہ تو لفظی خوبیان ہین، معنوی خوبی یہ ہے کہ اس مین بلند حقائق اور معانی ادا ہون، صہبائی کی رباعیات مین یہ خوبیان بدرجۂ اتم پائی جاتی ہین، مثلاً

ممتاز ہے شانِ ارجمندی میری
ہے رو کشِ عرش، سر بلندی میری
سجدہ بھی کیا تو تیرے در پر یارب
نازان ہی بہت نیازمندی میری

اک نقطۂ موہوم ہی ہستی میری
لیکن ہی عجیب چیز مستی میری
چھوڑا جو خدا تو خود پرستی ہے اثر
جاتی ہی کہین یہ بت پرستی میری

افسانۂ درد ہی کہانی میری
عنوان ہی خونابہ فشانی میری!
ہون تیشہ بکف مثالِ فرہاد مدام
اک کوہِ گران ہی زندگانی میری!

بیگانۂ ہوش ہون کہ ہشیار ہون مین
ہون عالمِ خواب مین کہ بیدار ہون مین
فطرت کی ستم ظریفیان تو دیکھو!
مجبور کو وہم ہی کہ مختار ہون مین

ساغرِ عیش سے کبھی بھرتا ہون　　انجامِ بہار سے کبھی ڈرتا ہون
تقدیر یہی یون تو کارفرما ہے آخر　　محسوس یہ ہوتا ہے کہ مین کرتا ہون

کیا خوب کہا ہے:-

رو رو کے عبث شکوۂ بیداد نہ کر　　اے ننگِ جہان روح کو برباد نہ کر
ہمت سے ہے رزمگاہِ ہستی مین وقار　　کھا زخم پہ زخم، اور فریاد نہ کر

ہنگامۂ معصیت ہے ہنگامِ شباب　　پیری مین ہے آہِ سرد اور چشم پُرآب!
ہے خواب ہی خواب مین یہ ساری تگ و دو　　آغاز بھی خواب ہے، اور انجام بھی خواب

گل تیرا، نہ باغبان، نہ گلشن تیرا!　　تیرا ہی دلِ زار ہے دامن تیرا!
اغیار سے کیون ہے تجھکو امید و ہراس　　تیرا کوئی دوست ہے نہ دشمن تیرا

بہت ہی خوب ہے:-

شیرازۂ ہستی کو بکھرنا ہوگا　　ظاہر ہے کہ اک روز مرنا ہوگا
لیکن یہ سوال ہے ابھی لاینحل　　کیا ڈوب کے مجھکو پھر ابھرنا ہوگا

مدت ہوئی زخمِ دل پہ کھاتے کھاتے　　اے کاش! وہ پوچھ لیتے آتے جاتے
جب غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے آخر　　آتا ہے قرار دل کو آتے آتے

غزل مین بھی صہبائی کا مطلع نظر بلند ہے، میر کے اوزان اور رنگِ تغزل مین بھی کبھی کبھی کہتے ہین، اور کہین کہین خوب کہہ جاتے ہین:-

دنیا مین ہزارون خوشیان ہین، یہ دنیا عشرت خانہ ہے
اس بزم مین لیکن میرا بھی[1] اک درد بھرا افسانہ ہے

برگشتہ قسمت والون کا نے کعبہ نے بتخانہ ہے
ہان دو ہی سہارے ہین اُنکے یا موت ہی یا پیمانہ ہے

ہر شاخ جب اک مستانہ ہے ہر پھول جب اک پیمانہ ہے
توبہ! ایسے مین توبہ! جب فطرت خود میخانہ ہے

کچھ فرق نہین ہم مستون کے کاشانے اور میخانے مین
کاشانہ ہی میخانہ ہے، میخانہ ہی کاشانہ ہے

اسی غزل کے بعض شعر ایسے ہین جو گو فصیح ہین، مگر ذرا سے الٹ پھیر سے فصیح تر ہو جا سکتے ہین، مثلاً

گھنگھور گھٹائین آئی ہین، رحمت بن بن کر چھائی ہین
آباد ہوئے ہین مے خانے سجدے مین ہر اک مستانہ ہے

پہلا مصرعہ اس طرح ہوتا تو اور اچھا ہوتا: ع

گھنگھور گھٹائین آئی ہین اور رحمت بنکر چھائی ہین

---

[1] یہان "بھی" غالباً غلط چھپ گیا ہے۔ "بھی" کے بجائے شاید "ہی" ہوگا۔ "س"

اسی مین ایک اور شعر ہے،

کعبے مین یا بتخانے مین، یہ بات کہان میخانہ کی!

جو کام ہے آزادانہ ہے، جو بات ہے بے باکانہ ہے

پہلے مصرعہ کو یون کہا ہوتا تو صاف ہوتا: ع

کعبے اور بتخانے مین یہ بات کہان میخانہ کی

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے:۔

یون دادِ وفا کی ہوتی ہے، یون مرنے والے مرتے ہین

اک داغ سا شمعِ کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے!

شعر خوب ہے مگر اک ذرا سا تغیر اس کو کتنا صاف بنا سکتا ہے:۔

یون دادِ وفا کی ملتی ہے، یون مرنے والے مرتے ہین

اک داغ سی شمعِ کشتہ ہے، خاکستر سا پروانہ ہے!

مقطع ہے:۔

برسات کی چاندنی راتون مین، دیکھے تو کوئی صہبائی کو

لب پر بھی مناجاتین لاکھون، ہاتھون مین بھی پیمانہ ہے

دوسرا مصرعہ ذرا سا تغیر طلب ہے: ع

لب پر ہین مناجاتین لاکھون اور ہاتھون مین پیمانہ ہے

مولانا حالی کا ایک بے نظیر شعر ہے: ؎

اسکے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت　　　نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

صہبائی کی ایک غزل کا یہ شعر اسی کے قریب قریب ہے، فرق یہ ہے کہ مولانا کے یہان سادگی کا حسن ہے اور صہبائی کے یہان رنگینی کا بانکپن ؎

تیرے جانے سے عجب رنگ ہے اے جانِ بہار!

اب گلستان بھی بیابان نظر آتا ہے مجھے!

مگر اس کے بعد ہی ایک شعر ہے ؎

پھونک ڈالے گا مرے دل کو مری ہستی کو

حسن اک شعلۂ لرزان نظر آتا ہے مجھے!

"لرزان" کی جگہ اگر "سوزان" ہوتا تو کیا ہوتا،

تیسرا شعر ہے اور بہت ہی اچھا ہے، اور غالب کی "زود پشیمانی" سے کم نہین ؎

اب پشیمان ہون مین تاثیرِ فغان سے یارب

حسنِ مغرور پشیمان نظر آتا ہے مجھے!

پہلا مصرعہ اگر یون ہوتا تو اور فصیح ہو جاتا ع

اب پشیمان ہون تاثیرِ فغان سے یارب

صہبائی نے غالب کی غزلون پر بھی غزلین کہی ہین، اور اس مقابلہ مین بعض بعض شعر خوب نکالے ہین،

زندگی کا رازِ عشق بادیہ پیما سے پوچھ　　　حسن کیا جانے کہ وہ خلوت نشین محمل مین ہے

سوجِ طوفان خیز میں ہے اضطرابِ زندگی
اور سکونِ مرگ ہم آغوشیِ ساحل میں ہے

ایک جان پر ہزار ہا آفت
پھر بھی شکرِ خدا کرے کوئی
نظرِ شوق تجھکو ڈھونڈتی ہے
دیر و کعبہ کو کیا کرے کوئی

ہر شے سے پھوٹ پھوٹ کے نکلے شعاعِ حسن
لیکن نگاہِ شوق تو پیدا کرے کوئی

ہم نے صہبائی کے کلام کے جو چند نمونے پیش کئے ہیں، ان سے اندازہ ہوگا، کہ صہبائی کی شاعری میں زلف و شانہ نہیں، ان کے خیالات زیادہ تر فلسفیانہ ہیں، اسی لئے رباعیات ہوں یا غزل، مراثی ہوں یا مشاہد، ہر رنگ میں ان کا فلسفیانہ خیال جھلکتا اور حکمت کا ساغر چھلکتا ہے، مجھے امید ہے کہ اہلِ ملک ان کی قدر کرینگے، اور اپنی حوصلہ افزائیوں سے ان کو مزید ترقی کا موقع دینگے،

(سنہ ۱۹۳۳ء)

مسدس حالی

مسدس کی مقبولیت

پچھلے پچاس ساٹھ برس مین ہماری زبان کی نظم و نثر مین جو کتابین لکھی گئین ان مین قبولِ عام اور حیاتِ دوام، اگر کسی کو نصیب ہوئی، تو وہ مولانا حالی کا مسدس ہے، یہ ۱۲۹۶ھ مین یعنی آج سے انسٹھ برس پہلے لکھا گیا تھا، اس عرصہ مین اس کے جتنے ایڈیشن نکلے شاید ہی کسی دوسری کتاب کے نکلے ہون گے، ان مین عام اور سستے بازاری نسخے بھی تھے، اور نامی پریس اور تاج کے پرتکلف ایڈیشن بھی

قبولِ عام کا حال یہ کہ بچون سے لے کر بوڑھون تک اور جاہلون سے لیکر عالمون اور واعظون تک کی زبانون پر اس کے بند چڑھے ہوئے ہین، مکتبون مین یہ پڑھایا جاتا ہے، اسکولون مین اس کے انتخاب داخل ہین، میلاد کی مجلسون مین یہ گایا جاتا ہے اور وعظ کی محفلون مین اس سے گرمی پیدا کی جاتی ہے، خیر آج تو اس پر اتنا زمانہ گذر چکا ہے، اس لئے اس قبولِ عام پر تعجب نہین آتا لیکن اس کے چھپنے کے چند ہی برس بعد جب مصنف نے ۱۳۰۳ھ مین اس کا ضمیمہ لکھا، تو اس قبولیت و شہرت پر تعجب کیا ہے، اس چھ برس کے عرصہ مین اس کے سات

اڈیشن نکل چکے تھے، اور اب تو ان کا شمار دہائیون سے آگے نکل چکا ہے،

مسدس کی قبولیت کے موانع

مسدس کی اس قبولیت پر تعجب اس لئے آتا ہے کہ شاعر کی طرف سے جیسا کہ خود اس نے کہا ہے، مذہبی حلقون مین کافی بدگمانی تھی، مسدس مین بے عمل اور جامد علماء کی دھجیان بکھیری گئی تھین، جھوٹے پیرون اور مشائخ کی برائیان بتائی گئی تھین، عیش پرست اور نکمے امیرون کا خاکہ اڑایا گیا تھا، جھوٹے خوشامدی شاعرون کی ہجو کی گئی تھی، عام مسلمانون کے مشرکون جیسے خیالات کو برا کہہ کر ان کے دل دکھائے گئے تھے، غرض قوم کا وہ کونسا طبقہ تھا جس کے لئے حالی کے یہ دلدوز طعنے دلپسند ہو سکتے تھے، چنانچہ اس مسدس کا نکلنا تھا کہ مذہبی شاعرون نے اس کا جواب لکھا، ادبی شاعرون نے اس کی زبان اور شاعری پرلے دے کی، کافرگرون نے اس کے بعض مضامین کی بنا پر فتوے مرتب کئے، عام مسلمانون نے اس کے چبھتے ہوئے نشترون پر شور وغل کیا، مگر باد مخالف کے یہ جھونکے سچائی کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے، سچی بات دل مین اترتی چلی گئی، اس کی تاثیر رگ رگ مین پھیلتی گئی، کل جو نفرین کرتے تھے وہ تحسین کرنے لگے، جو اسلام کے لئے اس کو کبھی زہر قاتل کہتے تھے، وہ آب حیات کہنے لگے، غور کے قابل یہ بات ہے کہ مسدس کی اس مقبولیت اور پسندیدگی کا راز کیا ہے،

اسباب تنزل کی پردہ کشائی

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان مین مسلمانون کو دفعۃً اپنی حالت دگرگون نظر آنے لگی، جو کل بادشاہ تھے، وہ آج

فقیر ہوگئے، جو کل ایوانِ نعمت کے مالک تھے، وہ نانِ شبینہ کے محتاج ہوگئے، جو کل اور ایوانون مین رہتے تھے، وہ جھوپڑون سے بھی محروم ہوگئے، کل جن کا سب کچھ تھا آج ان کا کچھ نہ رہا، یہ واقعہ تھا، مگر اس واقعہ کے اسباب عام طور سے معلوم نہ تھے قاعدہ ہے کہ جب کسی کے گھر مین کوئی موت ہوجاتی ہے تو تعزیت کے لئے جو آتے ہین ان کا سب سے پہلے یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ حادثہ کیسے ہوا، کیا بیماری ہوئی، کیا صورت پیش آئی، میت کے عزیزون اور تیمارداروں کو بھی تسکین اسی مین ہوتی ہے، کہ مرنے والے کی بیماری، نزع اور موت کے ایک ایک واقعہ کو پوری تفصیل کے ساتھ سنائین، یہ مسدس اس قوم کے جو ابھی مری تھی، اسی قسم کے واقعات کی تفصیل و تشریح تھی، اور تعزیت کرنے والون کے اس سوال کا کہ یہ حادثہ کیسے پیش آیا، ایک مبسوط جواب تھا،

مرنے والا تو مرچکا ہوتا ہے، مگر لوگون کو اس کی موت کے پورے اسباب کا علم جب تک نہین ہولیتا ان کا تعجب زائل نہین ہوتا، اور جب یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا، بلکہ ایسے اسباب جمع تھے جن کے ساتھ موت کا طبعی طور سے واقع ہوجانا یقینی تھا، تو ان کا تعجب زائل ہوجاتا ہے، اور طبعی اسباب کے سامنے مجبوری کا احساس ان مین تسکین پیدا کردیتا ہے،

مسدس مین شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثۂ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کئے تھے جن کو سن کر ان بے خبرون کو جن کو وفقۂ ۱۸۵۷ء کے

حادثہ خونین کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرتناک انجام پر سخت حیرت تھی، شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر اُن کی حیرت کو دور کیا، اور بتایا کہ ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہین زندگی تعجب انگیز تھی

ماتم | بغداد کی تباہی پر سعدی نے ماتم کیا، اور ابن ابی الیسر نے خون کے آنسو روئے اور اندلس مرحوم کی بربادی پر ابن بدرون نے اپنا دلدوز نوحہ سنایا، لیکن افسوس کہ ہندوستان کے انقلاب پر چوبیس برس گذرنے کے بعد بھی کسی کو آنسو کے قطرے گرانے کی توفیق نہین ملی، دل بھرے تھے، آنکھین رونے کو اور ہاتھ سینہ کوبی کو تیار تھے، مسدس نے مرثیہ کا کام کیا، اور لوگ اس کو پڑھ پڑھ کر دل کھول کر روئے ایک درد بھری داستان تھی، جس کو جس نے سنا بیتاب ہوگیا،

قومی تاریخ | مسدس مین قوم کی غیرت کی رگ کو حرکت مین لانے کے لئے اسلام اور مسلمانون کی قومی تاریخ کے پرفخر کارنامون کو شاید سب سے پہلی دفعہ اس طرز و اسلوب سے اس ملک مین بیان کیا گیا تھا، رونے کی تسکین کے ساتھ اس کتاب مین مسلمانون کے فخر و غرور کا سامان بھی تھا، اس نشہ نے بھی لوگون کو اس مسدس کے پڑھنے کا چسکا لگایا، عرب کی حالت، رحمتِ عالم کی بعثت، قرآن کی تاثیر، اسلام کا شکوہ فتوحات کی وسعت، علوم و فنون کی ترقی، علما، اور حکما کا کمال، تعمیر بلاد، سیر و سیاحت اور بغداد و اندلس کے قابلِ فخر آثار، اس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ اس مین نظم کئے گئے تھے کہ مسلمانون کو فقیری مین بادشاہی کا مزہ آگیا، ان کے جھکے ہوئے سر

غرور سے اونچے ہونے لگے، اور گذشتہ دورِ عظمت کی کہانی اس پستی اور تنزل مین انکو تسکین وتسلی کا سرمایہ معلوم ہونے لگی،

"عرب، ہند، مصر، اندلس، شام و دیلم" ہر جگہ کی کہانی مسدس کی زبانی مسلمانون نے سنی، اور اس سینما مین ان کو بغداد کا حریم خلافت، اندلس کا بیت حمرا، غرناطہ کی شوکت، بلنسیہ کی عظمت، اشبیلیہ کے محراب و در، اور قرطبہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر سنجار اور کوفے کے میدان اور سمرقند، مراغہ اور قاسیون کے رصدخانے سب نظر آنے لگے، پڑھنے والے پر عجب کیفیت طاری ہوتی، روتا اور کبھی ہنستا اور ان دونون کیفیتون سے ہر گھڑی دل مین نئی لذت پاتا،

ترقی کی تدبیر غم اور فخر کے سرمایہ کے ساتھ اس عجیب وغریب کتاب مین موجودہ حالت کا احساس پیدا کر کے آیندہ کی فکر کا سامان بھی تھا، مسلمانون کے ہر طبقہ کے عیوب اور کمزوریون کا راز فاش کر کے اس کے سامنے اپنی حالت کے سدھارنے کا خاکہ بھی کھینچا گیا تھا، احساس کے نشتر سے زخم کے فاسد مادّون کے نکالنے کے بعد ان کی مرہم پٹی بھی کی گئی تھی، اس لئے مسلمانون مین اس کے ذریعہ جس کو تنزل کا احساس ہوا ترقی کی فکر بھی پیدا ہوئی،

قوم کا آئینہ غرض مسدس قوم کی تیرہ سو برس کی حالت وکیفیت کا آئینہ تھا جس مین اس کے چہرہ کا ایک ایک خط وخال نمایان تھا، اس کی پیدایش، اس کا نمو، اس کی جوانی، اس کا بڑھاپا، اس کی بیماری، اس کے عوارض، اس کی کمزوری ہر چیز اس مین

نظر آرہی تھی، اس لئے ہر مسلمان کو جس مین ذرا بھی حس تھی، اس آئینہ مین اپنا چہرہ دیکھنے کا شوق تھا،

مسدس کی نظم

اس شاعری مین جو صرف تفریحِ طبع کا سامان رہ گئی تھی، اور جس مین گل و بلبل کی حکایت، حسن و عشق کی روایت اور رقیبِ سیہ رو اور فلکِ پیر کی شکایت کے سوا کچھ اور نہ تھا، شاعر نے اپنی مسیحا نفسی سے ایک عظیم الشان قومی انقلاب کی تاثیر کی روح پھونک دی، لفظ سیدھے سادے، ترکیبین بے تکلف، معنی مبالغہ سے خالی، مصرع تشبیہ و استعارہ سے پاک، مگر ہر شعر جوشِ بیان سے لبریز، وفورِ احساس سے معمور اور درد و غم سے بھرا ہوا،

اس نظم کے لئے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا، مسدس اس زمانہ مین واسوخت کے لئے، پھر اہلبیتِ کرام کے دلدوز مصائب اور شہید کربلا کے دلفگار سوانح کے بیان کے لئے یک گونہ مخصوص ہو کر غم و الم کی داستان سرائی کے لئے خاص ہو چکا تھا، اس لئے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا تو اس مسدس سے زیادہ موزون اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہین آئی جسکا وزن ہی گویا درد و غم اور نالہ و ماتم کے لئے بن چکا تھا،

دوسری بات یہ بھی کہ اس نظم کے پُر اثر ہونے کے لئے ضرورت تھی کہ اس کے ہر ٹکڑے مین قابلِ بیان واقعہ ادا ہو جائے، مثنوی اس کے لئے موزون نہ تھی کہ اوّل تو وہ رزم و بزم کی حکایت کے لئے خاص ہو چکی تھی، اور پھر اس مین اتنی

سمائی نہین ہوسکتی تھی، کہ اس کے ایک ایک شعر مین تاریخ و سیر کا ایک ایک واقعہ ادا ہو جاتا، مسدس کی یہ صورت ہے کہ اس کا ایک ایک بند گویا کتاب کا ایک ایک مختصر باب یا تحریر کا ایک ایک پیراگراف ہوتا ہے، جس مین ایک ایک واقعہ الگ الگ ادا ہوتا جاتا ہے، نظم کی رفتار پہلے مصرع مین تمہید، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعون مین واقعہ کی تفصیل اور پانچوین اور چھٹے مین نتیجہ کی تاثیر بنتی جاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ کہان سے چیز شروع ہوئی، کہانتک اوپر چڑھی، اور پھر کہان سے نیچے اتری، ہر نئے بند کے شروع اور خاتمہ پر سامع کا نفس تبدیلِ ذائقہ اور تجدید احساس کے لئے مستعد اور تیار رہتا ہے،

اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مسدس کی نظم مین ایسی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف و شفاف نہر کسی ہموار ترائی مین آہستگی سے بہتی چلی جارہی ہے، نہ کہین رکاوٹ ہے، نہ لفظ مین گرانی ہے نہ قافیہ کی تنگی ہے، زبان مین گھلاوٹ، بیان مین حلاوت، لفظون مین فصاحت اور ترکیبون مین لطافت ہے، ہماری زبان مین سہل ممتنع کی یہ بہترین مثال ہے،

شاعر کی طبیعت | شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی، وہ ازل سے دردمند دل لے کر آیا تھا، اس کا مزاج سدا کا اداس تھا، وہ عالم کی نیرنگی، زمانہ کی ناسازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی کو منظر دیکھ دیکھ کر خود بھی اکثر روتا تھا اور دوسرون کو بھی رلاتا تھا، وہ جب روتا تھا اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا، کہ دیکھنے والے دیکھنے کی اور سننے والے

سننے کی تاب نہین لا سکتے تھے، مصنف کے سارے مرثیے خواہ وہ شخصی حیثیت سے لکھے گئے ہون، یا قومی، اسی قدر پُر اثر اور کیفِ غم سے لبریز ہین، اس انداز کا شاعر جب ملتِ مرحومہ کے گذشتہ اقبال اور برباد شدہ جاہ وجلال کا سوگ منائے گا تو ظاہر ہے کہ اس کے قلم کی ہر بوند آنسو کا ایک قطرہ اور اس کے لب کی ہر صدا فریاد کی ایک لے کیونکر نہ بنجائے گی،

شاعر کو اپنی اس طبیعت کا کافی احساس تھا، دیباچہ اور ضمیمہ دونون مین بار بار اس کا یہ اقرار چھلکا پڑتا ہے، اس لئے مسدس کا اصلی حصہ جو ۱۲۹۶ھ مین لکھا گیا تھا، ایسے اشعار پر ختم ہوا تھا، جو سرتاپا یاس اور ناامیدی سے بھرے تھے،

ضمیمہ | شاعر کو خود بھی خیال ہوا، اور دوسرے اصحابِ نظر کے کہنے سے بھی معلوم ہوا کہ کسی ایسی کتاب کا جو قوم کو غیرت دلانے اور اس کے احساسِ عمل کو جگانے کے لئے لکھی گئی ہو، ایسے دل شکن اور حوصلہ فرسا اشعار پر ختم کرنا ہمیشہ کے لیے اسکی امیدون کو منقطع اور اس کے حوصلون کو پست کر دینا ہے، چنانچہ چھ برس کے بعد ۱۳۰۲ھ مین شاعر نے اس کا ضمیمہ لکھا اور چاہا کہ اپنی اوداس طبیعت کو ابھار کر نوحہ خوانی کے بجائے کچھ رجز خوانی کا فرض انجام دے، مگر اندازِ طبیعت اور دلی یقین کے خلاف کوئی بات بنانا مشکل ہے، اس لئے اس ضمیمہ کی صورت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی غمون کا مارا ماتم گسار اپنے دوسرے غمزدہ عزیزون کو تسکین دینے بیٹھے، وہ بار بار اپنے آنسوون کو پیتا ہے، اپنے چہرہ کو مطمئن بناتا ہے، اور دوسرون کے بہتے ہوئے

آنسوون کو اپنے بھیگے رومال سے پوچھتا اور صبر کی تلقین کرتا ہے، اور پھر منھ پھیر کر ان عزیزون کی آنکھون کو بچا کر اسی رومال سے آنسوون کے قطرون کو بھی پونچھ لیتا ہے
اس ضمیمہ کی روانی اور فصاحت کا بھی وہی عالم ہے، اگر ہر بند پر صاف نظر آتا ہے کہ مصنف وقت کی مصلحت اور طبیعت کے اقتضا کی کشمکش مین مبتلا ہے، اور اسی کشمکش مین اس سے جہان تک بن پڑتا ہے، وہ اپنی قوم کے دل ابھارنے، ہمت بڑھانے اور ترقی کے گر بتانے مین نئے نئے اسلوب پیدا کرتا ہے، اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے،

مسدس کی "حیات جاوید" | مسلمانون کو سوتے سے جگانے اور ان کے ہر طبقہ کو ان کے عیب اور کمزوریون کے سمجھانے مین ہمارے ہر رہنما نے اپنی اپنی توفیق کے مطابق بہت کچھ کام کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ مولانا حالی کی اس بروقت صدا نے اس مین سب سے بڑا کام کیا ہے، ان کے نہ صرف اس مسدس کے ہر بند، بلکہ نظم کے ہر مصرع مین آج بھی وہ اثر ہے کہ سن کر دل بیتاب اور اپنے اسلاف کے کارنامون کی تقلید کا جوش پیدا ہو جاتا ہے،

مسدس مین جاہلیت کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ ایسا سچا ہے، کہ جب سے قلم نے اس کو کھینچا اس وقت سے آج تک وہ اس عہد کے ہر نقشہ کھینچنے والے کے لئے نمونہ کا کام دیتا ہے، پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعت مین ہمارے خوش خیال شاعرون نے کیا کیا کچھ نہین کہا، اور کس کس طرح مدح و توصیف نہین کی، مگر مسدس مین نعت کے

جو چند بند ہین، وہ اپنی واقعیت اور سچائی کی بنا پر جس اثر سے مالا مال ہین، وہ تکلف اور مبالغہ سے بھری ہوئی اکثر نعتون سے بڑھ چڑھ کر ہے، شاعرون نے اپنی نعتون مین شاعری کے جادو سے اثر پیدا کرنا چاہا ہے، اور مولانا حالی نے سچائی اور واقعیت کے اعجاز سے، اس لئے ان کی نعت کے یہ چند شعر دوسرون کے سارے دفتر سے بہتر ہین، اور بعد کو نئے شاعرون نے اسی طرز کی تقلید کی اور کامیاب رہے،

مسلمانون کے علوم وفنون کی تاریخ اور ترقیون کا یہ پہلا نقشہ تھا جس کو مولانا حالی نے اپنے موقلم سے تیار کیا تھا، بڑے بڑے تاریخی واقعات اور قابلِ فخر کارنامون کو جس طرح چند مصرعون مین کھپا کر انھون نے بیان کر دیا، وہ آج بھی بے نظیر ہے، نظم کے ساتھ مقدمہ اور دیباچہ کی نثر بھی اپنی سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے ہماری زبان کے ادب کا اتنا بلند نمونہ ہے، جسکی پیروی آج تک نہ ہوسکی،

اس مسدس کی تالیف پر نصف صدی سے زیادہ گذر چکی، مگر اس کے اثر کی تازگی کا اب بھی وہی عالم ہے، امید ہے کہ صدیون پر صدیان گذرتی چلی جائین گی لیکن ان اوراق پر سچائی اور اخلاصِ ملت کی تاثیر سے کہنگی نہ آئے گی، یہ خود حیاتِ جاوید پائے گی، اور اپنے مصنف کو حیاتِ جاوید بخشے گی، اور جیسے اس دنیائے فانی مین وہ اس کی شہرت کا سبب بنی، اس دنیائے باقی مین اسکی مغفرت کا سامان بنی ہوگی،

(سنہ ۱۹۳۵ء)

خیابان

ہماری موجودہ اردو شاعری کا قافلہ ایک خاص سمت کو سفر کر رہا ہے، اس سفر کا توشہ تمامتر غزلگوئی ہے، ہمارے نوجوانون کی شاعری کی زبان جب کھلتی ہے، تو عشق و محبت کے ناتمام پیام، اور حسن و جمال کی نادیدہ تصویرکشی کے سوا ان کے کلام مین کچھ نہین ہوتا، تصوف اور فلسفہ کے دھندلے خیالات جہانتک ان کی رسائی نہین ان کے شعر کو گنجلک بنا اور ان کے بیان کو الجھا دیتے ہین،

عشق و محبت کے واردات اور حسن و جمال کی ادائین حقیقت مین واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہوتی ہین، ان واقعات مین پڑے اور ان مشاہدات کا مزہ چکھے بغیر ان کی ترجمانی بن دیکھے مقام کا حال بتانا ہے، شاعری کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ لفظون مین شاعر کے جذبات اور تاثرات کی تصویر ہے، اور جذبات و تاثرات صرف ذاتی واردات ہو سکتے ہین، وہ نقالی اور اخذ و سرقہ سے ادا نہین ہو سکتے، یہ ہار سچے موتیون ہی سے تیار ہوتا ہے، جھوٹے موتی اس کے لئے بیکار ہین، غزلگوئی کوئی بری چیز نہین لیکن اس کے لئے زخمی دل درکار ہے، اس کے

لکھنے کے لئے سیاہی بازار کی بوتلون مین نہین ملتی، خونچکان سینون مین پائی جاتی ہے، دل سوختہ میر کی کامیابی کا راز نصیحت کے اس فقرہ مین ہے جو بوڑھے باپ نے اپنے نوجوان شاعر بیٹے کو کی تھی، "اے پسر عشق بورز"

تجربہ کار سعدی نے یہ بے سبب نہین کہا تھا کہ "تا نہ افتد نہ دانی" داغ کے کلام مین جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس مین عشق کی ایک ایک گھات، اور حسن کی ایک ایک ادا اس طرح بیان ہوئی ہے کہ جس پر بیتی ہے اس کو ہر قدم پر اپنی بات یاد آتی ہے، اور مزے لیتا ہے، اور جس پر نہین بیتی ہے اس کو اس مین وہ لطف ملتا ہے جو تاریخ و جغرافیہ کے شائق کو کسی غیر کے سفرنامہ مین،

غرض کلام کی یہ صنف حقیقت کی طالب ہے، غیر کی کہانی اپنی زبانی ایسی بے مزہ حکایت ہے جس مین اثر پیدا ہی نہین ہو سکتا،

غزل کی دوسری صنف وہ ہے جو رومی و خسرو و حافظ کا سرمایہ ہے، یا جو اردو مین مظہر، درد، اور نیاز اور ایک معنی مین غالب کے خزانہ مین ہے، وہ حقیقت رسی، نکتہ دانی، اور علم اسرار کے فیوض و برکات کا عطیہ ہے، لیکن یہ سعادت زور بازو کی ممنون نہین، بلکہ خدائے بخشندہ کی بخشش ہے، جو ہر شخص کی قسمت مین نہین،

یہ عجیب بدنصیبی ہے کہ ہماری شاعری کی پیدائش اس وقت ہوئی جب قوم پر مردنی چھائی تھی، اس کی ساری قوتین ٹھنڈی تھین اور یاس اور نا امیدی اس کو ہر طرف سے گھیرے تھی، ایسی قوم کے دل و دماغ مین قوی کا اشتعال،

واقعیت کی قوت، مقصد کی بلندی اور عزم و ہمت کا جوہر کبھی پیدا ہی نہین ہو سکتا، یہ لوگ سمجھتے ہین کہ فردوسی نے محمود کو پیدا کیا، مین سمجھتا ہون کہ محمود نے فردوسی کو پیدا کیا، اگر محمود کی تلوار یہ ہنگامہ آفرین عہد پیدا نہ کرتی، تو رستم و سہراب اور کیکاؤس و افراسیاب کے بوسیدہ ڈھانچون مین یہ جان نہین پڑ سکتی تھی، اور نہ رزم و جنگ کی یہ رجز و نہیب تلوارون کی یہ جھنکار اور داد شجاعت کے یہ افسانے فردوسی کی زبان و قلم سے ادا ہو سکتے تھے، سامانی، غزنوی، غوری، سلجوقی، خوارزم شاہی اور تیموری شعراء کے کلام مین یہ زور ان کے زمانہ کے بادشاہون کے فتوحات کا بخشا ہوا تھا، کشورکش سلاطین دنیا کو زیر و زبر کر کے قوم کے افراد مین زندگی پیدا کرتے تھے، اور اس کشاکش اور تصادم کی چقماق سے وہ آگ پیدا ہوتی تھی، جو ہر طرف گرمی اور طاقت پیدا کرتی تھی بادشاہ کے فتوحات اور واقعی کارنامون کی حکایت شعراء کے کلام مین صداقت کا زور اور واقعیت بیان کا جوش پیدا کرتی تھی، یہ چیز محمد شاہ اور ظفر شاہ کے عہد مین جو اردو شاعری کا دور کمال ہے کب ہاتھ آسکتی تھی، ذوق چاہے جتنا زور بھی لگائین مگر وہ بات کہان سے آسکتی تھی، جو عنصری، معزی، خاقانی اور عرفی و کلیم مین تھی، انکا جو کسی حریف کو اپنے خاطر مین نہین لاتے تھے، وہ اپنے اندر ظفر شاہ جیسے شطرنج کے بادشاہ کی مدح و ثنا مین وہ زور کہان سے لا سکتے تھے، جو محمود کے مداح، ملک شاہ سلجوقی کے ثنا خوان، شروان شاہ کے قصیدہ گو، قزل ارسلان کے مدح طراز، اور اکبر و جہانگیر و شاہجہان کے درباری شاعرون مین تھا، اور یہی کمی غالب کو خود محسوس ہوتی تھی

شاعری کے لئے جس عشق کی ضرورت ہے اس سے مقصود صرف لیلیٰ اور مجنون جیسا عشق نہین ہے، یہان عشق اپنے وسیع معنون مین بولا جارہا ہے اس سے قلب کی وہ واقعی کیفیت مراد ہے جو عالم اور ماوراے عالم کی ہر چیز سے لگاؤ پیدا کرسکتی ہے، مناظرِ فطرت سے عشق ہوسکتا ہے، قوم اور ملک سے عشق ہوسکتا ہے کسی بلند مقصد اور اہم مطمحِ نظر سے عشق ہوسکتا ہے، کسی مقدس ذات اور مقدس کام سے عشق ہوسکتا ہے، اور اس مین سے ہر عشق شاعری کے ساز کو چھیڑ کر اس کو دہنِ موسیقار بنا دیتا ہے،

اسی طرح اہلِ سخن اور اصحابِ قلم مین جوش و خروش اور قوت و زور پیدا کرنے کے لئے خاص مطلق العنان بادشاہون کی ضرورت نہین وہ تو شخصی حکومتون کا زمانہ تھا، جب ہر قسم کی طاقتین ایک ہی شاہانہ شخصیت مین سمٹ جاتی تھین، اور ملک کے سارے جسمانی و دماغی کارخانے اسی ایک انجن کی طاقت سے چلتے تھے، زمانہ کے نئے انقلاب نے اب یہ طاقت جمہور کے اندر پیدا کردی ہے، اب قوم کی سرگرمی اور ملک کی جد و جہد جمہور کی کوششون کا نتیجہ ہے، اس لئے جو کام پہلے شاہانہ کارنامون کے زور سے انجام پاتا تھا، وہ جمہور کے زور سے انجام پاتا ہے، اب سلاطین کے فتوحات کی طاقت نہین، بلکہ قوم کی فاتحانہ اور اولوالعزمانہ طاقت اہلِ سخن اور اصحابِ قلم کے سینون مین جوش، زبانون مین تیزی اور قلمون مین روانی پیدا کرتی ہے، اب زمانہ سلاطین کے درباری شعراء کا نہین، بلکہ قومی اور ملی شاعرون کا ہے، جو بادشاہون کے مدحیہ قصیدون کی جگہ ملک و ملت کے جذبات کی ترجمانی کرین اور

اپنی رجز خوانی سے اس کے سپاہیون کا دل بڑھائین،

دلّی کی سلطنت نکل جانے کے بعد ہمارے شاعر اور سخنور مدت تک رنج والم اور نوحۂ و ماتم مین مصروف رہے، حالی نے اس دور کا آغاز کیا جب تک جیتے رہے خود روتے اور دوسرون کو رلاتے رہے، اکبر کے دور مین ذرا لبون پر مسکراہٹ آئی اور نوحۂ و ماتم کی جگہ طعن و طنز نے لی شبلی نے رجز خوانی شروع کی، یہ تینون گو بڑے چھوٹے معاصر تھے، مگر ان کی اردو شاعری کا زمانہ نسبتہً ایک دوسرے کے بعد ہے، اقبال آئے تو قوم کا قافلہ سفر کو آمادہ ہو چکا تھا، اس لئے وہ بانگ درا کے ساتھ آئے، اور خود ہی کہا

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا

بڑی لڑائی کے بعد سیاسیات کے انقلاب کا رخ جب سے بدلا ہے، ہماری نئی شاعری کا رنگ بھی بدل رہا ہے، اب نوحۂ و ماتم طعن و طنز اور رجز خوانی کے بدلہ انقلاب انقلاب کا نعرہ ہے، اب کچھ اور ہی چیزین ہمارے سامنے ہین، اور قوم و ملت کے قافلے کسی اور ہی سمت کی طرف قدم بڑھانے کے لئے سفر کا سامان باندھ رہے ہین اس انقلاب نے ہماری زبان مین بہت سے اچھے اچھے سخنور پیدا کئے ہین،

زمانۂ حال کے ان نئے خوش فکر شاعرون مین ایک اس مجموعہ کے مصنف محمود اسرائیلی صاحب ہین، جن کی نظمین اکثر اخبارون اور رسالون کے صفحون کی وجہ عزت بنتی رہتی ہین، ان کے کلام پر ایک سرسری نظر یہ راز فاش کر دیتی ہے کہ وہ شبلی اقبال اور ظفر علی خان کے اسالیب سخن سے بہرہ ور اور متاثر ہین، وہ ایک ایسے اسلامی

شاعر ہین جو وطن کی محبت سے بھی سرشار ہین، وہ اسلام کی محبت اور وطن کی خدمت مین تضاد اور بیر محسوس نہین کرتے، وہ قومیت اور وطنیت کے تنگ مفہوم کو ننگ سمجھتے ہین، وہ یورپ کے ملمع تمدن کے فریب سے آگاہ اور اس کی انسانیت کی زندگی سے واقف ہین، اور اس کی سیاست کے بدنما چہرہ پر جو رنگین نقاب پڑی ہے اس سے ان کا تار نظر الجھا نہین ہے،

غرض وہ اسلام کے ہندی شاعر، یا ہندوستان کے مسلمان شاعر ہین، اور ہندی مسلمانون کے سامنے ملک وملت، اور دین وسیاست کے حقیقی انوار اور واقعی اسرار آشکارا کرتے ہین، اور ہندی مسلمانون کو اسلامی جذبات اور وطنی خدمات کیلئے یکسان دعوت دیتے ہین،

ان کی اخلاقی اور تاریخی شاعری مین شبلی کا تخیل ہے، ان کی سیاسی اور وطنی شاعری مین ظفر علی خان کی پرکاری ہے، ان کی حقیقت شناسی اور اتحاد اسلامی کے ساز مین اقبال کا ترانہ ہے،

سیرت نبوی اور ہجرت مبارکہ کے بیان مین سوانح نگاری کے ساتھ ایک شاعر کے قلم کے ساتھ ایک مسلمان کا دل بھی ہم آہنگ ہے، ان کے وطنی جذبات کی تراوش مین کوزہ کی تنگی کے بجاے دریا کی پوری پہنائی ہے،

ان سب کے ساتھ شاعر، انقلاب کے نئے آثار اور نتیجون سے بھی بے خبر نہین، وہ غریبون، مزدورون اور کسانون کی تکلیفون سے بھی رنجیدہ اور سرمایہ دارون

کی بے رحمیون سے بھی ملول ہے، وہ عہد حاضر کے ان نوجوان شاعرون مین نہین جو اوپر کے بہتے ہوئے خیالات کے سہارے اس لئے چلنا چاہتے ہین، کہ وہ خس و خاشاک کی طرح آسانی سے ظاہر نمائی کی منزل کو قطع کر سکین، جو انقلاب، مزدور کسان اور سرمایہ کے لفظون سے کھیل کر اپنے کو انقلابی اور دینی و قومی جذبات کی پستی سے اپنے کو بلند ظاہر کرتے ہین، جو کبھی پریاگ مین اجمیر اور کبھی اجمیر مین پریاگ بناتے نہین

محمود اسرائیلی صاحب کی ایک اور خوش قسمتی یہ ہے کہ انھون نے غزل گوئی کے پامال کوچہ مین قدم نہین رکھا، اور عشق و محبت کے جھوٹے موتیون سے اپنے جیب و دامن کو نہین بھرا، وہ زلفِ دراز کے گرفتار، چشمِ سیاہ کے مسحور اور حسنِ عارض کے گرویدہ نہین، ان کے سینہ مین دکھاوے کے غمِ عشق اور نمایش کی آہ و نالہ کی جگہ نہین، گو عاشقانہ نظمون کا اس مجموعہ مین بھی ایک عنوان ہے، مگر عشق و محبت کی اس داستان مین "آپ بیتی" نہین "جگ بیتی" ہے، اور جو کچھ ہے وہ شاعر کا داخلی نہین، خارجی رنگ ہے،

"فکاہات" کے عنوان سے بھی اس مین چند نظمین ہین، مگر یہ بھی شاعر کا اصلی مذاق نہین، اس لئے یہ لطیفے لبون پر مسکراہٹ لائے بغیر متانت کے انداز مین سنائے گئے ہین، یہ فکاہات اکبر کے رنگ مین نہین، بلکہ الہلال کلکتہ کے حضرت "کشاف" یعنی مولانا شبلی کے رنگ مین ہین، جنکو فکاہات کے بجائے طنزیات کہنا چاہئے

سیاسیات کے عنوان سے شاعر کی فکر رسا نے جو کچھ کہا ہے، وہ ستایش کا مستحق

ہے، خیالات درست، دعوت صحیح اور طرزِ ادا دلکش ہے، سیاسیات مین گو وہ کانگریس کا ہم نوا ہے، مگر اپنے قومی جذبات اور ملی ضرورتون سے بے پروا نہین، ملک اور دین کی خدمت مین جو تضاد بعض کم سوادون کو نظر آتا ہے، اس کی گہری نگاہ مین وہ منطقی مغالطہ کے سوا کچھ اور نہین، غرض اس باب مین اس کے خیالات و تعلیمات بیحد سنجیدہ ہین یعنی مذہب و سیاست اور دین و وطن کے جذبات کی معتدل آمیزش، مشرق سے صحیح عقیدت، اور مغرب کی صحیح تنقید،

مظاہر فطرت کی تصویر مین اس کے موقلم کی کشش تعریف کے قابل ہے، تصور کا اچھوتا پن، تشبیہون کی رنگینی، استعارون کی لطافت اور طرز ادا کی دلکشی اس کے شاعرانہ کمال پر دلیل ہے،

شاعر کا کلام نقالی کے عشق سے بھی پاک ہے، دین و مذہب ملک و ملت اور مناظرِ فطرت سے اس کو سچا عشق ہے، اور اسی عشق کے مظاہر اس کی نظم مین نمایان ہین، وہ شاعرِ انقلاب اور شاعرِ شباب نہین، وہ شاعرِ حقیقت ہے اس کے کلام مین نادان نورسیدہ نوجوانون کے خام ولولون اور ناتمام جذبون کی نمایش نہین، بلکہ پختہ کار، دانایانِ عقل کی حقیقت ہے، اس مین کم فہم شباب کا ہنگامی جوش نہین، بلکہ سن رسیدگی اور پختگی کی سمجھی بوجھی اور غور و فکر سے طے کی ہوئی مستقل راے ہے، غرض وہ سراب نہین، شراب نہین، نہر روان اور شہدِ مصفا ہے،

دل چاہتا تھا کہ اس خیابان کی ہر روش لفظی عیوب کے خس و خاشاک، اور حرف گیری کے گرد و غبار سے بھی ہر طرح پاک ہو، مگر آجکل کے اکثر شاعر غفلت سے فن کی باتون پر کان کم دھرتے ہین، اس لئے اگلے بزرگون کے فنی رسم و رواج کی پوری پوری نگہداشت نہ کرنے پر اکیلے اسی مجموعہ کے مصنف کا گلہ نہین کیا جا سکتا، اور نہ تنہا اسی کو اصول و قواعد کی تقلید کی کڑی بیڑیان پہنائی جا سکتی ہین، اور نہ فصیح سے فصیح تر لفظ و ترکیب کا مطالبہ، اور حشو و زوائد سے پاکی کا تقاضا کیا جا سکتا ہے،

۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۳۷ء
مطابق
ربیع الاُخریٰ سنہ ۱۳۵۶ھ

عطرِ سخن

مولانا محمد فاروق چریاکوٹی رحمۃ اللہ علیہ مولانا شبلی علیہ الرحمۃ کے استادِ کل تھے، اور مجھے بھی اُن سے عربی ادب و شعر اور منطق مین تلمذ کا فخر حاصل ہے ؎

گرچہ خوردیم نسبتےاست بزرگ　　ذرۂ آفتاب تابانیم

جب مین نے شروع شروع عربی مین شعر کہنا شروع کیا، اور اصلاح کی غرض سے استاد کے سامنے پیش کیا، تو فرمایا "شعر کہنے سے شعر سمجھنا زیادہ مشکل ہے، اس لئے خود شعر کہنے سے زیادہ دوسرون کے شعر سمجھنے کی مشق پیدا کرو" مولنا شبلی مرحوم بھی فرماتے تھے کہ "سخن گوئی سے زیادہ سخن فہمی مشکل ہے" اور اس بارہ مین مولانا حالی مرحوم کے بیحد مداح تھے، ایک دفعہ کا واقعہ بیان کرتے تھے، کہ "جب پہلے پہل جاحظ بصری (المتوفی ۲۵۵ھ) کی کتاب البیان والتبین چھپ کر مصر سے آئی تو مین نے اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا، کتاب کا کوئی خاص موضوع سمجھ مین نہین آیا، اس مین عرب کے مشہور فصحا و بلغا کے کلام کے ٹکڑے یکجا تھے، اتفاق سے رات کو مولانا حالی (جو ان دنون علی گڈھ کالج مین رہتے تھے)

آئے اور وہ کتاب لے گئے اور صبح کو یہ کہکر واپس کر گئے کہ یہ نثر کا حماسہ ہے" مولانا کہتے تھے کہ " ان کا یہ فقرہ سنکر مین پھڑک گیا، اور عقدہ حل ہو گیا" غرض یہ تھی کہ جس طرح عربی نظم مین حماسہ شعراء کے بہترین کلام کا مجموعہ ہے، اسی طرح جاحظ نے گویا عربی زبان کے خطیبون اور انشا پردازون کے مختلف عمدہ ترین نثرون کا یہ مجموعہ فراہم کیا ہے اور یہی اس کا موضوع ہے،

حماسہ کا جامع ابو تمام ہے، جو خود ایک بڑا صاحب دیوان شاعر اور بحتری کا مدمقابل تھا، لیکن فن کے تمام نقادون کا فیصلہ ہے کہ ابو تمام کی لازوال شہرت ایک دیوان کے مصنف اور شاعر ہونے کی رہین منت نہین، بلکہ حماسہ کے مولف اور جامع ہونے کی ممنون ہے، گیارہ سو برس کے قریب ہوئے کہ اسی حماسہ کی بدولت ابو تمام کا نام ادبائے عرب مین سر فہرست نظر آتا ہے، اور بقول مولانا شبلی" اس کی یہ کتاب عربی ادب کا صحیفہ ہے"

حماسہ کی حیثیت یہ ہے کہ وہ جاہلی اور ابتدائی ہجری صدیون کے اسلامی شاعرون کے اعلیٰ، نادر اور بہترین کلامون کا مجموعہ ہے، یہ مجموعہ آٹھ مختلف عنوانون مین بٹا ہے، سیکڑون شعراء کے رطب و یابس، بلند و پست اور اعلیٰ و ادنیٰ کلام کو پڑھنا اور اس انبار مین سے خزف ریزون کو چھانٹ کر موتیون کا رول لینا، ایک بڑے صاحب نظر جوہری کا کام ہے، اس حماسہ کے بعد بہت سے حماسے اور عربی اشعار کے منتخب مجموعے تیار ہوئے، مگر ابو تمام کے حماسہ کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا،

اس نئے عہد سے پہلے جب ہندوستان کی ادبی زبان فارسی تھی، ہر لکھے پڑھے آدمی کے پاس "سفینہ یا بیاض" کے نام سے کاغذون کے چند سادہ اوراق ہوتے تھے جن مین ہر صاحبِ ذوق اپنی پسند سے دورانِ مطالعہ یا باہم صحبتون مین جو اچھے اشعار پڑھتا یا سنتا تھا، ان کو وقتاً فوقتاً قلمبند کرلیتا تھا، اور اس طرح ہر قدرشناس کے پاس شعراء کے اچھے اور منتخب شعرون کا ایک الگ مجموعہ تیار ہو جاتا تھا، اس قسم کے سفینے یا بیاض ہر پرانے علمی خاندان مین اب بھی موجود ملین گے، اور اکثر مشرقی کتب خانون مین اس طرح کے متعدد نادر اور منتخب مجموعے محفوظ ہین، استاد مرحوم کی زبانی سنا تھا کہ ان کو مرزا صائب کا ایک اس قسم کا انتخاب حیدرآباد دکن مین ملا تھا، اور وہ اس کی تعریف کرتے تھے لیکن اس قسم کے تمام فارسی انتخابات مین وہ مرزا مظہر جانِ جانان کے انتخاب کو جو خریطۂ جواہر کے نام سے مشہور ہے اور چھپ بھی گیا ہے، سب سے زیادہ پسند فرماتے تھے،

اس نئے دور مین جس کے تمدن کی بنیاد جلدی اور عجلت پر ہے، عمر بھر کی محنت مین ایک سفینہ یا بیاض تیار کرنے کا صبر آزما کام کون کرسکتا ہے؟ تاہم چونکہ شعر و سخن کا چسکا ایک فطری ذوق ہے، اس لئے کسی نہ کسی حیثیت سے چند سال مین ایک منتخب مجموعہ تیار کرلینا مشکل نہین، چنانچہ اردو دواوین کے مختلف انتخابات ملک مین وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہین اور چھپتے رہتے ہین، اس قسم کا پہلا جامع انتخاب مولانا ابوالفضل عباسی (گورکھپور) کا "نشترِ سخن" ہے جو ۱۹۱۱ء مین چھپا

جس مین ہر شاعر کے کلام کا الگ الگ انتخاب درج ہے، اس کے بعد (بدایون سے) نواب مسعود جنگ کا "انتخاب زرین" شائع ہوا، جو گو مختصر ہے مگر دل پسند ہے، سب سے مطول اور مسلسل مجموعہ جناب الیاس برنی (حیدرآباد دکن) کے مجموعے ہین جو مختلف عنوانون کے تحت مین متعدد جلدون مین "جذبات فطرت و قدرت و ملت" وغیرہ نامون سے شائع ہوئے ہین، اور انگریزی اسکولون اور یونیورسٹیون مین بہت مقبول ہوئے ہین، اور آخر مین پنجاب سے "لمعات نور" نام ایک مجموعہ ایک جلد مین شائع ہوا ہے جس مین مضامین اور عنوانات کی ترتیب کے ساتھ شعراء کے مختصر سوانح اور تصویرین اضافہ کی گئی ہین،

صوبہ ہاے متحدہ، پنجاب اور حیدرآباد دکن کے بعد اب صوبہ بہار کی باری ہے، جناب ڈپٹی مولوی سید یوسف حسین صاحب ساکن چھپرہ ضلع سارن نے بڑی محنت اور جانکاہی کے ساتھ نسیم سخن، غنچۂ سخن، گل سخن، عطر سخن اور روح سخن کے نامون سے اردو شعراء کے منتخب کلامون کے پانچ تدریجی مجموعے تیار کئے ہین، جنہین چوتھا حصہ عطر سخن اس وقت ان اوراق کے کالبد مین جلوہ گر ہے،

اب تک اردو مین جتنے مجموعے تیار ہوئے ہین وہ مشرب کے اختلاف کے باوجود ایک خاص مقصد مین متحد ہین، یعنی سب کے سب عام مطالعہ کرنے والون اور تفریح طبع کی خاطر پڑھنے والون کے لئے لکھے گئے ہین، اس لئے ان کی ترتیب مین سہولت اور اشکال، اور تعلیم کی تدریجی ترقی کو پیش نظر نہین رکھا گیا ہے

بنابرین وہ مجموعے اسکولون اور کالجون کے طلبہ کے نصاب مین کام نہین آسکتے مؤلفِ ہذا کے پیشِ نظر یہی تعلیمی پہلو ہے کہ اردو شعراء کے کلامون کو مختلف حصون مین اِس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہر حصہ کا معیار تعلیمی منزلون کی مختلف استعداد اور قابلیت کے مطابق ہو، تاکہ وہ کالج کے اعلیٰ درجہ سے لے کر اسکول کے درجون تک بہ ترتیب نصاب درس مین جگہ پاسکے،

انتخابات کے خارستان مین اصلی رہنما جامع کا ذوق سلیم ہے، مگر لوگون کے ذوق اور نقطہ ہاے نظر طبعًا خود مختلف ہین، اس بنا پر کسی مجموعہ کو تمام تر اور ہر شخص کی نگاہ مین معتبر ہونے کی سند بہ مشکل ہاتھ آسکتی ہے، تاہم اس معیار کو اس حد تک متوسط کیا جاسکتا ہے کہ انتخابات کا بڑا حصہ اربابِ نظر اور اصحاب ذوق کی ہمدردی حاصل کرسکے، اس معیار پر یہ مجموعہ پوری طرح اتر سکتا ہے، شعرون کے انتخاب سے پہلے شاعرون کا بھی انتخاب ضروری ہے، ہم کو شکایت ہے کہ مؤلف نے اس مین سخت گیری کے بجاے رواداری برتی ہے، لیکن ان کا جواب ہے کہ "یہی بے تعصبی اور وسعتِ انتخاب اس کتاب کا ہنر ہے"! بہرحال یہ بھی اختلافِ ذوق ہے، بقول ذوق "یہی نیرنگی اس عالم کی رونق کا آب و رنگ ہے"

اس مجموعہ مین مؤلف نے ہر دور کے شعراء کے کلام کو اشکال و دقت اور سہولت کی نظر سے دیکھکر پھر شاعر کے تخلص کی ابجدی ترتیب پر اس کو

مرتب کیا ہے، ہر چند کہ یہ ترتیب لزوم مالا یلزم ہے، مگر ہر شاعر کے کلام کی جستجو اور تلاش مین اس سے آسانی پیدا ہو گئی ہے، ہم کو امید ہے کہ ہمارے صوبہ کا محکمۂ تعلیمات اس سلسلۂ انتخاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیگا اور ان طالب العلمون کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع بخشیگا،

سنہ ۱۳۴۸ھ ۱۹۲۹ء ‏ ‏ ‏ دلیسنہ، پٹنہ (بہار)

حقیقت علمی شاعری

عظیم آباد پٹنہ اور اس کے اطراف مین جو مردم خیز بستیان آباد ہین ان مین سے ایک کا نام نگر نہسہ ہے، یہ قدیم شرفاے شیوخ، اور پروردگان علم و ہنر کا مسکن ہے، ان اطراف مین یون تو عموماً شیوخِ صدیقی کی آبادی ہے، مگر کہین کہین انصار کے گھرانے کے چشم و چراغ بھی چمکتے ہین، اسلام کا یہ معجزہ بھی کیا کم ہے کہ اس کے قدم سے نہ صرف ہندوستان کا ظلمتکدہ بقعۂ نور بنا، بلکہ رام و کرشن کے پہلو بہ پہلو قریش و اوس و خزرج کے نونہال بھی جلوہ آرا ہوئے اور نسل و وطن کا اختلاف کلمۂ توحید کی دوستی سے وحدت کے رنگ مین نمایان ہوگیا،

مولنا امین اللہ | نگر نہسہ مین شیوخِ انصار مین سے مشہور صحابی حضرت ابو درداؓ، انصاری کا ایک خاندان آباد ہے، بارہوین صدی ہجری مین اس خاندان کی یادگار حضرت مولانا امین اللہ رحمہ اللہ کی ذاتِ بابرکات تھی، اس صدی کے مجدد حضرت مولنا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے کون واقف نہین، اُن کے فیوض و برکات کے چشمے ملک کے گوشہ گوشہ کو سیراب کر رہے تھے، حضرت مولانا امین اللہ عظیم آبادی نے بھی حضرت شاہ صاحب ہی سے فیض پایا، اور اُن کے تلمذ کی نسبت سے سربلندی حاصل کی، یہ اپنے زمانہ کے مشہور علما مین تھے، میرزاہد، اور سلّم الثبوت پر حاشیے لکھے، اور آیۂ کریمۂ وَفِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ کی تفسیر لکھی، اور فارسی مین قصیدۂ عظمٰی کے نام سے

ایک عجیب وغریب قصیدہ لکھا، جس مین آنحضرت صلعم کی سیرت مبارکہ کو ولادت سے وفات تک مع غزوات کے نظم فرمایا، اور فارسی دیوان بھی الگ ترتیب دیا، یہ مشہور شعر ان ہی کے قصیدۂ عظمیٰ کا ہے،

مخدّرات سراپردہاے قرآنی — چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی

مولنا علیم الدین حسین | اسی خانوادے کے دوسرے بزرگ مولنا علیم الدین حسین ہین، جو مولانا امین اللہ صاحب کے بھائی کے پوتے تھے، یہ بھی مشاہیر عہد سے تھے، مفتی صدرالدین خان دہلوی مولنا نعمت اللہ صاحب لکھنوی اور مولنا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے شاگرد تھے، متعدد کتب و رسائل ان کی یادگار ہین، منجملہ ان کے سلم الاخلاق اور طلاق ثلاثہ کی بحث مین فیصلۃ العلیم اور تفسیر سورۂ بقرہ معروف ہین،

مؤلف | مولنا علیم الدین حسین کے حقیقی بھائی مولوی واعظ الدین حسین تھے، جن کے صاحبزادے ہمارے مخدوم جناب نصیرالدین حسین نصیر بیرسٹرایٹ لا اس چھوٹے سے منظوم رسالے کے مصنف ہین، آج سے شاید سینتیس برس پہلے جب راقم کو عمر مین پہلی دفعہ دیہات (دیسنہ) سے نکال کر پھلواری شریف مین پڑھنے کی غرض سے پٹنہ لایا گیا، تو اس وقت میرے چھوٹے چچا (مولوی سید ابو یوسف صاحب مرحوم) ان ہی کے ساتھ رہتے تھے اس تعلق سے مین بھی وہین اترا، اس وقت شاید میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی، مین نے مؤلف موصوف کو اسی زمانہ مین دیکھا اور اس زمانہ سے ان کے شوق شعر و سخن اور نئی تعلیم کیساتھ پرانے آداب و اخلاق اور بزرگون کی پرانی باتون کے ساتھ ان کی عقیدت یاد ہے،

ان کی پیدائش ۱۸۶۲ء مین شہر عظیم آباد کے محلہ مغل پورہ مین ہوئی، ابتدائی تعلیم کے بعد عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی مولنا علیم الدین حسین اور فارسی علی بابا تبریزی سے پڑھی، شعر و سخن کا مذاق ان ہی بزرگون کی صحبت مین ان کو حاصل ہوا، پہلے فارسی مین پھر اردو مین غزلین کہنی شروع مین، اردو غزلین حکیم آغا حسن صاحب آزل لکھنوی شاگرد میر وزیر علی صبا کو دکھائین، اس کے بعد نواب مرزا خان داغ دہلوی سے اصلاحین لین،

مسلمانون مین اس وقت انگریزی تعلیم کا آغاز تھا، اور شریف گھرانون مین اس کا رواج ابھی بہت کم تھا، تاہم انھون نے انگریزی تعلیم حاصل کی، اور کلکتہ یونیورسٹی مین تعلیم پانے کے بعد ولایت گئے، اور وہان سے ۱۸۹۵ء مین بیرسٹری کی سند حاصل کی، اور واپس آکر پہلے بانکی پور پٹنہ مین اور بعد ازین دوسرے مقامات مین پرکٹس کی، ۱۹۱۶ء سے پٹنہ ہائیکورٹ مین کمشنر آف اوتھس مقرر ہوئے، اور آج تک اس خدمت پر ہین،

ان حالات کے باوجود خاندانی مشرقی علمی ذوق، شعر و سخن کا تعلق اور مذہبی جذبات کی وارفتگی ہمیشہ قائم رہی، سب سے پہلے ۱۳۱۵ھ مین ذکر النبی کے نام سے نئے انداز مین میلاد کی مجلسون کے لئے ایک والہانہ کتاب لکھی جو اس زمانہ مین بہت پسند کی گئی تھی، ان کا ایک فارسی اور ایک اردو کا دیوان مرتب اور طبع کا منتظر ہے،

لیکن ان سب سے ماورا مجھے ان کا ایک منظر اب تک یاد ہے، اور اس کی روحانی لذت اب تک میرے دل کے کام و دہن مین ہے، ۱۹۱۰ء تھا یا ۱۹۱۱ء کہ ندوۃ العلماء کا کامیاب اجلاس، جسٹس مولوی سید شرف الدین صاحب (بیرسٹر پٹنہ و جج کلکتہ ہائیکورٹ)

کی کوششون سے منعقد ہوا تھا، یہ پہلا اجلاس تھا جس مین عمامے اور ہیٹ یکجا ہوئے تھے، مسٹر حسن امام و سید علی امام و سر شیخ عبدالقادر (لاہور) اور دوسرے ارکانِ تعلیم جدید علماے کرام اور مشائخِ عظام کے پہلو بہ پہلو آکر بیٹھے تھے اور ملت مرحوم کے چارۂ کار پر غور و فکر کے لیے صرف ہو رہے تھے، اس وقت مخدوم الملۃ مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اطال اللہ بقاءہ نے اس قدیم و جدید کی یکجائی پر یہ ترانۂ شکر پڑھا تھا،

للہ الحمد میانِ من و او صلح فتاد — حوریان رقص کنان نعرۂ مستانہ زدند

اس آواز پر سارا مجمع مست ہو گیا تھا، میرا اس وقت آغازِ ہوش تھا، ہنوز ندوۃ العلما کی درسگاہ مین بھی نہین گیا تھا، مگر چونکہ میرے بہت سے اعزہ اس اجلاس کی کامیابی کی کوششو مین شریک تھے اس لیے مین بھی ایک طفلِ تماشا نگر کی حیثیت سے اس مین شریک تھا، اب منظر یہ تھا کہ سامنے تقریبًا ڈیڑھ دو سو علماے ربانیین اور مشائخِ مقدسین کی صفین تھین کہ ناگاہ ایک کوٹ پتلون اور ہیٹ مین ملبوس پیکر اسٹیج پر آتا ہے، ابھی اسکی زبان سے چند فقرے نکلنے پاتے ہین کہ مجمع وارفتہ ہو جاتا ہے، خود خطیب کے دل کا جوش و خروش تاثیر کا ایک عالم بنکر مجلس پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ صدر سے لیکر پائین تک آہ و شیون اور گریہ و بکا کے سوا کچھ اور نہ دکھائی دیتا، نہ سنائی دیتا تھا، اس فرنگی شکل کے اسلامی دل کی یہ کیفیت تھی کہ خود رو رہا تھا اور ہزارون کو رولا رہا تھا، بڑے بڑے جبہ پوشون کی سپید داڑھیان آنسوون سے تر تھین اور ہر طرف سے احسنت آفرین کا آوازہ بلند تھا خطیب مذکور کے وہ الفاظ آج بھی ۳۲ برس کے بعد میرے کانون مین گونجتے ہین اور میری آنکھون کو اشکبار

کرتے ہین اور ابھی تک مجھے وہ اثر مین ڈوبے ہوئے فقرے یاد ہین، علماء و مشائخ کے گروہ کی طرف اشارہ کیا کہ "یہ ہمارے اسلاف کی مٹنے والی صورتین ہین، یہ ملک کے طول و عرض سے دین محمد رسول اللہ صلعم کی حفاظت کی خاطر یہان آئے ہین یہ ملت کے بھکاری ہین اور ملت کیلئے بھیک مانگنے کو نکلے ہین، ہم انصار ہین اور انصار کی اولاد ہین، کون ہے جو ان مہاجرین کی امداد کو اٹھتا ہے" مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت چند ون کا یہ عالم تھا کہ گویا ہر طرف سے روپیہ، گھڑیان، انگوٹھیان، عمامے، کپڑے اور زیور برس رہے تھے اور کسی کو لینے دینے کا ہوش نہ تھا، خود خطیب کی رُوتے رُوتے ہچکیان بندھ گئی تھین، اور ایک قمیص اور ایک پتلون کے سوا جو کچھ تھا وہ اتار کر سامنے ڈال چکا تھا، جن آنکھون نے وہ منظر دیکھا ہے اس پر اثر کیف کی یاد آج بھی ان کو پرنم کر دیتی ہے، آہ!

آہِ سحری ز سینۂ خمارے ... از نالۂ بوسعید و ادہم خوشتر

یہ خطیب اسی مثنوی کے مصنف مسٹر نصیر الدین حسین بیرسٹرایٹ لا تھے،

موصوف کو شعر و شاعری کا عشق ہمیشہ سے رہا، حالانکہ ان کے مشاغل کو اس فن سے ایک نوع کی بیگانگی ہے تاہم طبعی ذوق ماحول پر حاوی ہے، پیش نظر مثنوی ۱۹۱۱ء میں انھون نے لکھی تھی مگر اس کے بعد ان کے فرزند دلبند کی مفقود الخبری وغیرہ کے ایسے مصائب ان کو پیش آئے کہ یہ اوراق طاق نسیان پر دھرے رہے اب دو برس ہوے کہ ۱۳۴۹ھ مین انھون نے اسکو دوبارہ دیکھکر مرتب کیا، اور اب امسال ۱۳۵۱ھ مین چھپ کر منظر عام پر آتی ہے،

مثنوی | آجکل جب شاعری صرف غزلگوئی کا نام رہ گیا ہے اور دوسرے اصناف سخن تقریبًا

ناپید ہوچکے ہین، یہ مثنوی اس عہد مین بالکل نئی چیز سمجھی جائیگی، شاعر نے اس مین شاعری کی حقیقت، مختلف ملکون مین اسکے اثرات اور تاریخ، مختلف قومون کی شاعریون کی خصوصیات دکھائی ہین پھر تفصیل کیساتھ اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے، اور ایک ایک دو دو شعر مین اکابر شعرائے اردو کے فضل و کمال کی داد دی ہے، اور ان کے خصوصیات بتائے ہین، ان کو پڑھنے سے یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے مؤلف شاعر کی نظر اردو شعرا کے کلام و خصوصیات پر کتنی عمیق ہے اور آج یہ مشرقیت کا وہی جوہر ہے جو انگریزی یونیورسٹیون کی چار دیوارون مین مفقود ہے،

مثنوی گو دو مصرعون مین پوری ہوجاتی ہے مگر ہر شعر مین قافیون کی جو سختی ہے وہ اکثر واقعیت مین حارج ہوتی ہے اس بنا پر ضرورت ہے کہ ان کی پابندی کی سختی کچھ کم کردی جائے، اس مثنوی مین بھی ممکن ہے کہ کہین کہین اہل فن نکتہ چینی کرین، مگر یہ قدامت پسندی کی عصبیت اب خود چند روز کی مہمان ہے، اچھی مثنوی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حشو سے پاک ہو اور ادائے خیال مین بھرتی کی ضرورت پیش نہ آئے، اس حیثیت سے بھی یہ مثنوی اچھی خاصی سطح رکھتی ہے لیکن اصلی چیز معنویت ہے، اور اس حیثیت سے یہ بے مبالغہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ یہ مثنوی اردو مین پہلی چیز ہے، اور اس بنا پر شائقین ترقی اردو کی قدردانی کی پوری مستحق ہے،

۱۴ / محرم سنہ ۱۳۵۱ھ

LYTTON LIBRARY
ALIGARH.
MUSLIM UNIVERSITY

استدراک

ص ۳۱۶ شوربا کی اصل مین نے عربی شربہ (پینے کی چیز) بتائی ہے، مگر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے بڑی قابلیت سے معارف مین یہ تحقیق فرمائی کہ "شوربا" فارسی لفظ و ترکیب ہے، شور نمکین اور با پرانی فارسی مین کھانے کو کہتے تھے، چنانچہ اسی سے ہماری زبان مین شکنبا، باورچی، نان بائی وغیرہ لفظ ہین جن مین با کا جز ان ہی معنون مین ہے۔

ص ۳۱۹ شاگرد بمعنی شاہی خدام کی اصل مولانا شروانی شاہ گرد بتاتے ہین، یعنی جو لوگ بادشاہ کے اردگرد رہتے ہون،

ص ۳۲۱ مستری کے لفظ کو ڈاکٹر صاحب عربی کے بجائے پرتگالی فرماتے ہین، اس کی اصل شکل MISTRE ہے، مگر پرتگالی مین خود بہت سے عربی لفظ ہین۔

ص ۳۲۵ سطر ۱۱ مین لفظ اصل اور مثال کی تحقیق مین ہے کہ سرکاری کاغذات کی اصل دفتر مین رہتی تھی، اور نقل و مثال، لوگون کے پاس بھیجی جاتی تھی، اس کی دلیل کے لئے اقتباسات کتاب آداب الحرب والشجاعہ مبارک شاہ معروف بہ فخر مدبر شائع کردہ ع بک اینڈ پرشین سوسائٹی پنجاب یونیورسٹی ص ۱۲ (غزنویون کے عہد کی تصنیف) پیش ہے

"مثالِ توقیع برسانیدند کہ ہر چہ بتعجیل تر بیاید"

ص ۳۲۸ قلعی پھیرنا کی جگہ قلعی کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ،

ص ۳۴۸ تنخواہ کے معنی "بدن کا چاہنے والا" یہ اسم فاعلی ترکیب کے معنی ہیں ، اگر ہم اسم مفعولی ترکیب لیں تو اس کے معنی ہونگے "بدن کا چاہا ہوا" جیسے "دلخواہ" کے معنی دل کا چاہا ہوا

ص ۳۸۹ کی اخیر سطر پر ایک حاشیہ تھا جو غلطی سے رہ گیا ، حاشیہ یہ ہے ،

اقتباس مکتوب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی

بنام مہدی مرحوم (دیکھو مکاتیب مہدی ص ۲۷)

عمر خیام

خیام

خیام کے سوانح، تصنیفات اور فلسفہ پر تبصرہ اور
فارسی رباعی کی تاریخ اور رباعیاتِ خیام پر مفصل مباحث
اور آخر میں خیام کے چھ عربی و فارسی رسالوں کا ضمیمہ اور اس کے
قلمی رباعیات کے ایک نسخہ کی نقل شامل ہے، خیام کے مباحث
پر بہت ہی مفصل مکمل اور محققانہ، سب سے پہلی کتاب
لکھی گئی ہے،

ضخامت ۵۲۰ صفحے کتابت و طباعت و کاغذ اعلیٰ

قیمت:- غیر مجلد [illegible]، مجلد [illegible]

[illegible] محمد ادریس [illegible]